خواتین ڈائجسٹ

اگست 2021

www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
اگست کے مہینے میں مسلمانوں کے نئے ہجری سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ محرم الحرام ہجری سال کا پہلا مہینہ حرمت والا مہینہ ہے۔
یکم محرم الحرام کو خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔
دس محرم الحرام یوم الحرام یعنی یوم عاشور کی بے شمار فضیلتیں ہیں۔ یوم عاشور کو وہ اندوہناک سانحہ پیش آیا، جس کی یاد میں آج بھی مسلمانوں کی آنکھیں اشک بار ہیں اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔ نواسۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتول حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ کے اہل خاندان کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ آپؓ ـــــ نے حق کی سربلندی کے لیے قربانی دی اور وہ تاریخ رقم کی جو قیامت تک مسلمانوں کے لیے مشعل راہ رہے گی۔
اگست کے مہینے میں وہ تاریخ ساز دن آتا ہے جب ایک شاعر کا خواب تعبیر کی صورت ڈھلا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیاں رنگ لائیں۔ ان کو غلامی کے اندھیروں سے نجات ملی اور قائداعظم محمد علی جناح کی باعمل قیادت میں وہ آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ انہیں ایک شناخت، ایک پہچان ملی۔ ارض پاک، ایک ایسا خطۂ زمین جہاں وہ اپنی تہذیب و ثقافت، اپنی اقدار و روایات اور اپنے مذہب پر آزادی سے عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔
آزادی کی یہ نعمت جو ہمارے آباؤ اجداد نے بے مثال قربانیاں دے کر حاصل کی، افسوس کہ ہم اس کی قدر نہیں کر پائے۔ پاکستان جس دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا، ہم نے اسے ہی بھلا دیا۔ ہم ایک کلمے کو بھول کر فرقوں میں بٹ گئے۔ لسانی اور صوبائی تعصبات میں پڑ گئے۔ تعصب کی بنیاد پر ہی پاکستان دولخت ہوا اور بقیہ پاکستان کی حالت ہمارے سامنے ہے۔
حکمرانوں کی ناقص حکمت عملی کی بدولت آج مہنگائی اور بے روزگاری عروج پر ہے۔ کورونا سے پہلے بھی ہمارے حالات دگرگوں تھے۔ کورونا نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔
پچھلے دو سالوں میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئیں، وہاں جشن آزادی کی رونقیں بھی ماند پڑ گئی ہیں۔ پہلا سا جوش و خروش، سرگرمیاں اور تقریبات نظر نہیں آتیں۔ اس سال جشن آزادی مختلف طریقے سے منائیں۔ خاص طور پر اللہ کے حضور جھک کر پاک وطن کی بقا، ترقی، خوش حالی اور یکجہتی کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مخلص اور سمجھ دار قیادت عطا فرمائے۔ آمین۔
قارئین کو جشن آزادی مبارک۔

اس شمارے میں،

- وہ میرے کیسری پھول ـــ فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
فرزانہ کھرل کا مکمل ناول قدرے طویل ہے لیکن فرزانہ کھرل کے منفرد اور سحر انگیز انداز بیاں نے اسے بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔
- قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول ـــ دُرِّ نایاب، • تقدیر بدلتی ہے ـــ جبین چیمہ کا ناولٹ،
- عندلیب زہرا، ماریہ یاسر، ثناء پری وش اور ملیحہ صدیقی کے افسانے،
- راحت جبیں اور عفت سحر طاہر کے ناول، • آپ کی پسندیدہ مصنفہ نازیہ رزاق سے باتیں،
- باتیں جنید اختر سے، • کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قرآن مجید پڑھنے کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''قرآن کریم (صحت کے ساتھ) پڑھنے میں ماہر (قیامت کے دن) معزز نیکوکار فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اسے اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسے پڑھنے میں مشقت ہوتی ہے، اس کے لیے دگنا اجر ہے۔''

فوائد ومسائل:

1۔ قرآن کے ماہر سے مراد حافظ اور تجوید کے ساتھ پڑھنے والا قاری یا عالم باعمل ہے۔

2۔ جو شخص تجوید کے ساتھ روانی سے نہیں پڑھ سکتا، اس کے باوجود شوق سے پڑھتا ہے اور پڑھنے میں جو مشقت ہوتی ہے اسے برداشت کرتا ہے اس کے لیے دگنا ثواب ہے۔ اس میں ان معمر حضرات کے لیے بڑی خوش خبری ہے جن کی زبان موٹی ہو جاتی ہے تو وہ کوشش کے باوجود صحت مخارج اور صفات حروف کا لحاظ رکھ کر الفاظ ادا نہیں کر سکتے، لہٰذا وہ تلاوت ترک نہ کریں بلکہ یہ عمل صالح جاری رکھیں۔

3۔ خلوص نیت کے ساتھ ادا کیا ہوا ناقص عمل بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پیارا ہے، جب وہ عمل نقص کے بغیر ادا کرنا ممکن نہ ہو۔

حافظ وقاری کا درجہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''قرآن والے (حافظ یا قاری) سے (قیامت کے دن) جنت میں داخل ہوتے وقت کہا جائے گا ''قرآن پڑھتا جا اور (جنت کے درجات میں) چڑھتا جا۔'' وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک ایک درجہ بلند ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ اسے جو آخری آیت یاد ہے، وہ بھی پڑھ لے۔''

فوائد ومسائل:

1۔ اس سے قرآن مجید کے حافظ اور کثرت

سے اس کی تلاوت کرنے والے کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔

2۔اگر پورا قرآن مجید یاد نہ ہو تو بھی جتنا یاد ہے اس کے مطابق درجات بلند ہوں گے۔

3۔اس حدیث میں تلاوت اور حفظ قرآن کی ترغیب ہے۔

قرآن کی گواہی

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا "قیامت کے دن قرآن مجید ایسے مرد کی شکل میں آئے گا جس کا رنگ اڑا ہوا ہو اور کہے گا میں وہی ہوں جس نے تجھے رات کو بیدار رکھا اور دن کو پیاسا رکھا۔

فوائد و مسائل:

1۔شاحب سے مراد وہ انسان ہے جس کا رنگ بیماری کی وجہ سے یا سخت محنت اور تھکاوٹ کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو۔

2۔اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح قرآن پڑھنے والا تہجد میں تلاوت کی محنت اور تھکاوٹ برداشت کرتا تھا، قرآن کو بھی اسی شکل میں ظاہر کیا جائے گا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح قرآن کی تلاوت اور قیام کی وجہ سے آدمی کا رنگ بدل جاتا تھا، اسی طرح قرآن بھی انتہائی بھاگ دوڑ کرے گا کہ مومن کو زیادہ سے زیادہ بلند درجہ مل سکے اور اس بھاگ دوڑ کا اثر اس کی ظاہری صورت میں نظر آئے گا۔ واللہ اعلم۔

تلاوت کا اجر و ثواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ جب وہ گھر جائے تو اسے گھر میں تین بڑی بڑی موٹی تازی حاملہ اونٹنیاں ملیں؟"

ہم نے کہا جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر کوئی نماز میں تین آیتیں پڑھ لے تو وہ اس کے لیے تین بڑی بڑی موٹی تازی حاملہ اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔"

فوائد و مسائل:

1۔قرآن مجید کی تلاوت کا فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

2۔حاملہ اونٹنیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس دور میں عربوں کے نزدیک یہ سب سے عمدہ اور قیمتی مال تھا۔

3۔نماز میں تلاوت کا ثواب نماز کے علاوہ تلاوت سے زیادہ ہے۔

قرآن کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قرآن کی مثال گھٹنا بندھے ہوئے اونٹوں کی سی ہے۔ اگر مالک ان کے بندھنوں کے ذریعے سے ان کی حفاظت کرے گا تو انہیں اپنے قابو میں رکھے گا اور اگر ان کے بندھن کھول دے گا تو وہ بھاگ جائیں گے۔"

فوائد و مسائل:

1۔اونٹ کو بٹھا کر رسی سے اس کا گھٹنا باندھ دیا جاتا ہے۔ اس رسی کو عقال کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اونٹ بھاگ نہیں سکتا۔ قرآن مجید یاد کرنے کے بعد اسے پڑھتے رہنا چاہیے تاکہ یاد رہے۔ اگر پابندی سے تلاوت نہ کی جائے تو حفظ کیا ہوا قرآن بھول جاتا ہے۔

2۔اگر تلاوت فرض اور نفل نمازوں میں، خصوصاً نماز تہجد میں ہو تو برکات کا حصول زیادہ ہوتا ہے۔

سورۃ فاتحہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

''اللہ عزوجل فرماتا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لیا ہے۔ وہ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی میرے بندے کے لیے۔ اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگتا ہے۔'' انہوں نے کہا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''پڑھو! بندہ کہتا ہے۔ ''الحمد للہ رب العالمین'' سب تعریفیں جہانوں کے مالک اور پالنے والے کے لیے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری تعریف کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے۔ بندہ کہتا ہے۔

''الرحمٰن الرحیم'' بہت مہربان، نہایت رحم کرنے والا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے۔ بندہ کہتا ہے ''مالک یوم الدین'' جزا کے دن کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری عظمت بیان کی۔ یہ (سب تعریف) میرے لیے ہے اور یہ آیت میرے درمیان اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔ (یعنی جب) بندہ کہتا ہے ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو یہ میرے اور بندے کے درمیان نصف نصف ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا۔ اور سورۃ کی (باقی) آخری آیات میرے بندے کے لیے ہیں۔ (پھر) بندہ کہتا ہے۔ ''ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔'' (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) یہ میرے بندے کا حصہ ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ سورۃ فاتحہ سب سے عظیم صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس صورت کو ''نماز'' فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت نماز کا رکن ہے۔

2۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ فاتحہ کی آیت نہیں۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں اس بات کی قطعی طور پر صراحت اور وضاحت موجود ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ فاتحہ کی ایک مستقل آیت ہے۔ امیر المومنین فی الحدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یعنی جب تم سورۃ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرو کیونکہ یہ (سورت فاتحہ) ام القرآن، ام الکتاب اور السبع الثانی ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس (سورۃ فاتحہ) کی ایک آیت ہے۔

3۔ دوسری سورتوں کے شروع میں جو بسم اللہ ہے وہ صورتوں کا جزو نہیں، تاہم یہ بھی اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی آیت ہے اور سورۃ توبہ کے سوا ہر صورت کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ہر صورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔

4۔ جہری نماز میں سورت کے ساتھ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے، تاہم آہستہ پڑھنا راجح ہے۔

5۔ اللہ کی حمد و ثنا بھی ایک لحاظ سے دعا ہے کیونکہ اللہ کی تعریف سے مقصود اس کی رضا اور قرب کا حصول ہوتا ہے اور حمد و ثنا کرنے والے کو یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

نمازی کو اگرچہ اسلام کے ذریعے ہدایت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود انسان کو زندگی میں ہر قدم پر اللہ کی رہنمائی اور توفیق کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بندہ نماز میں سورۃ فاتحہ کے ذریعے اللہ سے ہدایت کی درخواست کرتا رہے۔ واللہ اعلم۔

سب سے بڑی سورت

حضرت ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ ''کیا میں مسجد سے نکلنے سے پہلے تجھ کو قرآن مجید کی سب سے بڑی صورت نہ سکھادوں؟'' (اس کے بعد جب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر تشریف لے جانے لگے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دہانی کرائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''الحمدللہ رب العالمین۔ یہی سبع مثانی (سات بار دہرائی جانے والی آیت) ہیں اور یہی قرآن عظیم ہے، جو مجھے دیا گیا ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ ''یقیناً ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیات اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔''

2۔ ''سورۃ فاتحہ کو ''سبع مثانی'' اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

3۔ سورۃ فاتحہ کو ''قرآن عظیم'' کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے، یعنی اس میں عقیدہ توحید، عملی توحید، یعنی صرف اللہ کی عبادت اور صرف اس سے مدد مانگنا، اس کی صفات، عقیدہ آخرت، وعدہ وعید، گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں کے نیک اور نافرمان افراد کے واقعات سے عبرت اور اس سے ہدایت کی درخواست جیسے اہم مضامین موجود ہیں۔

شفاعت

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''قرآن مجید میں ایک صورت ہے جس کی تیس آیتیں ہیں۔ اس نے اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کی۔'' حتیٰ کہ اس کی مغفرت ہوگئی۔ (وہ سورت ہے) تبارک الذی بیدہ الملک۔

فوائد و مسائل:

1۔ ''شفاعت کی'' یعنی قیامت کے دن شفاعت کرے گی۔

2۔ قیامت کے دن اعمال محسوس صورت میں سامنے آئیں گے۔

3۔ قیامت کو نیک اعمال بھی شفاعت کریں گے۔

4۔ قرآن مجید کی تلاوت ایمان کے ساتھ اور خلوص نیت سے ہو تو مغفرت کا باعث ہے۔

تہائی قرآن

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''قل ھواللہ احد'' (سورۃ اخلاص) تہائی قرآن کے (تیسرے حصے کے) برابر ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ سورۃ اخلاص کا ثواب ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔

2۔ اس کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں توحید کا بیان ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کو توحید سے محبت اور شرک سے انتہائی نفرت ہے۔

اللہ کے ذکر کی فضیلت

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر، تمہارے بادشاہ (اللہ تعالیٰ) کو سب سے زیادہ پسند، تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور تمہارے لیے سونا اور چاندی (اللہ کی راہ میں) دینے سے بہتر اور اس بات سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن کا مقابلہ کرو اور ان کی گردنیں کاٹو اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں؟''

صحابہ نے کہا۔ ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اللہ کا ذکر۔''

اللہ کی رحمت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے بیٹھتے ہیں، انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان (فرشتوں) میں فرماتا ہے، جو اس کے پاس ہوتے ہیں۔''

فوائد و مسائل:

1۔ ذکر کے لیے بیٹھنے والوں سے مراد مسنون انداز سے ذکر کرنے والے ہیں، مثلاً نماز سے فارغ ہو کر مسنون اذکار میں مشغول افراد یا واعظ و درس قرآن و حدیث کی مجلس یا آپس میں اللہ کی نعمتوں کا ذکر تا کہ دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

2۔ خود ساختہ الفاظ کے ساتھ، خود ساختہ طریقوں سے ذکر کرنا خلاف سنت ہے۔ جیسے روشنیاں بجھا کر اجتماعی طور پر ذکر کرنا، بالخصوص الفاظ کی ضربیں لگانا، یا ایسی دعاؤں کو اہمیت دینا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں، مثلاً درود تاج، درود ماہی ہفت ہیکل، شش قفل وغیرہ۔ ایسی چیزوں سے ثواب کے بجائے گناہ کا اندیشہ ہے۔

3۔ فرشتے نیکی کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔

4۔ سکینت سے مراد دل میں اطمینان و سکون اور خوشی کی خاص کیفیت ہے، جو ذکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔

5۔ فرشتوں میں ذکر فرمانے کا مقصد اس عمل پر خوشنودی کا اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قربت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ساتھ ہوتا ہوں، جب وہ میرا ذکر کرتا ہے اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔''

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ تعالیٰ کی عام معیت تو ہر مخلوق کے ساتھ ہے کہ وہ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر ایک کے ساتھ ہے۔ ایک معیت مدد اور نصرت کی ہوتی ہے، جو اس کی راہ میں جدوجہد یا جنگ کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی معیت ہے جو ذکر کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے، اس کا مقصد خوشنودی کا اظہار ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر جگہ موجود نہیں بلکہ آسمانوں پر عرش عظیم کے اوپر ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کی صریح نصوص سے ثابت ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ الرحمن علی العرش استوی (طہٰ۔ 20)

3۔ اللہ کا ذکر بہت بڑی نیکی ہے۔

بخل سے اللہ کی پناہ مانگنا

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بیان کرتے تھے کہ ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بخل سے، میں تیری پناہ مانگتا ہوں بزدلی سے، میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ناکارہ عمر میں پہنچا دیا جاؤں، میں تیری پناہ مانگتا ہوں دنیا کی آزمائش سے اور میں تیری پناہ پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے۔''

دعا سے وبا اور پریشانی دور ہو جاتی ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اے اللہ! ہمارے دل میں مدینہ کی ایسی ہی محبت پیدا کر دے جیسی تو نے مکہ کی محبت ہمارے دل میں پیدا کی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے، اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مد اور صاع میں برکت عطا فرما۔''

☆

ذکر کاہلی کا

انشاجی

ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کا ذکر پطرس نے اپنے مضمون ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' میں کیا ہے۔ اگر یہ مضمون ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے کا نہ ہوتا، اگر پطرس مرحوم کے نیاز بھی حاصل رہے ہوتے تو ہم یہی سمجھتے کہ انہوں نے یہ ہمارے بارے میں لکھا ہے۔ اٹھنا نمبر ایک اور اٹھنا نمبر دو، ہمیشہ سے ہماری زندگی کا معمول رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے پطرس کے ہیرو کی طرح سورج کو کبھی طلوع ہوتے دیکھا ہی نہیں۔ کئی بار دیکھا ہے، فلموں میں بڑا اچھا لگتا ہے۔

جوش اور جگر دونوں بڑے شاعر ہیں لیکن ہمارا ذاتی رجحان ہمیشہ جگر کی طرف رہا تھا۔ شاعری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ ہماری ہی طرح کے تھے۔ چرند پرند اور جوش ملیح آبادی کی طرح علی الصباح نہیں اٹھ بیٹھتے تھے۔

ارے بھئی، وہی وقت تو چڑیوں کے چہچہانے کا ہوتا ہے۔ جو لوگ نور کے تڑکے چھڑی لیے باغ میں جا پہنچتے ہیں۔ وہ ان بے زبانوں کے معمولات میں مخل ہوتے ہیں۔ جگر صاحب سے بھی ہم کبھی نہیں ملے، لیکن ایک بار ان کے قلم سے یا کسی اور کے قلم سے ہم نے پڑھا ہے کہ بھوپال میں ان لوگوں نے یعنی جگر صاحب اور ان کے دوستوں نے ایک انجمن الکہلا قائم کی تھی۔ کہلا، کاہل کی جمع ہے۔

جو جتنا بڑا احدی اور خدائی خوار ہوتا تھا، اتنا ہی اس انجمن میں یا کلب میں ذی مرتبت سمجھا جاتا تھا کہ انجمن کے دفتر میں ایک قالین بچھا تھا۔ یہ لوگ وہاں پہنچ کر کھڑے کھڑے گر پڑتے تھے کیونکہ کھڑے سے بیٹھنا اور بیٹھنے کے بعد لیٹنا ایک محنت طلب کام ہے۔ ناحق کا تکلف ہے اور آداب کاہلی کے خلاف ہے۔ دن بھر یہ لوگ وہاں اپنی کاہلی کے نشے میں غین پڑے رہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی شخص آ کر ان کے منہ میں پانی ڈال جاتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ کاہلی میں جو مزا ہے، وہ کاہل ہی جانتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنے والے، صبح صبح اٹھنے

والے اور ورزش پسند اس مزے کو کیا جانیں۔

''ہائے کم بخت تُو نے پی ہی نہیں۔''

دیکھیے! ہمارے قبیلے میں کیسا کیسا آدمی ہوا ہے۔ غالب بھی ''بیٹھے رہیں تصوّر جاناں کیے ہوئے'' کے قائل تھے۔ میر صاحب یعنی میر تقی میر بھی اپنے حجرے میں قطب بنے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی اپنے حجرے کی کھڑکی بھی نہ کھولی کیونکہ کھولنا بھی ایک طرح کا کام ہے، بلکہ یہاں تک سنا ہے ادھر کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

ایک صاحب نے کہا۔

''میر صاحب! یہ کھڑکی کھول لیا کیجیے، باہر کی ہوا آیا کرے گی اور اس طرف باغ بھی ہے۔''

حیران ہو کر بولے۔

''اچھا! میرے کمرے میں کوئی کھڑکی بھی ہے۔''

میر اور غالب تو خیر پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ ہمارے حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ اقبال کے متعلق بھی ہم نے کبھی نہیں پڑھا کہ چاق و چوبند آدمی تھے۔ یہی معلوم ہوا کہ تہہ بند باندھے، چارپائی پر لیٹے، رازی کے نکتہ ہائے دقیق پر غور کرتے رہتے تھے اور حقہ پیتے رہتے تھے۔

اس صبح خیز طبقے نے کوئی اتنا بڑا شاعر پیدا کیا ہو تو ہمیں اس کا نام بتایئے، تعارف کرایئے، ہمیں یاد پڑتا ہے، مرزا محمد رفیع سودا نے جو دلی کے چوروں پر مثنوی لکھی ہے۔ اس میں صبح اٹھنے والوں کو کچھ اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اہل مغرب میں سارے لوگ موجد اور سائنس داں ہی نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہمارے قبیلے کے ہیں بلکہ ایسے کہ ہمارے قبیلے کے لیے باعث نازش۔ ایک اخبار میں پڑھا کہ وہاں کاہلوں کے باقاعدہ کلب ہیں، جن میں کاہل لوگ بوجہ کاہلی کبھی نہیں جاتے۔ جو شخص چلا جائے اسے مستعد جان کر اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے۔ ہم نے جوش صبح آبادی صاحب کا وہ نظام الاوقات پڑھا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ باغ میں ملے گا اور فلاں وقت اسے مے خانے میں تلاش کیجیے اور فلاں وقت نہ جانے کہاں۔

اس کلب والوں نے جن کا نام ''بورن ٹائرڈ ایسوسی ایشن'' یعنی پیدائشی تھکے ماندوں کی انجمن ہے۔ مثالی زندگی کا نظام الاوقات یہ مقرر کیا ہے کہ چوبیس میں سے دس گھنٹے تو سونا ہی چاہیے۔ باقی رہے چودہ گھنٹے..... ان میں سے آٹھ گھنٹے آرام کے لیے وقف ہونے چاہئیں۔ یعنی آدمی لیٹا اکڑتا رہے، کچھ کام نہ کرے۔ باقی رہے چھ گھنٹے..... اس میں سے چار گھنٹے کھانے کے لیے وقف رہنے چاہئیں۔ کھانا اور جگالی کرنا بھی تو زندگی کی عشرتوں میں سے ایک ہے۔ نوالے زہر مار کرنا تو کھانے کی تعریف میں نہیں آتا۔

باقی رہے دو گھنٹے..... یہ انجمن تو ان میں بھی کسی قسم کے کام کا ٹنٹا پسند نہیں کرتی لیکن خیر کوئی ان میں کام کرنا چاہے تو اعتراض بھی نہیں کرتی۔

ہمارے خیال میں تو اس میں سے بھی کچھ وقت نہانے، شیو کرنے اور حاجات ضروریہ اور غیر ضروریہ کی مد میں نکل جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ مغرب کے کاہل لوگ ان تکلفات کو ضروری سمجھیں۔ یاد رہے کہ اس کلب کے پینتیس ہزار ممبر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو انجمن سازی بھی تکلف اور کاہلی کے اصولوں کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ فارم بھرنا، فیس دینا، دستخط کرنا وغیرہ۔

ایک بار تین کاہلوں میں مقابلہ ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی کاہلی کا کوئی قصہ سنائے، جو سب سے زیادہ کاہل ہو، وہ انعام پائے۔ ایک نے اپنا قصہ بیان کیا کہ بیر کو اٹھا کر منہ میں ڈالنے کے لیے بھی کسی راہ گیر کی خدمات حاصل کیں۔ دوسرے نے اس سے زیادہ دون کی لی، تیسرے کے سامنے شمع پہنچی تو بولا۔

''یارو! قصے تو کئی ایک ہیں، لیکن کون سنائے؟'' پس انعام کا حق دار یہی تیسرا ٹھہرا۔

☆☆☆

ہمارے ہاں کلب کا مطلب صرف نائٹ کلب سمجھا جاتا ہے یا شراب نوشی اور رقص و تفریح کا اڈہ۔ یہ بات نہیں، مغرب کے ملکوں میں شام کو گھر میں گھسے بیٹھے رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایران اور

لیے نکل پڑتے ہیں اور شام کا چوگا بھی باہر ہی کھاتے ہیں۔ جو کلبوں کے ممبر ہیں، وہ وہاں جا کر کچھ کھیلتے ہیں، کچھ پڑھتے ہیں، کچھ گپ کرتے ہیں۔

مغرب میں پینا پلانا بھی آدابِ زندگی میں داخل ہے۔ لہٰذا پی بھی لیتے ہیں اور کبھی کبھی زیادہ بھی پی لیتے ہیں۔ بعض تو اپنے پاؤں چل کر گھر پہنچ جاتے ہیں، بعض کو ڈنڈا ڈولی کر کے لانا پڑتا ہے، پابہ دست دگرے دست بدست دگرے۔

☆☆☆

آپ میں سے بہت سوں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی کہانی ''خودکشی کا کلب'' پڑھی ہوگی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اسی نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کلب کے ممبر بننے والے اپنی جان سے بے زار بے شک ہوتے تھے لیکن اپنی جان آپ لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔

خودکشی کے لیے ہمت چاہیے، اس کلب کا کام ان کی بے ضرر موت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اخبار میں آتا تھا کہ فلاں شخص کار کے نیچے آیا اور مر گیا۔ فلاں دریا میں ڈوبا پایا گیا۔ شاید مخمور میں پل پر سے گزر رہا تا پاؤں رپٹ گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی اور حادثہ گزرا۔ لیکن اصل میں یہ سارے اس کلب کی کارنامے ہوتے تھے خیر وہ تو ایک قصہ تھا۔

ہمیں معلوم نہیں خودکشی کے کلب سچ مچ ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے لیکن اسی طرح ایک کہانی سر آرتھر کانن ڈائل کی بھی ہے، جس میں شرلاک ہومز صاحب اپنا کارنامہ دکھاتے ہیں۔ اس کا نام ہے ''لال سر والوں کی انجمن'' صرف سرخ بالوں والے اس کی خدمات سے مستفید ہو سکتے تھے۔ شرلاک ہومز کے تفتیش کرنے پر سارا کارخانہ فراڈ ثابت ہوا لیکن..... گنجوں کے کلب واقعی ہیں۔

جو آیا اس گھرانے میں لے آیا سر پہ گنج
قارون نے رستے میں لٹایا خزانہ کیا؟

ترکی میں ایک کلب خاوندوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی ہے اور ایک کلب سان فرانسسکو کے بچاؤ کی انجمن'' بُرے باورچیوں سے بھی مطلب بیویاں ہی سمجھے کیونکہ ولایت میں لوگوں کے گھروں میں باورچی اور خانساماں نہیں ہوتے۔ عورتوں کے بہت سے کلب لاغری کو فروغ دینے کے ہیں کیونکہ چھریرا یا دبلا ہونا عورتوں کی قوم میں اچھا سمجھا جاتا ہے لیکن یہیں ایسے کلب بھی ہیں، جو موٹاپے کو زحمت نہیں بلکہ محسن سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موٹے لوگ خوش اخلاق ہوتے ہیں جبکہ دبلی عورتیں چڑچڑے مزاج کی ہوتی ہیں۔

پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

☆☆☆

آپ نے سینما میں اکثر دیکھا ہوگا کہ فلم چل رہی ہے۔ کوئی مونگ پھلی کھا رہا ہے اور کوئی دال سیو چاب رہا ہے۔ اس سے دوسرے فلم بینوں کے انہماک میں فرق آتا ہے لیکن ہمارے ہاں کسی کو خیال نہ آیا ہوگا کہ اس کے انسداد کے لیے اجتماعی کارروائی کرے، کلب وغیرہ بنائے۔

امریکہ میں ایک کلب ہے جس کا نام ہے ''سینما میں بے آواز کھانے والوں کی انجمن'' یا ''انجمن برائے انسداد کڑکڑ'' لیکن ہم نے گفتگو کا ہلی سے شروع کی تھی تو ایک اور کلب کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جس کا نام ''انجمن فروغ سست الوجودی'' ہے ان کا کہنا ہے کہ (جانے ہمارا یہ قول امریکہ کیسے پہنچ گیا) ''جو کام کل کیا جا سکتا ہے، اسے آج ہرگز نہ کیا جائے۔''

یہ لوگ کرسمس بھی تاریخ کے نو ماہ بعد مناتے ہیں اور نمائشوں میں ایسے وقت جاتے ہیں، جب وہ ختم ہو گئی ہوں۔ خیر! ہم بھی سینما میں اپنی مرغوب فلم دیکھنے اس روز جاتے ہیں، جب اسے بند ہوئے کم از کم دو دن ہو گئے ہیں۔

کلب تو اور بھی طرح طرح کے ہیں، جن کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ہماری کاہلی ہمیں طویل بیان کی اجازت نہیں دیتی، بس خدا حافظ۔

☆

باتیں جنید آختر سے

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''
''جنید اختر''
2۔ ''پیار کا نام؟''
''جانو''
3۔ ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''31 مئی 1993''
4۔ ''قد/ستارہ؟''
''6 فٹ 3 انچ/(جوزا)Gemini''
5۔ ''مادری زبان؟''
''اردو''
6۔ ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''میرا پہلا نمبر ہے۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں تین بھائی دو بہنیں۔''
7۔ ''شادی/بچے؟''
''ابھی شادی نہیں ہوئی۔''
8۔ ''تعلیمی قابلیت؟''
''ایم بی اے۔''
9۔ ''شوبز میں آمد؟ گھر والوں کا ردعمل؟''
''2014 میں اس فیلڈ میں آیا۔ امی نے بہت سپورٹ کیا جبکہ والد صاحب نے بالکل سپورٹ نہیں کیا۔''
10۔ ''بچپن میں کس سے بہت ڈر لگتا تھا؟''
''رات سے اور اس کی تاریکی سے۔''
11۔ ''پہلی کمائی کس کے ہاتھ رکھی؟''
''3 ہزار روپے پہلی کمائی تھی جو میں نے اپنی امی کے ہاتھ میں رکھی تھی۔''
12۔ ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''اسکول میں میری ایک کلاس فیلو تھی..... وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی..... اچھا لگنا اور پیار ہونا میں فرق ہے۔ تو.....''
13۔ ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''
''میرا سورج ڈوبتا کب ہے پہلے یہ پوچھ لیں..... کیوں کہ میں رات کو دیر سے سوتا ہوں..... تو میرا سورج تقریباً دوپہر کے تین چار بجے طلوع ہوتا ہے۔''
14۔ ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''
''اگر چائے نہ ملے تو میری صبح نہیں ہوتی۔''
15۔ ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''غصہ..... بالکل برداشت نہیں ہے مجھے، اور جو بات ہوتی ہے وہ منہ پر کر دیتا ہوں۔ اسی لیے مجھے کافی جگہوں پر نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔''
16۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''پاکستان گھر ہے ہمارا..... بہ حیثیت پاکستانی اپنے ملک سے پیار کرتا ہوں۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔''
17۔ ''سیاست میں کون پسند ہے؟''
''کوئی بھی نہیں..... پہلے کے لوگ جو سیاست کر چکے ہیں وہ ہی سیاست تھی..... آج کے دور میں سیاست میں کوئی بھی اچھا نہیں..... ہاں بے نظیر مجھے بہت اچھی لگتی تھیں ان کی شخصیت بہت اچھی تھی۔''
18۔ ''کس ملک کی شہریت پسند ہے یا خواہش ہے؟''
''سعودی عرب کی..... جب کہ وہ شہریت نہیں دیتے۔''
19۔ ''کیا آپ کورونا کا شکار ہوئے؟ لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟''

''کورونا کا شکار نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اور دعا ہے کہ اللہ دشمنوں کو بھی اس وبا سے بچا کر رکھے۔ لاک ڈاؤن میں اللہ کی عبادت کی اور ڈراموں کے اسکرپٹ پڑھے۔''

20۔ ''شوبز میں کیا اچھا اور کیا برا ہے؟''

''سب سے اچھا یہ ہے کہ آپ کو نیم ملتا ہے۔ لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں، آپ کی بات سنتے ہیں۔ برا یہ ہے کہ اس فیلڈ میں گروپنگ اور سیاست بہت ہے۔''

21۔ ''اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟''

''اسپورٹس سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ لوگ کھیل کے ہار اور جیت کو بھی ''انا'' کا مسئلہ بنا لیتے ہیں جبکہ میں کہتا ہوں کہ کھیل کو صرف انجوائے کیا کریں۔ مجھے کرکٹ، بیڈمنٹن بہت پسند ہیں۔''

22۔ ''زندگی سے کیا سیکھا؟''

''کہ آپ کو پوزیٹو رہنا چاہیے۔ زندگی میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ان کو سمجھنا چاہیے، ان کو فیس کرنا چاہیے..... اور اپنے بزرگوں کی عزت کرنا سکھایا۔''

23۔ ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''

''خوب صورت سا گھر..... ایک اسپتال جس میں غریبوں کی مدد کر سکیں..... اور ایک ایسا اولڈ ہاؤس بنانا چاہتا ہوں جہاں بزرگوں کو جو کہ ادھر ادھر بے یارو مددگار ہوتے ہیں انہیں رکھوں ان کی خدمت کروں۔''

24۔ ''کس کی خاطر شوبز چھوڑ سکتے ہیں؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا..... کیونکہ ابھی تک جو بھی ملے ہیں سب بہت سپورٹیو ملے ہیں۔''

25۔ ''پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟''

''جیو پر ایک ڈرامہ آن ایئر تھا۔ ''یہ زندگی ہے۔'' اس میں پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تھا۔ تو کافی گھبرایا تھا..... مگر آہستہ آہستہ سیکھتا گیا..... تنقید کو پوزیٹو لیا اور برا نہیں مانا۔''

26۔ ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''

''جب میں رات کو اکیلا ٹی وی دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ تنہائی میں لوگوں کے رویوں کا بھی بہت احساس ہوتا ہے کہ لوگ کتنے منافق ہوتے ہیں اور مجھے انہی کے ساتھ چلنا ہے۔''

27۔ ''گھر کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کروانے کی ذمہ داری کس پر ہوتی ہے؟''

''چھوٹے بھائی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں بہت کیئر لیس پرسن ہوں۔''

28۔ ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا موقع ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گے؟''

''اپنا بچپن۔''

29۔ ''گھر میں سب سے زیادہ پیار اور ڈانٹ کس سے ملی؟''

''امی کا پیار بہت اچھا لگتا ہے اور ابو کی ڈانٹ بہت اچھی لگتی ہے۔''

30۔ ''بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے

ہیں؟"

"بیمار ہونے پر میں پوزیٹو رہتا ہوں کہ جب ہماری اللہ نے دی ہے تو صحت بھی وہ ہی دے گا۔ اندر سے پوزیٹو رہنا چاہیے۔"

31۔" آپ کے اب تک ڈراموں اور فلموں کی تعداد؟"

"ڈرامے تو دس، بارہ ہیں، ایک فلم "پری" ریلیز ہو چکی ہے دوسری آنے والی ہے "پیچھے سے دیکھو" تیسری کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔ کمرشلز کی تعداد بھی چھ یا سات ہے کیونکہ کمرشلز میں زیادہ کرتا نہیں ہوں۔"

32۔" رومینٹک رول آسانی سے کر لیتے ہیں یا ٹف ٹیو؟"

"دونوں ہی آسانی سے کر لیتا ہوں۔ کیونکہ مجھے تو کام کرنا ہے۔ دونوں میں اداکاری کا مارجن ہوتا ہے۔"

33۔" ادب سے لگاؤ؟ کس کو زیادہ پڑھتے ہیں؟"

"بہت لگاؤ ہے۔ اشفاق احمد کو زیادہ پڑھتا ہوں..... کوئی بھی اچھی تحریر مل جائے ضرور پڑھتا ہوں۔"

34۔" کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"

"فیصلے صحیح بھی ثابت ہوتے ہیں اور غلط بھی..... یہ سب حالات پر منحصر ہے۔ ہاں میرا یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا جب مجھے "موڈی" اور ڈرامے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ تب میں نے فلم کا انتخاب کر لیا۔"

35۔" کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کی خواہش ہوئی؟"

"کچن سے لگاؤ نہیں ہے۔ ہاں جب امی کچن میں ہوتی ہیں تو پھر ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کروا لیتا ہوں۔ ویسے کڑاہی گوشت بنا لیتا ہوں کبھی کبھار۔"

36۔" کبھی سوچا کہ سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟"

"پھر ویسا ہی ہوتا جیسا پی ٹی وی کا دور تھا۔ اب سوشل میڈیا کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔"

37۔" کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتے؟"

"میں غصہ نہیں کرتا۔ کسی پر بھی..... میری عادت نہیں ہے۔"

38۔" کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟"

"اپنی فیملی کے لیے..... اپنے والدین کے لیے اپنے بہن بھائیوں کے لیے۔"

39۔" ایک نصیحت جو گرہ سے باندھ لی؟"

"کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور میں واقعی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔"

40۔" آپ کو نفرت ہے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔ کیونکہ بہ حیثیت مسلمان ہمیں کسی سے نفرت نہیں کرنی چاہیے، جس نبی کی امت ہیں انہوں نے ہمیں نفرت کرنا نہیں سکھائی۔"

42۔" بریانی میں بوٹی نہ ہو تو؟"

"تو پھر سادے چاول کھا لیتا ہوں۔ ویسے میں گوشت، مرغی کا زیادہ شوقین نہیں ہوں۔"

43۔" طالب علمی کے زمانے میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟"

"میتھس۔ اور کوئی نہیں۔"

44۔" ڈاکٹر، حکیم، اور ہومیو پیتھک کس پر یقین ہے؟"

"سب کی الگ الگ پہچان ہے۔ پھر بھی یہی کہوں گا کہ جس کی دوائی سے آرام آ جائے وہ ہی اچھا ہے۔"

45۔" پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟"

"تعلیم فری ملنی چاہیے۔"

46۔" کیا دل سے اتر اہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ کبھی نہیں۔"

47۔" اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ

لیتے ہیں؟"

"اپنی فیملی اور قریبی لوگوں سے..... مگر جو ذاتی کام ہوتا ہے وہ اپنی مرضی سے کرتا ہوں۔"

48۔"موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟"

"میں تو کبھی بھی کسی حکومت سے مطمئن نہیں تھا۔ بس میرا تو یہی دل چاہتا ہے کہ ہمارا ملک ترقی کرے۔ دیگر ملکوں کی طرح۔"

49۔"ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟"

"شوٹنگ کے لیے ضرور جاؤں گا مگر جاب کے لیے نہیں۔"

50۔"غصے میں آپ کا ردعمل؟"

"بہت برا ہوتا ہے۔ جو بات میرے دل میں ہوتی ہے منہ پر بول دیتا ہوں۔ جو بات نہیں بھی بولنی ہوتی وہ بھی بول دیتا ہوں جو کہ غلط ہے۔"

51۔"ٹی وی شو کے بہترین اینکر پرسن؟"

"معین اختر اور انور مقصود صاحب۔"

52۔"نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"ایسا نہیں کرو..... یہ نہ کرو..... یہ ہو جائے گا..... ٹوکا ٹاکی والی نصیحت بری لگتی ہے۔"

53۔"فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟"

"اتنا رعب ہے کہ میں اگر کچھ کہتا ہوں تو وہ میری سنتے ہیں۔"

54۔"کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟"

"14 اگست 1947 کی تاریخ پھر اپنی امی ابو اور بہنوں بھائیوں کی سالگرہ کا دن یاد رکھتا ہوں۔"

55۔"ایک کھانا جو آپ ہمیشہ کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟"

"بریانی۔"

56۔"اپنی پرفارمنس میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"

"ایک آرٹسٹ کبھی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ کمی رہ ہی جاتی ہے۔ انسان ہر وقت سیکھنے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔"

57۔"اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟"

"کہ اگلا ڈرامہ اس سے اچھا کروں گا ان شاء اللہ۔"

59۔"پہلی فلم جو سینما ہاؤس میں دیکھی؟"

"اپنی ہی فلم دیکھی تھی "پری" اس سے قبل میں نے کبھی بھی سینما میں کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔"

60۔"کوکنگ یا کھانا..... کیا پسند ہے؟"

"دونوں..... جب کھانا کھاتا ہوں تو یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس کے پیچھے جو محنت ہے اسے بھی میں پریکٹیکلی کر کے دیکھوں..... اور پھر میں پکاتا بھی ہوں۔"

61۔"کوئی کردار جو کرنا چاہتے ہیں؟"

"رول چاہے کوئی بھی ہو اس کو نبھانا سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی ایسا کردار کرنا چاہتا ہوں جو لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رہے۔"

62۔"آپ کا ناقابل فراموش کردار؟"

"میری ایک مووی آنے والی ہے اس میں 70's کے ہیرو کا کردار کر رہا ہوں۔ یہ ایک مشکل کردار تھا جس کے لیے میں نے کوشش کی۔ اب کتنا کامیاب ہوں دیکھنے والے بتائیں گے۔"

63۔"کس کردار کو کرنے سے انکار کیا؟"

"رول کو کرنے سے انکار نہیں کیا۔ بس یہاں کی سیاست اور گروپنگ کو دیکھ کر انکار کیا ہوگا۔"

64۔"کس سیاست دان کا کردار کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں قائد اعظم محمد علی جناح۔" کا رول کرنا چاہتا ہوں۔"

65۔"چاند پر پہنچ کر پہلا پتھر (دنیا میں) کس ماریں گے؟"

"برا کرنے والوں کو معاف کر دینا چاہیے۔ چاند پر پہنچ کر سیلفی بناؤں گا تاکہ لوگوں کو دکھا سکوں۔"

66۔"آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

"بہ حیثیت پروڈیوسر اور ڈائریکٹر لوگوں کے سامنے آنا ہے۔"

67۔ "کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟"

"میں ایک اولڈ ہاؤس بنانا چاہتا ہوں۔ اس میں ان لوگوں کو رکھنا چاہوں گا جن کے بچے انہیں گھر سے نکال دیتے ہیں۔"

68۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"وہ فوڈ اسٹریٹ جہاں "حلیم" مل رہی ہو میری پسندیدہ اسٹریٹ بن جاتی ہے۔"

69۔ "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"

"صبح کے وقت جب میں سو کر اٹھتا ہوں تو آئینے کو زیادہ وقت دیتا ہوں کہ اللہ نے مجھے ایک اور زندگی دی ہے اور پھر کام کا آغاز کرتا ہوں۔"

70۔ "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"

"بالکل ضروری ہے۔ کیونکہ جب بات آتی ہے نسل کی تو پھر مجھے احساس ہوتا ہے کہ شادی بہت ضروری ہے۔"

71۔ "آنے والے کل کے بارے میں سوچ کر کیا احساس ہوتا ہے؟"

"اس کو سوچ کر آنے والے کل کو بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

73۔ "بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟"

"شاہ رخ خان، عامر خان، سلمان خان پسند تھے اور انہی کی فلمیں دیکھتا تھا۔"

74۔ "خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟"

"عظمیٰ افتخار، فاطمہ ثریا بجیا اور حسینہ معین۔"

75۔ "بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلے؟"

"بہت سارے کھیل کھیلے..... کرکٹ، فٹ بال، ٹیبل ٹینس، ریکٹ بہت کھیلا ہے۔"

76۔ "شاپنگ کرتے وقت سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے؟"

"نکلتے وقت والدہ سے پوچھ لیتا ہوں کہ کیا چاہیے آپ کو اور پہلے انہی کے لیے خریداری کرتا ہوں۔"

77۔ "کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟"

"جب مجھے کوئی اچھا پروجیکٹ مل جاتا ہے تب۔"

78۔ "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"

"بالکل سنیں..... اپنے دوستوں کی باتیں بہت بار سنیں۔"

79۔ "اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟"

"کوشش کرتا ہوں کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کروں پھر کوشش کرتا ہوں کہ غریبوں پر خرچ کروں۔"

80۔ "کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"

"جی دکھایا..... انہوں نے کہا کہ آج نہیں تو کل تمہاری قسمت بدل جائے گی..... باقی اللہ کی ذات پر یقین ہے۔"

81۔ "اگر آپ کو کسی سیلیبرٹی کا انٹرویو کرنے کو کہیں تو آپ کا انتخاب؟"

"پاکستان سے نعمان اعجاز کا اور انڈیا سے میں "شاہ رخ خان" کا انٹرویو کرنا چاہوں گا۔"

82۔ "نیند کتنی پیاری ہے؟"

"بہت پیاری ہے۔ دل چاہتا ہے کہ زیادہ گھر پر رہوں اور اپنا کام ختم کر کے سو جاؤں۔ مجھے کوئی نیند سے اٹھا دے تو بہت غصہ آتا ہے۔"

83۔ "آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں آنا چاہتا ہے؟"

"گھر میں کوئی اس فیلڈ میں نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس فیلڈ میں آنا چاہتا ہے۔"

84۔ "بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟"

"میں پراپرٹی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔"

85۔ ”شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟“

”میں خلاف نہیں ہوں۔ لوگ انجوائے کرتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔“

86۔ ”خواتین آئینے کو زیادہ وقت کیوں دیتی ہیں؟“

”اس لیے کہ انہیں لگتا ہے کہ کہیں بھی کمی بیشی رہ گئی تو ان کی خوب صورتی میں فرق آجائے گا۔“

87۔ ”آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟“

”آج کی بھی اس لیے کہ آج کا دور مقابلہ بازی کا دور ہے اور کل کی اس لیے کہ اگر آج کی فکر نہ کی تو آنے والا کل ہمارے لیے کٹھن ہوگا۔“

88۔ ”صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے۔“

”شکر الحمدللہ نکلتا ہے منہ سے..... کیونکہ جب ہم نیند میں ہوتے ہیں تو پچھتر فیصد مردہ ہوتے ہیں تو میں شکر کرتا ہوں کہ اللہ نے دوبارہ زندگی دی ہے۔“

89۔ ”فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟“

”میں ہی گرم تھا۔ مگر اب میں بہت نرم مزاج ہو چکا ہوں۔“

90۔ ”کس عمر میں موبائل ملا؟“

”بہت جلدی..... لیکن اس پابندی کے ساتھ کہ موبائل میں زیادہ گھسنا نہیں ہے بلکہ ضرورت کے تحت ہی استعمال کرنا ہے۔“

91۔ ”غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟“

”الو کا.....“

92۔ ”پسندیدہ تہوار؟“

”عید..... اسے بہت زور شور اور جوش و خروش سے مناتا ہوں۔“

93۔ ”مرنے کے سین کرنا کیسا لگتا ہے؟“

”بہت مشکل..... حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان نے مرنا ہے۔“

94۔ ”اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟“

”دونوں کے..... دوسروں سے اس لیے بھی سیکھتا ہوں کہ ان کی غلطیوں کو اور ان کی کامیابیوں پر غور کرتا ہوں۔“

95۔ ”کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟“

”چائے۔“

96۔ ”مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟“

”زیادہ تر میں گھر سے باہر ہی کھانا کھاتا ہوں، دوستوں کی وجہ سے، لیکن کوشش کرتا ہوں کہ گھر کا کھانا بھی کھاؤں۔“

97۔ ”کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟“

”سیل فون، گاڑی کی چابی اور اپنے گلاسز، پانی کی بوتل۔“

98۔ ”کھانا بیڈ پر پسند ہے۔ چٹائی پر یا ڈائننگ ٹیبل؟“

”ڈائننگ ٹیبل پر کیونکہ سب سے ملاقات اور بات ہو جاتی ہے۔“

99۔ ”گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتے ہیں؟“

”امی کے لیے اور بابا کے لیے۔“

100۔ ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟“

”یقیناً اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ عروج کو زوال اور زوال کو عروج ہے۔“

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ..... نساء جبیں
میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ..... مومنہ رضا

آپ کی پسندیدہ مصنفہ

نازیہ رزاق سے ملاقات

شاہین رشید

نازیہ رزاق کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جن کی پہلی ہی تحریر نے قارئین کو چونکا دیا۔ انوکھی تشبیہات، استعارے موضوع پر پورا عبور اور منفرد انداز بیاں، وہ اپنی تحریر سے ایک پختہ کار اور کہنہ مشق مصنفہ نظر آتی ہیں۔ اتنی کم عمری میں ایسا اسلوب، یہ یقیناً خداداد صلاحیت ہے جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ ہم نے اس بار انٹرویو کے لیے نازیہ رزاق کا انتخاب کیا ہے۔ آیئے نازیہ سے ملتے ہیں۔

''کیا حال ہیں، کیسے مزاج ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے..... اور مزاج بھی اچھے ہیں۔''

''انٹرویو کے آغاز میں آپ پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟''

''جی..... بالکل..... میں نازیہ رزاق ہوں اور میرا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ روایتی سی سادات اور زمین دار فیملی ہے ہماری..... میرے ابو جی ایئر فورس کے جونیئر ریٹائرڈ ہیں اور پنجاب پولیس میں بارہ سال تک انسپکٹر رہ چکے ہیں۔ میری والدہ پڑھی لکھی اور بہت ہی ہنر مند خاتون ہیں..... کچھ عرصہ درس وتدریس سے بھی وابستہ رہی ہیں..... میں گھر میں بڑی ہوں اور مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ جو زیر تعلیم ہیں..... میں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے اور ایک کالج میں لیکچرار ہوں..... دراصل میں ایک مشترکہ خاندانی نظام والے گھرانے کی پروردہ ہوں..... تو تعارف باقی سب کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا.....

میرے ابو جی اور میرے تایا ابو چار بھائی ہیں اور سب تیئس کمروں اور عمودی برآمدوں کی قطاروں اور بے تحاشا سبزے والے گھر میں رہتے ہیں۔

یوں تو گھر میں پندرہ سے تیس سال کے گیارہ لڑکے اور تیرہ لڑکیاں رہتی ہیں۔ مگر جابز اور پڑھائیوں کے سلسلے ''آنگن'' کو سونا کر چکے ہیں۔ آپس میں اختلاف رائے اور بحث ومباحثے جاری

وساری رہتے ہیں۔ سیکڑوں من گندم و کپاس، تربوز، ہری مرچ اور مکئی کی پیداوار بھی اکٹھے ہی کی جاتی ہے۔ ہماری حویلی (ڈیرہ) پنچائیت لگاتا ہے اور سیاست کا گڑھ بھی مانا جاتا ہے۔ اور ہاں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ میری عمر ستائیس سال ہے اور میں غیر شادی شدہ ہوں۔"

"بچپن کیسا گزرا..... اور کیسی بچی تھیں؟"

"بچپن کچھ عجیب سا گزرا..... خود سے بڑی کزنز کی نقالی کرتے بہت زیادہ شرارتیں کرتے اور ضد کرتے گزرا..... میں یقیناً تنگ اور بے بس کردینے والی بچی تھی۔ اور متنازعہ بھی..... وہ اس طرح کہ میں امی سے لڑ جھگڑ کر شاپر میں کپڑے ڈال، سامنے تائی امی کے گھر چلی جاتی تھی۔ یا پھر سارا دن غائب رہتی تھی۔ بارہ سال کی ہوئی تو میری امی کی وفات ہوگئی اور میری شدت پسندی کی بھی..... اور..... میں "بوڑھی" ہوگئی..... میں پڑھائی میں ہمیشہ بہت اچھی رہی۔ پوزیشن ہولڈر..... اگر کوئی پوزیشن نہیں بھی لی تو جماعت کا مقابلہ ضرور بڑھا دیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رزلٹ کے حوالے سے والدین سے جھوٹ بولنا پڑا ہو یا دھوکا دینا پڑا ہو۔

"نام کے حوالے سے میں ضرور سوال کرتی ہوں کہ اس کا کیا بیک گراؤنڈ ہے..... تو آپ سے بھی پوچھوں گی..... کیونکہ آپ "نازیہ زوہیب" کے دور کی پیداوار ہیں....."

"مجھے اپنا نام خاصا پرانا لگتا ہے..... ہمارے خاندان میں بہت خوب صورت اور منفرد نام ہیں سب کے..... جبکہ میری دفعہ میری دادی کو یہ بھڑکیلا نام ہی پسند آیا..... مجھے نازیہ حسن اور زوہیب حسن کا زمانہ نہیں معلوم..... مگر میرا نام یقیناً نازیہ حسن سے متاثر ہوکر ہی رکھا گیا ہوگا..... ابو جی کراچی میں تھے کیونکہ ان کی پوسٹنگ کراچی میں ہوگئی تھی۔ تو دادی اماں نے کہا ہوگا کہ چلو یہ نام رکھ لیتے ہیں آسان بھی ہے..... بس پھر رکھ دیا گیا "نازیہ" خیر آپ کو بتاؤں کہ میری امی کو مجھ سے بہت محبت تھی اور میں مصری محبوبہ سی بے رخ سی تھی۔ (ابھی بھی بے رخی ہی ہوں) امی کے بعد پتا چلا کہ کسی کا کہنا کہ "مجھے تمہاری بہت فکر ہے" کتنا ضروری ہوتا ہے۔

ابو نے محبت ریٹائرڈ ہونے کے بعد دی..... تربیت میں ہماری دوسری امی کا ہاتھ ہے..... اور جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا کہ وہ انتہائی ہنرمند اور پڑھی لکھی خاتون ہیں..... تو انہوں نے ہمیں بھی ویسا بنانے کی کوشش کی..... نتیجتاً میں کافی ذمہ دار، تھوڑی سی سلیقہ مند اور بہت ہی منظم لڑکی ہوں..... جبکہ چھوٹے بہن انتہائی سگھڑ ہے۔ امی کا معاملہ یہ ہے کہ انہیں ستر کی دہائی کے تمام کرائسس کا بھی اتنا ہی علم تھا۔ آئل پینٹنگ، کروشیا اور اچار مربوں کی تراکیب کا، مجھے نعت خوانی اور لکھنا، بولنا ابو جی نے سکھایا..... وہ ایرفورس کے لہجے میں انگریزی بولتے ہیں اور میں ہنستے ہوئے گرامر کی غلطیاں نکالتی ہوں..... وہ تاریخ کو ازبر کیے ہوئے ہیں اور میں اسی وجہ سے تاریخ کے ہر باب کو بخوبی جان چکی ہوں۔

"لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا..... اور کس محرک نے لکھنے پر اکسایا؟"

"میں بنیادی طور پر کہانی کار نہیں ہوں بلکہ "قصہ گو" ہوں..... میں بچپن سے ہی کہانیاں گھڑنے اور حلقہ احباب کو زبردستی سنانے والوں میں سے ہوں..... کزنز اور بھتیجوں کو سناتی اور پھر اسکول میں کلاس فیلوز کو..... سناتے سناتے جو شے ناپسند ہوتی اسے حذف کرکے نیا واقعہ ڈال دیتی..... اینڈ تک اپنی پسند کا کردیتی..... جب میں انٹرمیڈیٹ کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تو ایک کہانی پیچھا ہی نہ چھوڑے۔ پکڑ کر لکھ دیا..... مگر نصف کے بعد دل اچاٹ ہوگیا..... ماسٹرز کے پہلے سال انٹرنیٹ آیا..... اور میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اسے مکمل کرلیا یعنی اس کہانی کو..... اور یوں لکھنے کی طرف رجحان ہوگیا.....

میں نے بچوں کے بہت سے رسالے پڑھے مگر پہلی تحریر جو لکھی وہ "شعاع" میں شائع ہوئی دسمبر 2015 میں۔ گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا..... مگر اپنی

بہت ہی سلیقہ، سمجھا، کسی اپنے کالج کی پرنسپل ڈاکٹر میم صحرائی صاحبہ جو فیصل آباد کی اعلیٰ پائے کی شاعرہ اور قابل معلمہ ہیں کو ریویو کے لیے بھیجی۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم نے خود لکھی ہے تو بے شک آگے بھیج دو۔ میں نے ستمبر میں وہ شعاع میں بھیجی اور وہ دسمبر کے شعاع میں شائع بھی ہوگئی..... اور شائع ہونے کے بعد ہی سب کو معلوم ہوا۔ دراصل میری شخصیت اتنی متوازن نہیں..... بہت سے کام میں وہ نہیں کر رہی ہوتی جو سب کر رہے ہوتے ہیں۔

''گویا ڈائجسٹ میں جگہ بنانے میں ذرا بھی مشکل نہیں ہوئی، گھر والوں کا ردعمل؟''

''جی بالکل..... ذرا بھی مشکل نہیں ہوئی..... اللہ کا کرم رہا..... اور اللہ کا کرم ہے کہ آج تک کوئی کہانی ریجیکٹ نہیں ہوئی۔ دوسرے ناول کے بعد 'امتل میم'' کی کال آگئی تھی۔ تو وہ مجھے گلابی کر دیتی خوشی کا احساس ہر دفعہ ہوتا ہے۔ گھر والوں کا ردعمل مثبت تھا۔ اچھا تو یہ کام بھی کیا جاتا ہے۔ اور بس..... میرے ابو نے رائٹنگ ٹیبل دینے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ وعدہ وفا نہ کر سکے۔ اور اب تک نہیں کیا..... رائٹنگ ٹیبل..... اور میری جانے نماز ہی میرے بکھرے کاغذات اور اڑتے خیالات کو سنبھالا دیے ہوئے ہیں..... باقاعدہ لکھنا تو شاید ابھی تک شروع ہی نہیں ہو سکا۔ مگر پھر بھی 2017 سے کچھ نہ کچھ لکھ ہی لیتی ہوں۔ 2017 میں میری لیکچرار کی جاب ہوگئی۔ اور اس سال ناول ''پورب پچھم'' آیا اور تب سے اب تک کچھ نہ کچھ تیزی آئی ہے لکھنے میں..... 2015 سے 2017 تک میرا ماسٹرز چل رہا تھا۔ اس دوران میں صرف کہانیاں سوچ رہی تھی۔ یقین مانیے تب سے اب تک ان سوچی ہوئی کہانیوں کو ہی لکھ رہی ہوں۔''

''پلاٹ کب آتے ہیں ذہن میں؟''

''پلاٹ زیادہ تر کسی کی بات کو بغور سنتے ہوئے ذہن میں آتا ہے اور کبھی کبھی کوکنگ کرتے وقت..... کبھی ٹی وی دیکھتے وقت..... اور میں جو سوچتی ہوں وہ کبھی کبھار کسی دوست کو سناتی ہوں یا پھر لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔''

پہلے زمانے میں ہیروئن کے دوپٹے ہیرو کے خیال میں ہانڈی پکاتے ہوئے جل جایا کرتے تھے۔ یا ہاتھ جل جاتے۔ ہانڈی بھی پوری جل جاتی تھی اور نمک مرچ تو بے حساب کم زیادہ ہو جایا کرتی تھی..... اب ہیروئن اس دور سے نکلی ہیں یا نہیں؟''

''بہت مزے کا سوال ہے..... بھئی میں تو ہیروئن کو شدت پسند دکھاتی ہوں..... اکڑو اور معصوم نہیں..... مجھے کیئرنگ سے زیادہ جابر قسم کا اکڑو ہیرو دکھانا زیادہ پسند ہے۔ اور یہی زمانے کی حقیقت بھی ہے..... میرا خیال ہے کہ معصومیت اچھی چیز ہے مگر بے قوفی کو کسی کی معصومیت سمجھنا نامعقولیت ہے..... لڑکیوں کو معصوم سے زیادہ سمجھ دار اور خبردار ہونا زیادہ ضروری ہے فی زمانہ..... اور میری ہیروئن کا منطقی ہونا ہی میری شخصیت کا عکاس ہو سکتا ہے۔''

''تنقید یا تعریف اتنی ہوئی کہ رونا ہی آگیا ہو، ویسے لوگ پہچان لیتے ہیں؟''

''میری تعریف اور تنقید دونوں ہی بہت کم ہوتی ہیں..... اس لیے رونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... اگر کبھی تنقید ہوتی بھی ہے تو میں خاموش ہو جاتی ہوں..... پہلے ناول کی اشاعت پر کسی نے کہا تھا..... ''پلیز اب نکل آئیں ان کہانیوں سے'' وغیرہ وغیرہ..... بس ہم نکل آئے..... اور اب یہ اتنی سنجیدہ کیوں ہیں..... اور میں مسکرا دیتی ہوں..... یہ بات کر رہی ہوں ڈائجسٹ میں شائع تنقید و تعریف کی اور عام پہچان کی بات ہے تو ابھی تو بہ مشکل ہی لوگ پہچانتے ہیں..... اور کبھی کسی نے نہیں پہچانا سوائے ان کے جو ڈائجسٹ پڑھتے ہیں اور جاننے والے بھی ہیں۔''

''ٹی وی سے دور کیوں ہیں؟''

''کبھی سوچا ہی نہیں اور نہ ہی ترغیب اور مواقع ملے..... زندگی میں کبھی موقع ملا تو ضرور لکھوں گی۔''

''رومانس لکھتے وقت کون سامنے ہوتا ہے اور سنجیدہ لکھتے وقت کون سامنے ہوتا ہے؟''

''میں ایسی جگہ رہتی ہوں جہاں اوپن ایئر اٹالین کچن اور امپورٹڈ فرنیچر والے گھر بھی ہیں اور

سخت جانوں میں بنا چپل اور سوئیٹر کے گھومنے والے غرباء بھی ہیں۔ پلے اسٹیشن اور کنچے کھیلتے ہوئے دونوں طرح کے بچے بھی میرے اردگرد ہی رہتے ہیں۔ سنجیدہ لکھتے وقت یہ لوگ میرے سامنے ہوتے ہیں اور رومانس لکھتے ہوئے۔ شاید کوئی خیال ہوتا ہے۔ حقیقت میں کہاں کا رومانس۔

''آج کل پرنٹ میڈیا زیادہ مقبول ہے یا ڈرامے؟''

''اگرچہ سب کو لگتا ہے کہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت کم ہوئی ہے۔ مگر مجھے نہیں لگتا۔ دنیا میں کتابیں پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں۔ یہاں پاکستان میں پہلے بھی کم تھے، اب بھی کم ہیں۔ ایمازون پر بک پبلشنگ ایک باقاعدہ انڈسٹری بن رہی ہے۔ اور عنقریب وال اسٹریٹ بھی اسی انڈسٹری میں انویسٹ کررہا ہوگا۔ بہت لوگ کتابیں پڑھتے ہیں..... دنیا میں سوائے پاکستان کے پڑھنے لکھنے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ اور جہاں تک ڈراموں کی بات ہے تو لوگ ڈرامہ سیریلز زیادہ دیکھتے ہیں۔''

''ناولز، ناولٹ اور افسانوں کی تعداد؟''

''ناولز اور ناولٹ ہی شائع ہوتے ہیں اور اب تک کوئی سات یا آٹھ ہوں گے تعداد میں..... میری شخصیت کی سستی..... میں وقفوں وقفوں سے لکھتی ہوں..... اب کوشش کررہی ہوں کہ مسلسل ٹائم دوں جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں متوازن شخصیت کی حامل نہیں ہوں..... کچھ معاملات میں انتہائی منظم، ذمہ دار اور کچھ میں انتہائی غیر ذمہ دار۔''

''گھر میں آپ کی تحریر کو کون پسند کرتا ہے؟ اور اپنے ہم عصر میں کس رائٹر کو زیادہ پڑھتی ہیں؟''

''شاید کوئی بھی نہیں.....

''سر سے گزر گیا۔'' یہی سننے کو ملتا ہے۔

''میرا بھی نام لکھو۔'' فرمائشیں.....

''اچھا ایسی کہانی لکھو کہ جس میں شادی کے بعد لڑائی ہوتی ہے اور اینڈ میں محبت'' بھلا بتاؤ۔

ہم عصر میں سب کو پڑھتی ہوں..... میری بہن ڈائجسٹ پڑھنے کی انتہائی شوقین ہے..... بلکہ سب کزنز اور بھتیجیاں بھی پڑھتی ہیں، ڈائجسٹ آتا ہے اور میں حفظ کرلیتی ہوں..... جو زیادہ پسند ہیں ان میں ''عمیرہ احمد''، ''آمنہ ریاض''، ''تنزیلہ ریاض''، ''نعیمہ ناز'' شامل ہیں۔ سمیرا حمید بھی اچھا لکھتی ہیں۔ ''فرزانہ کھرل'' کو بھی پڑھ کر اچھا لگا۔ ہاں ''بمبئی کی بانو'' میں اگر غلطی نہیں کررہی تو شاید امت العزیز شہزاد کا ہے، تقریباً سب ہی بہت اچھا لکھنے والی خواتین ہیں۔''

''پڑھائی لکھائی کے علاوہ کیا کرتی ہیں۔ امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟''

''امور خانہ داری سے لگاؤ فطری سا ہے۔ میری بہن ''حمنہ'' مجھے کوکنگ میں دس میں سے آٹھ نمبر دیتی ہے۔ چونکہ میں تھوڑی عجیب ہوں تو پندرہ بیس دن تو میں ''ڈٹ'' کے کھاتی ہوں۔ پھر بھوک انتہائی کم ہوجاتی ہے۔ مہینے بعد پھر سے کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا بس..... لاک ڈاؤن میں لڑکیوں نے خاصے تجربات کیے جیسے کہ میں نے کیک جلایا (شاور لینے گئی تھی بس) بے سوادا (بے مزہ) سا پیزا بنایا..... عنیزہ کا چاکلیٹ کیک، ''آمنہ کا پیزا'' اور ''ٹوٹی فروٹی اور حمنہ کا ناشتہ..... امی سے ٹننگ اور پورسلین پینٹنگ سیکھنے کا عزم ہے..... دیکھیں کب وقت ملتا ہے۔''

''دن کیسا گزرتا ہے..... کوئی کام ایسا جو کیے بغیر سوتی نہیں ہیں؟''

''دن کبھی بھی ایک سا نہیں گزرا میرا..... میں ہرگز مستقل مزاج نہیں ہوں۔ 2021 کے شروع میں کورین سیریز اور KPOP کے لیے پاگل ہورہی تھی۔ اس کے بعد سیزن کے کپڑے بنانے کے لیے..... مہینہ پہلے ہی کرنٹ افیئر زمیگزینز کو کھنگال رہی تھی اور ''فارن افیئر'' دا ڈپلومیٹ کے پچھلے ایڈیشن بھی پڑھ لیے۔ جبکہ آج کل بے تحاشہ سورہی ہوں۔ یا وٹ لوز کرنے کی ویڈیوز اور ویب سائٹس کو نیند میں بوجھل آنکھوں سے پڑھتی رہتی ہوں۔ گھر میں لڑکیاں ہیں تو گپ شپ بھی معمول کا حصہ ہے۔

ہوں..... نیویارک ٹائمز دیکھتی ہوں۔ کچھ لکھ بھی رہی ہوں آج کل..... اور سونے سے پہلے امی کے لیے دعائیں کرتی ہوں۔"

"کھیلوں سے کتنا لگاؤ ہے اور سیاست کتنی پسند ہے؟"

"سیاست سے بہت لگاؤ ہے نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی سیاست سے بھی باخبر رہتی ہوں..... جبکہ کھیلوں سے لگاؤ ایسا ہے کہ گزشتہ دنوں یورپین کلب کے میچز ہو رہے تھے اور لڑکے پاگل..... جبکہ میں "سیمی" کے ٹیٹو گن رہی تھی اور "رونالڈو" کے دانت اس کے دانت کتنے لمبے ہیں اور بال بہت چھوٹے ہیں..... کرکٹ دیکھنا کب کا چھوڑ چکی ہوں..... ورد کرتے ہوئے دعائیں مانگنا اور آخر میں ٹیم کو گالیاں دیتے اٹھنا..... بچپن میں ایسا کرتی تھی..... پھر کرکٹ دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔"

"آج کل "لباس" پر بہت بحث چل رہی ہے۔ ایسا نہیں ہو، ویسا ہو وغیرہ وغیرہ..... آپ کیا کہتی ہیں؟"

"میرے خیال میں انسانی ترقی کا سب سے خطرناک دور شروع ہو چکا ہے۔ انسان وہ بچہ بن چکا ہے جو کھیل میں پہلے محنت سے ریت کا گھر بناتا ہے پھر اسے ملیامیٹ کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ تو ہوا یہی ہے کہ "کچا گوشت اور پتے کھاتا ہوا۔ غاروں میں رہتا انسان تہذیب یافتہ ہوا تو اس نے لباس دریافت کیا..... ایک وقت آیا کہ مغرب میں کئی کئی میٹر گھیر والا لباس پہنا جاتا اور کم گھیر والے لباس کو اشرافیہ پہنا پسند نہیں کرتے..... گردن سے رومال (مفلر) لٹکنے کو بدتہذیبی سمجھا جاتا تھا..... اور اب..... سب کچھ بیک گیئر میں چل رہا ہے۔ چین کا ایک قدیم طبقہ ہے جس کے اشرافیہ لمبے ناخن رکھنے کو خاندانیت تصور کرتے تھے۔ اور اسی طرح کے بے تحاشا بے بنیاد فیشن۔ برہنہ ہونے کا فیشن بھی ایسا ہی بے بنیاد ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں..... دین تو چلیں الگ معاملہ ہے۔ دنیاوی لحاظ

یوں سمجھیں کہ طوطوں کی خرید و فروخت کا بہت بڑا بازار ہے اور آپ بھی وہاں اپنا سبز طوطا لے کر پہنچ گئے تو کسی کو کیا فرق پڑا۔ دنیا میں بے ہودگی اور بے حیائی کی بہت بڑی بڑی انڈسٹریز ہیں۔ پاکستانی انڈسٹری کو جگہ بنانی ہے تو کام میں معیار لایا جائے نہ کہ نقالی کی پرانی مثال قائم کی جائے..... عریاں ہونا روشن خیالی نہیں بلکہ پتھر کے زمانے کی جہالت ہے اور ہم اسی کی طرف جا رہے ہیں۔"

"مزاج کی کیسی ہیں..... غصہ میں ردعمل؟ ٹائم کی پابندی کرتی ہیں؟"

"مزاج کی صلح جو ہوں..... غصہ جلدی نہیں آتا..... اور اگر آ جائے تو اظہار کر دیتی ہوں۔ بہت بولتی ہوں اور پھر بعد میں معذرت بھی کر لیتی ہوں..... وقت کی پابندی کرتی ہوں۔ کسی کو وقت دوں تو ضرور نبھاتی ہوں۔ اپنا وعدہ پورا کرتی ہوں..... چاہے پڑھائی ہو، جاب ہو یا کہیں جانا ہو..... کبھی لیٹ نہیں ہوتی..... اور نہ ہی بہانے بازی کرتی ہوں۔"

"فیشن سے لگاؤ ہے؟ لباس، میک اپ، جیولری..... ان کے بارے میں بتائیے؟"

"خاندان کی باغی لڑکی مشہور ہوں۔ فیشن کے معاملے میں اچھے سے اچھا پہننے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر کپڑوں سے زیادہ جوتوں اور بیگز کی خریداری (وہ بھی مہنگی) کرتی ہوں۔ میک اپ بہت ہی کم استعمال کرتی ہوں۔ مگر ٹرینڈز کو فالو کر کے کرتی ہوں..... جیولری اتنی نفیس اور نازک پسند ہے کہ یہ مشکل ہی مل پاتی ہے، اس لیے استعمال بھی کم ہی کرتی ہوں۔"

"فارغ اوقات میں کسے زیادہ پڑھتی ہیں؟"

"میں بہت پڑھتی ہوں۔ فکشن نان فکشن دونوں..... اس لاک ڈاؤن میں نے "نان فکشن" زیادہ پڑھا..... ہیرلڈ لیم، "نو چوسکی"، "یوول نووا"، "قتلے فیتش"، "فرید ذکریا" اور بھی بہت سے نان فکشن رائٹرز کو پڑھا..... اس طرح فکشن میں "پاؤلو کوئیلو" ایلن شیرف، ٹالسٹائی، عالیان اختر اور

بہت سے امریکن ڈرامہ رائٹرز کو کچھ عرصہ پہلے تک پڑھ رہی تھی..... کچھ دن پہلے میں نے فارسی لکھاری "صادق ہدایت" کے ایک ناول کا انگریزی ترجمہ۔ Blind Owl پڑھا جو اتنا اچھا لگا کہ اب فارسی ادب کو پڑھنے کا بھی ارادہ ہو رہا ہے۔

"نازیہ! آپ نے بتایا تھا کہ جب آپ بارہ سال کی تھیں تو آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا..... پھر والد نے دوسری شادی کی اس وقت آپ کے کیا احساسات تھے؟"

"جی..... جب میں بارہ سال کی تھی تو امی کا انتقال ہو گیا تھا اور جب میں تیرہ سال کی ہوئی تو ابو جی نے شادی کر لی۔ اس وقت میرے ذہن میں بہت وسوسے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ شاید میرا ان کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکے گا۔ لیکن میری پھوپھو نے مجھے بہت سمجھایا اور ابو کا یہ فیصلہ ہمارے لیے بہت بہترین ثابت ہوا۔ دوسرا ان کے آتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب کچن آباد ہونے والا ہے۔ تو مجھے خوشی ہوئی تھی۔ ایڈجسٹمنٹ میں تھوڑے ایشوز ہوئے۔ مگر پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا..... مجھے ڈر بھی اس وجہ سے تھا میں ٹی وی ڈراموں میں دیکھتی تھی کہ سوتیلی ماں ظلم کرتی ہے۔ سوچتی تھی کہ ٹارچر کرنے والی ماں آجائے گی اور ہم "سنڈریلا" ٹائپ بن جائیں گے تو اللہ کا شکر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اور بہت اچھا ٹائم گزرا۔"

"اور انٹرویو کے اختتام پر کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"مجھے شکریہ ہی ادا کرنا ہے خواتین شعاع کے ادارے کا..... میں انٹرویو دینے میں ہچکچا رہی تھی کہ مجھے لگتا تھا کہ میں لوگوں کو یاد نہیں۔ مگر "امتل میم" نے بہت پیار سے دوبار کہا۔ پھر شاہین میم کا رابطہ..... بہت مشکل ہوتی ہے اپنے بارے میں اتنا کچھ بولنے میں..... خیر..... یہ ادارہ نعمت ہے بہت سوں کے لیے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"اور نازیہ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے ہمارے لیے ٹائم نکالا۔"

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو
نگہت عبداللہ
قیمت -/400 روپے

کسی راستے کی تلاش میں
میمونہ خورشید علی
قیمت -/350 روپے

اُجالوں کی بستی
فاخرہ جبیں
قیمت -/400 روپے

ایک میں اور ایک تم
تنزیلہ ریاض
قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی
فون نمبر 32735021

نادرہ خاتون

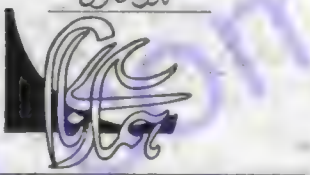

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔37۔اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

شہزادی نذیر.....ساہیوال

میری پسندیدہ کہانی ''رنگ ریز میرے'' ہے۔ ''ہمارے نام'' میں خط بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ خاص طور پر گوشی جمال اور ڈاکٹر فریال کو۔ گڑیا راجپوت کا خط بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

میری فیملی میں لڑکیاں بہت کم پڑھی لکھی ہیں۔ سب کے لیے یہ خط و کتابت بہت حیرت کا باعث بنتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے سے سب بہنوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ میں اپنی بہن کی جٹھانی بننے جا رہی ہوں۔

ایک ڈاکٹر باجی کے مشورے سے خط لکھتی ہوں اور وہ باجی ہی اس کو پوسٹ کروا دیتی ہیں۔ میری امی کچھ بیمار ہیں۔ ان کے لیے بھی ضرور دعا کریں، سب بہنوں سے درخواست ہے۔

مکمل ناول میں ''محبت کو نچ ہے سائیں'' بہت اچھا لگا۔

☆ شہزادی جی! رشتہ طے ہونے پر ہماری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیر ساری خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

آپ کی امی کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ قارئین تک آپ کی درخواست پہنچا رہے ہیں۔

سعیدہ افضل ہاشمی.....کراچی

دروازے کی بیل بجنے پر طوبیٰ بہو ڈائجسٹ لے کر آئی۔ ''امی! یہ لیں'' دل نے شدید خواہش کی کہ بہو کہے ''امی! پہلے میں پڑھوں گی'' بہو نے سرسری سا دیکھا۔ شاید اپنی شادی کا حوال پڑھے تو دلچسپی پڑھے۔

انشاء جی کی غزل بہت اچھی تھی۔ عید الاضحیٰ کی رونقیں پڑھیں، سب بہنوں نے بہت دلچسپ سروے لکھا۔ گل ارباب سے ملاقات اچھی لگی۔ انہوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ''کتاب سے محبت'' کی یہ آخری صدی ہے۔ اللہ نہ کرے، کتاب تو زندگی ہے۔

راحت جبیں ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ سارے مکمل ناول اچھے تھے۔ ناولٹ ''بچپن'' زینب نور کی دیہاتی ماحول پر لکھی ہوئی تحریر بہت پسند آئی۔ ''سکندر اعظم کی آمد'' راشدہ رفعت بہت زبردست۔ ہمیشہ اچھا لکھتی ہو۔ ''رنگ ریز میرے'' عفت سحر پسند نہیں آ رہی۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ سوائے ''کرونا والی گلی'' قرۃ العین خرم ہاشمی۔ بعد میں اچھی لگی، سبق آموز تھی۔

''نفسیاتی ازدواجی الجھنیں'' عدنان بھائی کا مشورہ، زبان پر قابو رکھیں۔ صحیح کہا، معاشرے میں بیش تر برائیاں زبان کا بے جا استعمال کرنے سے ہی پھیلتی ہیں۔

میری قاری بہن گوشی جمال! اللہ تعالیٰ آپ کی ماں جی کو صحت کے ساتھ لمبی عمر دے۔ ماں جی کو بولنے دیا کرو، ان کے برجستہ جملے ہی ہماری زندگی ہیں۔ میری ساس بھی آپ کی ماں جی کی طرح بولتی تھیں۔

☆ سعیدہ جی! یاد آوری کا شکریہ۔ بلاشبہ کتاب پڑھنے کا اپنا ہی لطف ہے آج بھی کتاب کی محبت میں کمی نہیں آئی ہے۔ البتہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت ضرور کم ہوئی ہے۔ کتابیں اب بھی پڑھی جاتی ہیں لیکن ان کی شکل بدل گئی ہے۔

بزرگ گھر کی رونق ہوتے ہیں خصوصاً ماں کا وجود تو سراپا دعا اور برکت ہوتا ہے۔ ماں اپنے بچوں سے ناراض بھی ہو تو اس کا دل بچوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ ماں باپ کو صرف توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں سے صرف پیار چاہتے ہیں، ان پر توجہ دیں، محبت دیں، وہ خوش رہیں گے۔

زرینہ خانم لغاری..... مظفر گڑھ

''زندگی تجھے گزاریں گے'' پڑھا۔ ابھی بھی زمین بے چاری کے گھرانے پر غموں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ کرے نمبردار صاحب مراد کو بھی قید سے چھڑوا دیں اور منشی کی لگامیں بھی کس دیں۔ ''کرونا والی گلی'' دلچسپ کہانی تھی۔ واقعی جن لوگوں کو کرونا ہوا ہے، لوگوں نے انہیں اچھوت سمجھ لیا ہے۔ ''عید کی شام'' مزے دار کہانی تھی۔ ''برکت خاص'' اچھی کہانی نہیں تھی، پسند نہیں آئی۔ ''دل نازک ہمارا'' غصے والے شوہر تو ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ دونوں ساسوں نے عفان صاحب کو خوب سیدھا کیا۔ ''بچپن'' اتنا خوب صورت افسانہ تھا کہ پڑھ کر مزا آ گیا۔ ہم کئی سال پہلے اپنی دادی اماں کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ ''رنگ ریز میرے'' کہانی رکی ہوئی ہے۔

☆ پیاری زرینہ! آپ کو خواتین پسند آیا۔ بہت شکریہ آپ کی تعریف نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہے بلکہ ہمیں دلی خوشی بھی دیتی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ان تحریروں کے بارے میں بھی لکھیں جو آپ کو اچھی نہیں لگیں۔

سحر وقاص راجپوت..... لاہور

طوبیٰ صدیقی سے باتیں اچھی لگیں۔ پہلے ٹائٹل پر بات کرلیں۔ اس بار خواتین کا ٹائٹل پرانا تھا۔ اس کے بعد ہم نے گل ارباب سے ملاقات کی۔ گل جی! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو میری طرح کے لوگ، مطلب کم گو ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے، آنکھوں میں حیرانی بھرے باتیں سننے والے اور کھلکھلا کر ہنس، دینے والے لوگ پسند ہیں۔ شکریہ میری تعریف کے لیے، ہاہاہا۔

اس کے بعد سیدھے ''مریض عشق'' کے پاس پہنچے۔ زرسانگہ یونیک نام کی ہیروئن کے ساتھ ایک بہت ہی نازک موضوع کی طرف متوجہ کیا۔ بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ زوار کا کردار پسند آیا۔ ''متاع'' ام ایمان جی! کیا کمال قسم کی ہیروئن تھی آپ کی۔ بیک وقت میں دو کردار۔ ہی نہ دے سکیں۔ ارے، میری پسندیدہ راشدہ رفعت صاحبہ! بھول کے آپ خواتین کے شمارے میں آ ہی گئیں۔ آپ کا ''سکندر اعظم'' اپنی آمد بہت مبارک لے کر آیا۔ عزم اور اجر کی جوڑی بہت اچھی لگی۔ اب اپنے موسٹ فیورٹ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' اس بار انور حسین کی حالت اور نرمین کے ڈائیلاگ نے رلا دیا۔ عفت سحر طاہر جی! معذرت کے ساتھ کہانی کی سترہ اقساط ہوگئی ہیں مگر حریم اور عباد کے باہمی تعلقات ہی نہیں سلجھ رہے۔ زید اور کیتی کو ملوا دیں، کہاں چھپ گئی کیتی؟'' بچپن'' بھی زبردست کہانی تھی۔ ''نازک ہمارا دل'' بس ٹھیک ہی لگی۔ ''برکت'' منشا محسن علی کیا کمال کی کہانی لکھی آپ نے۔ فرحت اشتیاق جی کے سوالوں کے جوابات پسند آئے۔ سکینہ علی ''آپ کا باورچی خانہ'' اچھا لگا اور دودھ ابلنے کے متعلق ٹپ بھی پسند آئی۔ میں نے منشا محسن علی سے سوال کرنا تھا کہ کیا وہ لاہور سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانی ''تین قالب'' میں اندرون لاہور کے بارے میں کافی گہرائی سے لکھا ہے۔

☆ پیاری سحر! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ گل ارباب کی پسندیدہ شخصیت ہیں یا نہیں، یہ تو گل ارباب ہی بتا سکتی ہیں۔ لیکن ہم آپ کو بتا دیں کہ ہمیں آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ آپ نے جولائی کے شمارے کی تمام تحریروں پر بہت اچھا اور درست تبصرہ کیا۔ تعریف اور تنقید، دونوں میں ہی انصاف سے کام لیا۔ جہاں تک ہماری یادداشت ساتھ دیتی ہے، آپ نے پہلی بار محفل میں شرکت کی ہے۔ اب رابطہ رکھیے گا۔

کرن جمیل..... ڈیرہ غازی خان

میں خواتین و شعاع کی بائیس سالہ پرانی قاری ہوں۔ جولائی کے شمارے میں ایک قاری کا خط پڑھا۔ جس کا نام تھا ابرش شاہ۔ اس خط کو پڑھ کر میں جتنی دیر افسوس کا شکار رہی، لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک لڑکی جو ابھی صرف قاری ہے، اور قاری سے لکھاری بننے کے لیے پر تول رہی ہے۔ اس کا سینئرز سے بات کرنے کا یہ انداز؟ وہ لڑکی جو ابھی تک ناول، ناولٹ تو دور کی بات، ایک افسانہ بھی نہیں لکھ پائی۔ وہ سینئرز کی تحریروں کی ٹانگیں

ہاتھ پیر توڑ رہی ہے ایڈیٹرز کو مخاطب کرنے کے انداز میں اس قدر بدلحاظی اور بدتمیزی۔ کیا ابرش بی بی! آپ کو نہیں معلوم کہ باادب با نصیب ہوتا ہے۔ اور افسوس ہے مدیران گرامی پر کہ جنہوں نے اس نوعمر قاری کی اصلاح اور تربیت کے لیے ایک جملہ بھی کہنے کی زحمت نہ کی۔ پہلی درخواست کروں گی ان محترمہ سے کہ پہلے کچھ ادب و آداب سیکھیں اور پھر ادب کے شعبے سے وابستہ ہو۔ اور اس سوال کے ساتھ خط کا اختتام کروں کہ اگر ابرش کو یہ خط پڑھ کر تھوڑی سی شرمندگی بھی نہیں ہوتی تو پھر حیران ہوں کہ اس کی تربیت کون کر رہا ہے اور کس انداز میں کر رہا ہے؟

ج: پیاری کرن! جس بات پر ابرش شاہ سے خفا ہیں۔ وہی کام آپ خود بھی کر رہی ہیں۔ آپ نے نہ صرف ابرش شاہ کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کیے بلکہ ان کے والدین کی تربیت کو بھی مورد الزام ٹھہرایا اس حد تک نہیں جانا چاہیے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم ہر ممکن احتیاط کرتے ہیں کہ کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ابرش کا خط ایڈٹ کر کے شائع کیا اور آپ کا خط بھی ایڈٹ کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ صفحات بنیادی طور پر قارئین کے صفحات ہیں اس سلسلہ میں قارئین کی آرا شامل کی جاتی ہیں۔ قارئین کی آرا سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ہم قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے الفاظ کے استعمال میں احتیاط ملحوظ رکھیں۔

ثناء اسلم رانا..... کلورکوٹ ضلع بھکر

سب سے پہلے ''رنگ ریز میرے'' پڑھا۔ کہانی اچھے سے آگے بڑھ رہی ہے، تقریباً سارے اندازے ٹھیک جا رہے ہیں۔ میرے جیسی جینئس بندی کے۔ عفت سحر طاہر نے کمال کی شاعری کی ہے۔ اس کے بعد ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' اچھا جا رہا ہے۔ ویل ڈن راحت جبیں۔ نمرہ احمد کے بغیر ڈائجسٹ سونا سونا لگتا ہے۔ سب سے اچھی کہانی ''برکت'' رہی۔ واقعی صرف بولنے سے اور کچھ نہ کرنے سے گھر میں برکت ختم ہی ہوتی ہے۔ ''کرونا والی گلی میں عید'' اینڈ اچھا رہا۔ ''سکندر اعظم کی آمد'' نام تاریخی۔ عزم اور اجر نام اچھے تھے تو کام بھی۔ ''عید کی وہ شام'' ہائے اللہ ایسی منگنی (ہاہاہا) اللہ بچائے۔

''مریض عشق'' شروع تو پرانا تھا لیکن اینڈ اچھا اور حوصلہ افزا رہا۔ گڈ اسٹوری۔ زینب نور! ہمارا بچپن بھی عظیم بچپن تھا لیکن ہمیں تو زیادہ واقعات یاد نہیں۔ ''حمدہ خان'' کی انتخاب شدہ غزلیں بہت شان دار ہوتی ہیں۔ آخر میں گل ارباب سے ملاقات کی۔ زیادہ پتا تو نہیں ان کے بارے میں لیکن ملاقات اچھی رہی۔

☆ پیاری ثناء! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ تین چار ماہ سے خط لکھ رہی ہیں لیکن پوسٹ نہ کروا سکیں۔ آپ ہمیں لیٹ بھی خط لکھ دیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم اگلے پرچے میں شامل کر لیں گے۔ ویسے خط ہمیں بیس یا بائیس تک مل جانا چاہیے۔

زینب نور..... جہانیاں

ہر ماہ کے شمارے کی کہانیوں پر تبصرے کے لیے الفاظ اور جملے ترتیب دیتی ہوں، مگر کیا کریں رسالہ دیر سے ملتا ہے۔ خیر بات کروں گی جون کے خواتین کی۔ سب سے پہلے ''سوال یہ ہے'' میں نگہت سیما کے انداز نے دل موہ لیا۔ اتنے پیار سے جواب دیے کہ بس..... بندی دل ہار بیٹھی۔

اس کے بعد ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' راحت جبیں کی تحریر کمال کی ہے۔ بڈھا گھوڑا ست رنگی لگام۔ جی یہ منشی کو پڑھ کر میرا خود ساختہ محاورہ۔

''رنگ ریز میرے'' بہت پہلے بھائی کے موبائل پر ایک ڈرامہ دیکھا تھا ''اسیر زادی'' مائرہ اور اس کی پھپھو کا کردار بالکل ڈرامے کے کردار کی طرح ہے۔

فرح بھٹو کا ناول ''محبت کونج ہے سائیں'' بہترین۔

جبیں چیمہ ''صاحب بی بی اور غلام'' کیسی اچھوتی سی تحریر تھی۔ پہلے قانتہ رابعہ کا انٹرویو پڑھا، پھر جبیں چیمہ کا۔ اس قدر پڑھی لکھی فیملی۔ مضبوط بیک گراؤنڈ۔ رائٹرز کے بارے میں جب پڑھتی ہوں تو بار بار خود سے سوال کرتی ہوں ''کیا میں لکھ سکتی ہوں''۔ جواب میں گہری خاموشی۔

آگے چلیے..... ''تین قالب'' منشاء محسن جب بھی آئیں، اک نئی تحریر، نیا آئیڈیا لے کر آئیں۔

کشف بلوچ کا افسانہ ''کچا گھڑا'' بہترین تھا۔ ان

بقیہ صفحہ نمبر 244 پر

عفت سحر طاہر

رنگ ہے دل میرے

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

نرمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

نرمین کی سہیلی بجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

نرمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت

دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
نرمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ سجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں سجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے نرمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں نرمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں سجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ نرمین بے یقین ہوتی ہے۔
وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ویسے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔
سجل نرمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے نرمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ نرمین کو برا لگتا ہے۔
نصرت رلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ نرمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ رلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
نرمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ نرمین، سجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر نرمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ نرمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔
نرمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے نرمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر سجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
نرمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، نرمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔
عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو نرمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔
مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔
نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
حریم عباد کیسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ نرمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔
مارک ڈینیل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ نرمین گھر میں نہیں ہوتی۔
حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد نرمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد نرمین کو باپ کی بات یاد

آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔

عباد نرمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے قریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آ جاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آ جاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر نرمین شادی کی ہامی بھر لیتی ہے۔ نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ سجل فون کر کے نرمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور اسے پرپوز کرتا ہے۔ نرمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔

رات میں حریم نریم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کر لو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کر لوں۔ پھر اسے بتاتی ہے کہ عباد وسیم نے اسے پرپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

سجل کے سمجھانے پر حریم کو احساس ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے، اس نے اپنی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ حالات کو انتہا پر آتے دیکھ کر حریم شوہر سے کہتی ہے کہ وہ میرب سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اسے آخری چانس دے رہا ہے، اس کے بعد اسے یہاں سے جانا پڑے گا۔

وہ میرب کے لیے شاپنگ کا کہتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤٹ لیٹ پر آ جاتا۔ زیاد واپس پہنچتا ہے تو کیتھی کی ساتھی ویٹرس اسے بتاتی ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ کسٹمر آیا ہے۔

زیاد کیتھی کو بتاتا ہے کہ اس کے بھائی نے پسند کی شادی کر لی ہے اور ماں باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور بھائی کی منگیتر اس کے سر منڈھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔

پال کیتھی سے کہتا ہے کہ اسے اب مارک کے مستقبل کی پلاننگ کرنی چاہیے۔ وہ اکتا کر وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔

مارک اس سے راستے میں معافی مانگتا ہے، کیتھی کے انکار پر ثبوت ملنے کا کہتا ہے۔

کیتھی زیاد سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ عباد ماں باپ سے معافی مانگ کر گھر واپس آنے کا کہتا ہے۔

مائرہ، حریم کو آؤٹ لیٹ پر دیکھ کر برہم ہو جاتی ہے۔ نزہت بھی اس پر ناراض ہوتی ہے۔ حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر آتی ہے۔

حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر جاتی ہے۔ اماں کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوتا ہے کہ حریم کا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ وہ بچی کو پیار کرتی ہیں کہ اس میں نرمین کی شباہت ہوتی ہے۔

مائرہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ وہ ماں پر ناراض ہوتی ہے لیکن وہ کہتی ہیں کہ اپنی پھپھو کے سراب سے باہر نکل آؤ۔

نزہت بیٹے پر ناراض ہوتی ہیں کہ اسے حریم کے میکے کیوں بھیجا۔ مائرہ اسے اپنے آنے والے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتا ہے کہ اسے اب زندگی میں آگے بڑھ جانا چاہیے۔ مائرہ باہر جانے کا پروگرام بناتی ہے لیکن وہ منع کر دیتا ہے کہ اسے حریم اور میرب کو لینے جانا ہے۔ مائرہ شدید غصے میں گھر آتی ہے جہاں اس کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آئے ہوتے ہیں، وہ ان سے بدتمیزی کرتی ہے۔ فوزیہ بیٹی کو ڈانٹتی ہیں، وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

کیتھی کے گھر والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔ وہ اسے لے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ زیاد ہر جگہ اسے تلاش کرتا ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلتا، مائرہ خودکشی کر لیتی ہے۔

اٹھارہویں قسط

اب کوئی آئے تو کہنا کہ..... مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جاتا لوگو؟
راہ تکتے ہوئے پتھرا سی گئی ہیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے سینہ ہوا چھلنی لوگو!

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں پیاری پیاری
نیند سی نیند، ہمیں اب نہ جگانا لوگو!

بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ دکھ کا گہرا۔ اندر تک کاٹ دینے والا احساس اور نہ ختم ہونے والے آنسو۔ لامتناہی یادیں جو عباد کے جانے کے بعد ایک کے بعد ایک نزہت کے پردہ ذہن پہ چلتیں تو وہ تڑپ تڑپ اٹھتیں۔

''ہائے، میں صدقے۔ ماں قربان جائے۔ عباد! میرے شہزادے۔ لعنت میری اس خودساختہ انا اور ناراضی پہ۔''

وسیم سیتھی کے کندھے ڈھلکے، بھرپور شیر جوان بیٹے کے چھوڑ جانے پہ ایک بازو کٹا ہوا محسوس ہونے لگا وہیں زیاد جیسا ٹھنڈے مزاج کا شخص ماں کی گود میں بکھر سا گیا۔ اس کا دوستوں جیسا بھائی، دم ساز و ہم راز اسے یک لخت ہی تنہا کر گیا تھا۔

لوگ تعزیت کرتے اور وہ عباد کی زندگی کے آخری لمحات یاد کر کے اندر ہی اندر گھلتا جاتا۔ وہ شیروں جیسا بھائی، کیسے دنوں میں ڈھیر ہوا اور اب فقط مٹی کی ڈھیری تھا۔ وسیم سیتھی ایک دم بوڑھے دکھائی دینے لگے کنپٹیوں اور بڑھی ہوئی ہلکی سی داڑھی میں سیاہ بالوں کے بیچ جھلکتے چاندی کے تار۔ وہ باقاعدگی سے ہیئر کلر میں ایسے چھپائے رکھتے کہ قریبی ملنے جلنے والوں نے بھی یہ سفیدی آج پہلی بار دیکھی۔ جوان بیٹے کی ناگہانی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا اور نزہت.....

ان کا صدمہ بہت بڑا تھا۔ بیٹے کی دائمی جدائی تو سہہ ہی رہی تھیں ساتھ اپنی بے مروتی، بے جا انا اور ضد کے مارے اسے خود سے دور رکھنا اب انہیں تڑپا رہا تھا۔ دور ہی دور سے وہ ہمیشہ کے لیے اتنی دور چلا گیا تھا کہ اب کبھی بھی راضی نامہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ نرمین..... جسے وہ کبھی دیکھنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ اب ان کی زندگی میں خاندان میں کہیں نہ تھی لیکن پھر بھی دل کو سکون نہیں تھا۔

وہ عباد کو آوازیں دیتیں تڑپ تڑپ کر روتیں۔ ان کی حالت انتہائی خراب تھی زیاد نے ڈاکٹر کو گھر بلوا کر انہیں ذہنی و اعصابی سکون کے لیے تسکن دوا کا انجیکشن لگوایا تب کہیں جا کر وہ غنودگی اور بے خبری کی آغوش میں گئیں اور پھر عباد وسیم سیتھی اپنی تمام حسرتیں دل میں لیے رخصت ہو گیا۔ ایک قیامت تھی جس کا قیامت سے پہلے ہی ان لوگوں نے سامنا کر لیا تھا۔

''نرمین بھابی کے گھر والوں کو بھی اطلاع دینی چاہیے تھی۔'' زیاد کو چند دنوں بعد شدت سے اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔

''اب تو کوئی فائدہ ہی نہیں بلکہ انہیں سن کر شاید زیادہ اذیت ہو گی۔ آخری بار اپنی بیٹی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکے وہ لوگ۔ جانے یقین بھی کرتے ہیں اس بات پر یا نہیں۔'' وسیم سیتھی نے اس کے احساس ندامت کو کم کرنا چاہا۔ مگر زیاد کو نرمین کی بہن یاد آئی۔ حریم نام تھا اس کا یہ عباد نے بار بار اسے بتایا تھا وہ جاب کرتی تھی کسی کالج میں پڑھا رہی تھی۔ اسے تو ضرور ہی بتانا چاہیے تھا۔ وہ تو اپنی بہن سے بہت محبت کرتی تھی۔ والدین سے چوری بہن اور بھانجی سے ملنے بھی آ جاتی تھی۔

مگر خیر۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔'' زیاد گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ جانے والے خالی ہاتھ چلے گئے اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ورثے میں بس دکھ، یادیں، تڑپ بے قراری اور آنسو چھوڑ گئے تھے۔

اسے عباد کی آخری دنوں میں کہی ایک ایک بات یاد تھی۔ مگر وہ ان تمام باتوں کی بازگشت سے بھاگتا پھرتا تھا۔ راتوں کو بے خوابی کا شکار ہونے لگا۔ جب سے پاکستان آیا تھا تب سے اس کا ہر پروگرام عباد کے ساتھ بنتا تھا اور اب جیسے وہ یک لخت ہی ''فارغ'' ہو گیا تھا یوں لگتا تھا دنیا کا ہر کام ہی ختم ہو گیا ہو۔ جیسے..... جیسے عباد

لوگ تعزیت کے الفاظ دہراتے اور وہ دل ہی دل میں اپنے بھائی سے کیے آخری وعدوں کو۔

☆☆☆

اماں ایک دم ہڑبڑا کر نیند سے اٹھیں تو ابا نے قرآن پاک بند کر کے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ماتھے پہ پسینے کی چمکتی بوندیں اور تیز چلتی سانس۔

''اللہ خیر۔'' انہوں نے خود کو نیند میں پا کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

''کیا ہوا نیک بخت! کوئی خواب دیکھ لیا؟''

''ہاں۔ بہت برا خواب تھا حریم کے ابا!'' ان کا دل ابھی تک بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔

''اللہ خیر کرے گا۔ اچھے برے خواب تو دکھائی دیتے ہی رہتے ہیں۔'' ابا نے انہیں تسلی دی تو انہوں نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابا کے سامنے تو وہ چپ رہ گئیں لیکن ابا کے ناشتا کر کے جانے کے بعد وہ حریم کو بتائے بنا نہ رہ سکیں۔

''آج بہت برا خواب دیکھا تھا میں نے۔ میرے ہاتھوں میں کوئی قیمتی شے ہے۔ اچانک ایک گدھ مجھ پہ جھپٹا اور میرے ہاتھوں سے وہ چیز چھین کر اڑ گیا۔ اللہ پاک رحم فرمائے۔''

''صدقہ دے دیں اماں! سب مشکلات دور رہیں گی۔'' حریم نے ان کی پریشانی دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ہاں۔ وہ تو تمہارے ابا کے ہاتھ بھجوا دیا تھا خالہ صغریٰ کو۔ پر دل بہت پریشان ہے۔ میری سب سے قیمتی چیز تو میری اولاد ہی ہے۔ اللہ پاک تم سب کو محفوظ و مامون رکھے۔'' اماں پژمردگی سے بولیں وہ ابھی تک اس خواب کے اثر سے نہیں نکل سکی تھیں۔

اس وقت تو حریم چپ ہو گئی مگر فارغ ہو کر جب دوپہر کو اپنے کمرے میں لیٹی تو اپنا موبائل اٹھا کر بے اختیار ہی نرمین کو کال ملا دی۔ کالج میں مڈ ٹرمز کی وجہ سے اس کا رابطہ نرمین سے منقطع ہی رہا تھا۔ ابھی بھی نرمین کا نمبر آف آ رہا تھا۔

''اف..... عباد بھائی کا نمبر بھی لینا چاہیے تھا۔'' تین چار بار ٹرائی کرنے کے بعد حریم نے موبائل ایک طرف ڈالتے ہوئے تاسف سے سوچا۔ اس نے دل ہی دل میں اگلے روز کالج سے واپسی پر نرمین کی طرف چکر لگانے کا سوچ لیا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا کپلوسی میرب کو دیکھے۔ وہ سوچ کر مسکرا دی۔

''کیا بات ہے آپی! کیا سوچ سوچ کر مسکرا رہی ہیں؟'' طوبیٰ نے چائے کا کپ اس کے پاس رکھتے ہوئے چھیڑا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''کچھ نہیں..... ویسے ہی۔ ایک اسٹوڈنٹ کی بات یاد آ گئی تھی۔'' حریم نے بات بنائی۔ پھر پوچھا۔

''اماں سو گئیں؟''

''نہیں۔ ابھی چائے دے کر آئی ہوں انہیں بھی۔'' طوبیٰ نے ڈائجسٹ اٹھا کر مطلوبہ کہانی کا صفحہ نکالتے ہوئے جواب دیا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

☆☆☆

''تم شادی کر لو زیاد! اب تو مجبوری ہے۔ میرب کو ماں کی ضرورت ہے۔'' نزہت نے ثریا کی گود میں ماں کے لمس کے لیے رو رو کر ہلکان ہوتی میرب کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے زیاد سے کہا تو اس نے آگے بڑھ کر ثریا سے میرب کو لے لیا اور اسے شانے سے لگا کر چپ کرانے لگا۔ حیرت انگیز طور پر وہ دو منٹ کے اندر چپ ہو گئی تھی۔ زیاد کا دل دکھ سے بھرنے لگا۔ میرب چپ تو ہو گئی لیکن ابھی بھی وقفے وقفے سے سسکاری بھر رہی تھی۔

اس حادثے کو۔'' ابھی پچھلے ہفتے عباد اور نرمین کا چالیسواں ہوا تھا۔

''جانتی ہوں میں..... لیکن میرب کی حالت بھی تو دیکھو۔ اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ اکیلی بچی بس ماں باپ کی عادی تھی۔ ہمارے تو پاس بھی مشکل سے آتی ہے۔'' نزہت خود بے بس تھیں ورنہ جس صدمے سے گزری تھیں ایسا سوچنا بھی ان کے لیے مشکل ہوتا۔

''میرے پاس آجاتی ہے آسانی سے۔ دن کو تو کھیلتی ہی رہتی ہے۔ رات کو میں پاس سلالوں گا اسے، آپ فکر مت کریں۔'' زیاد بمشکل بولا۔

''ہاں..... تم سے تو باپ کی خوشبو آتی ہوگی اسے۔ اتنے تو ملتے ہو عباد سے تم۔'' نزہت کی آنکھیں بھر آئیں بے اختیار ہی زیاد کے سر کی پشت پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی پیشانی اپنی طرف جھکا کر چوم لی۔

''میرا تو دل ہی نکال کے ساتھ لے گیا ہے وہ۔'' نزہت بیٹھ کر رونے لگیں تو زیاد نے ان کے شانوں پہ بازو پھیلاتے ہوئے اپنے ساتھ لگایا۔

''جو اللہ کی رضا تھی وہی ہوا مما! آپ بس ان دونوں کے لیے زیادہ سے زیادہ بخشش و مغفرت کی دعا کیا کریں یہی چاہیے انہیں ہم سے۔''

''میرا دل نہیں کرتا اس عورت کے لیے دعا کرنے کو۔'' نزہت نے جلبلا کر نرمین کے بارے میں کہا۔

''مما!'' وہ سناٹے میں رہ گیا۔

''وہی لے گئی تھی میرے عباد کو مجھ سے دور۔'' نزہت نے نم آنکھوں سے کہتے ہوئے اپنی بے جا ہٹ دھرمی کا ملبہ بھی نرمین پہ ڈال دیا۔

''جانے والوں کو اچھے لفظوں سے یاد کرنا چاہیے۔ مما! اس ٹاپک کو اب کلوز کر دیں۔ وہ اب اگلی دنیا کے مسافر ہیں۔'' زیاد کو ان کی سوچ کے انداز پہ افسوس ہوا۔

''میں بہت کوشش کرتی ہوں زیاد! پر میرے دل پہ لگے زخم کا درد جاتا ہی نہیں۔'' نزہت بے آواز رونے لگیں۔ زیاد ضبط سے سرخ آنکھیں لیے ان کا سر تھپکتا انہیں خاموش تسلی دیتا رہا کہ اس ''زیاں'' کا اور کوئی ''خراج'' نہ تھا۔

ثریا نے میرب کو سلا دیا تو زیاد کے کہنے کے مطابق وہ اسے بیڈ روم میں چھوڑ گئی۔ نزہت کے پاس میرب سو تو جاتی لیکن آدھی رات کو جب دودھ پینے کے لیے جاگتی تو پھر ماں باپ میں سے کسی کو بھی پاس نہ دیکھ کر جو رونا شروع کرتی تو کسی بھی جتن سے چپ نہ ہوتی تھی۔ اب تین روز سے زیاد اسے اپنے پاس سلا رہا تھا۔ ثریا سے اس نے فیڈر میں دودھ بنانا سیکھ لیا تھا۔ میرب، زیاد کی گود کی پہلے بھی عادی تھی تو آرام سے اس کے پاس سو جاتی۔ رات کو جاگتی تو فیڈر پی کر زیاد کی انگلی پکڑے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے اسے دیکھتے دیکھتے سو جاتی۔ ایسے موقعہ پر کئی بار بے بسی کے مارے زیاد کا دل چاہتا مرد ہونے کے باوجود رو دے۔

''یا اللہ! کیسی کڑی آزمائش ہے یہ۔'' نزہت کو حوصلے کے ساتھ سمجھانے والا خود بے بسی کے دہانے پہ آ کھڑا ہوتا۔

کبھی دل کرتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس بھاگ جائے۔ لیکن اب تو شاید تمام عمر واپسی ممکن نہ تھی۔ اس نے بھاری دل کے ساتھ عباد کے آؤٹ لٹ پہ جانا شروع کر دیا۔ وہاں جا کر وہ دن میں چھ ساتھ مرتبہ گھر فون کر کے میرب کے کھانے سونے رونے کی بابت پوچھتا۔ آتے ہی میرب اسے ایسے چمٹتی جیسے وہی اس کا سب کچھ ہو۔ میرب کی محبت نے جیسے زیاد کے لیے عباد کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ بچی اسے عباد جتنی ہی عزیز ہو گئی تھی۔

تھا۔

☆☆☆

رکشہ سے اتر کر کرایہ دیتی حریم سر اٹھا کر اس کثیر المنزلہ شان دار عمارت کو دیکھنے لگی۔ جہاں کے ایک مہنگے ترین فلیٹ میں اس کی بہن بھی رہتی تھی۔

بیگ میں بقیہ رقم رکھ کر زپ بند کرتی وہ اس عمارت میں داخل ہوئی لفٹ میں داخل ہو کر وہ مطلوبہ پورشن پہ آئی۔ اس بار حد ہی ہو گئی تھی اتنے دن ہو گئے تھے نہ وہ ادھر آئی نہ ہی نرمین نے رابطہ کرنے کی زحمت کی۔ وہ دل ہی دل میں نرمین سے شاکی تھی۔

''چلو میں تو جاب کی وجہ سے بزی تھی۔ اسے تو چاہیے تھا کہ کال یا میسج کر لیتی۔''

وہ جا کر نرمین سے جھگڑنے والی تھی مگر وائے قسمت۔ فلیٹ کی ڈور بیل بجا بجا کر اسے اندازہ ہوا کہ گھر میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ حریم کی ناراضی اور بڑھی۔

''یہ محترمہ تو سیر پہ نکلی ہوئی ہیں یقیناً اسی لیے کوئی خیر خبر نہیں۔ ایسی بھی کیا بے رخی..... ہنہ..... پیسے والے لوگ۔'' حریم خفا سی ہو کر واپس لوٹی۔ خوامخواہ رکشے کے تین سو روپے آنے جانے میں ضائع ہوئے۔

''اب خود ہی واپس آ کر رابطہ کرے گی۔'' تمام راستے وہ خفگی سے سوچتی آئی۔ ''سسرال ہی نہ شفٹ ہو گئی ہو۔ اسے شوق بھی تو تھا جانے کا۔ کب سے عباد بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔'' سوچوں کی اڑان جاری تھی۔ لیکن حریم مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اس کی ماں کے خواب میں بیتی چیز نرمین ہی تھی جوان سے واپس چھین لی گئی۔ وہ قیامت تک یہ وہم نہیں کر سکتی تھی کہ نرمین اب اگلے جہان کے سفر پہ نکل گئی تھی۔ جہاں سے اس کی کوئی کال کوئی میسج نہیں آنا تھا۔

''اتنی دیر کر دی آج۔ میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔'' اماں نے اسے دیکھتے ہی کہا تو حریم کا دل دھڑکا۔

''ابا آ گئے؟''

''وہ تو نہیں آئے۔ تم کہاں تھیں؟'' اماں بھی کچھ کچھ ابا بنتی جا رہی تھیں۔

''کالج میں تھی اماں! واپسی پہ رکشہ ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔'' بول کر خود ہی زبان دانتوں تلے دبائی، اماں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں تو وہ جلدی سے بولی۔

''آج وین والا لینے ہی نہیں آیا چھٹی کے وقت رکشہ لینا پڑا۔ تبھی تو دیر ہو گئی۔ بھوک بھی لگ گئی بہت زبردست والی۔ آج کیا پکا ہے؟''

''گوبھی آلو بنائے ہیں۔ منہ، ہاتھ دھو کے آ جاؤ۔''

اماں اسے گھورتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھیں تو حریم شکر ادا کرتی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

☆☆☆

نزہت نے اس پر شادی کے لیے زیادہ زور دیا تو زیاد بے بس ہونے لگا۔

عباد کی آخری وصیت کا سوچتا تو اپنی جان نکلتی محسوس ہونے لگتی۔ وصیت سے ہٹ کر کچھ کرنا اگر سوہان روح تھا تو اس کی وصیت پہ عمل کرنا بھی زیاد کو اپنی آدھی موت لگ رہا تھا۔ وصیت کیا تھی۔ عباد جاتے جاتے اپنی خواہش بتا کر فیصلہ اس کی رضا پہ چھوڑ گیا تھا۔

کیتھی اس کی زندگی کی کتاب سے ان پڑھے باب کی طرح چھوٹ گئی تھی لیکن پھر بھی اس کے علاوہ کسی اور کو شریک سفر بنانا زیاد کے لیے سوہان روح تھا۔ ادھر نزہت کی سوچ اپنی بھتیجی کی محبت سے آگے جاتی ہی نہیں

''میں زیادہ سے شادی کرلوں گی لیکن..... اس میرب کے لیے آپ کو فل ٹائم ملازمہ ہی رکھنی ہوگی۔'' مائرہ نے صفاچٹ انداز میں بتادیا تو نزہت سر پکڑ کر بیٹھ گئیں، کوئی بھی حالات کو سمجھنے نہیں دے رہا تھا۔ اور ان دنوں جب وہ تقریباً مائرہ کے لیے رضامندی دے ہی چکا تھا۔ اسے یکلخت احساس ہوا کہ اس کا فیصلہ بالکل غلط تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میرب کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ لیپ ٹاپ کا بیگ وہیں صوفے پر پھینک کر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ تیز قدموں سے چلتا اس آواز کی سمت بڑھا جو میرب کے کمرے سے آرہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھولتے زیاد کا ہاتھ بے ساختہ رکا۔

''کیا مصیبت ہے پھپھو! اس کا راگ تو ختم ہی نہیں ہو رہا۔ کتنی دیر سے ایک فضول سی ضد کے پیچھے روئے جا رہی ہے۔'' مائرہ کی جھنجھلائی ہوئی آواز سن کر اس نے لب بھینچے۔

''پیار سے بات کرو مائرہ! بچی ہے پیار کی بات سمجھے گی۔ مجبوری ہی سہی مگر نبھانی تو ہے نا۔''

''ہر وقت تو ماما ماما کی رٹ لگائے رکھتی ہے۔ اب اور کتنا پیار سے بات کروں صبح سے شام ہو جاتی ہے اس کے پیچھے اور اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' ناگواری مائرہ کی آواز سے ظاہر تھی۔ گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا تو اسے دیکھ کر مائرہ کے تاثرات جادوئی انداز میں بدلے۔

''دیکھو نا ایسے، مجال ہے جو یہ کہنا مان جائے۔ بے وجہ روئے چلی جا رہی ہے۔'' وہ اس سے میرب کی شکایت لگانا چاہتی تھی لیکن اس کی طرف ذرہ برابر بھی توجہ دیے بنا وہ تیزی سے رونی مچلتی میرب کی طرف بڑھا۔ میرب اسے دیکھتے ہی بانہیں اٹھا کر اس کی گود میں چڑھ آئی۔

''کیا ہو گیا لٹل فیری۔ کیوں رو رہی ہے میری پرنسس؟'' زیاد کا انداز اس قدر بے اختیارانہ تھا کہ مائرہ نے تپ کر نزہت پھپھو کو دیکھا تو وہ نظر چرا گئیں۔ پھر بھتیجی کی حمایت میں ناگواری سے بیٹے کو سمجھانے لگیں۔

''ہمارا کہنا تو یہ مانتی نہیں تم نے بہت سر پر چڑھا رکھا ہے اسے۔ تمہارا بے جا لاڈ پیار اسے ضدی بنا رہا ہے۔''

''بے جا؟'' سسکتی ہوئی میرب کو شانے سے لگائے وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ تحیر سے بھنوؤں کو جنبش دے کر پوچھا پھر گویا وضاحت کی۔

''یہ پیار اس کا حق ہے مما! اسے حق ہے کہ یہ لاڈ نخرے دکھائے۔ یہ تو بچی ہے محض دو سال کی اسے کیا پتا۔ یہاں تو بڑے بڑوں کے نخرے اور ضدیں ختم نہیں ہوئیں ابھی تک۔'' ایک نظر تنے تاثرات لیے سینے پر بازو لپیٹے کھڑی مائرہ پر ڈال کر وہ میرب کو شانے سے لگائے کمرے سے نکل گیا تھا۔

''دیکھ لیا آپ نے پھپھو! اس کل کی بچی کی خاطر کتنی جلی کٹی سنانے لگا ہے مجھے اور آپ کہتی ہیں کہ اس ڈیڑھ فٹی فتنی کے نخرے اٹھاؤں میں۔'' زیاد کے جاتے ہی مائرہ نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہا۔ میرب کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ سے اس کی بے زاری ٹپک رہی تھی۔

''بچی ہے وہ مائرہ! اتنی ایج کے بچے بات بات پر ماں سے ضدیں ہی کرتے ہیں اور پھر اپنی اولاد کا کیا کروں میں۔ اسے تو کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا سوائے اس بچی کے۔ میرا اپنا بس چلتا تو گورنس رکھ لیتی اس کے لیے۔''

''مگر میں اس کی ماں نہیں ہوں پھپھو!'' وہ زور دے کر بولی۔

''اس حقیقت سے نظریں چرانے سے کوئی فائدہ نہیں مائرہ! جولڑکی بھی اس سے شادی کرے گی وہ میرب کی ماں ہی بنے گی۔ یہ بات وہ مجھے صاف لفظوں میں کہہ چکا ہے۔'' انہوں نے آج اسے سنجیدگی سے باور کرایا ہی

''واٹ؟'' مائرہ کو شدید اعصابی جھٹکا لگا۔

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ اسے بیوی نہیں بلکہ اس بچی کے لیے ماں چاہیے؟''

نزہت نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''میں اسے ہر طریقے سے سمجھا کر دیکھ چکی ہوں۔ اب اس سے مایوس ہو کر تمہیں سمجھا رہی ہوں مائرہ! کیا فرق پڑتا ہے تھوڑی قربانی دے کر اپنی لائف بہتر کرنے سے۔ کسی ضد کے پیچھے اپنی لائف برباد مت کر لینا۔ چلتی پھرتی خود سے کھاتی پیتی بچی ہے کون سا گود میں اٹھا کر پالنے والی ہے۔''

''تو وہ اس کے لیے گورنس کیوں نہیں رکھ لیتا پھپھو! ساری دنیا ایسے ہی کرتی ہے۔ خوامخواہ چھوٹی سی بات کا ایشو بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' مائرہ زچ آ گئی۔

''یہ سب باتیں اور بحث ان چھ ماہ میں ہم ہزاروں بار کر چکے ہیں وہ میرب کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس ہے اور اس کے معاملے میں وہ کسی گورنس پر اعتبار نہیں کرتا۔'' نزہت نے نرمی سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، بھتیجی کی ضد اور ہٹیلے پن سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھیں۔

''میں خود اس کا دماغ ٹھکانے لگاؤں گی۔ سمجھتا کیا ہے یہ خود کو۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی نزہت اسے مزید سمجھانا عبث جان کر گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

زیاد اپنے دوستوں کو کہہ کر آیا تھا کہ جونہی کیتھی کے بارے میں کوئی خبر ملے اسے فوراً آگاہ کریں۔ سب کے پاس زیاد کا رابطہ نمبر اور گھر کا ایڈریس تک موجود تھا لیکن کیتھی تو نا جانے دنیا کے سمندر میں کہاں کھو گئی تھی۔

بیڈ روم سے ملحق بالکنی میں کھڑا وہ سینے پہ بازو لپیٹے ایک ٹک سامنے سڑک پہ گزرتی گاڑیوں کی جلتی بجھتی روشنیوں پہ بے تاثر نگاہیں جمائے ہوئے کھڑا تھا۔

اس کے کانوں میں نزہت اور مائرہ کے مابین ہونے والی گفتگو گونج رہی تھی

''پھپھو! خدا کے لیے۔ آپ ہی سمجھائیں اپنے بیٹے کو۔ میں اس ذلیل عورت کی نشانی کو ایک گھنٹہ برداشت نہیں کر سکتی اور وہ چوبیس گھنٹے کے لیے اسے میرے سر پر تھوپنا چاہتا ہے۔'' مائرہ کا غصے سے برا حال تھا۔

''ابھی وہ کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے مائرہ! اور سمجھانے کا کیا کہتی ہو۔ میں نے تو یہاں تک کہا تھا بچی کو اس کے ننھیال کے حوالے کر آؤ۔ مگر اس کی اینچ منٹ تم جانتی ہو۔'' نزہت خود بھی تنگ تھیں بیٹے کی ضد سے مگر یہ اس کی فطرت تھی شاید مائرہ کو معلوم نہیں تھا کہ عادتیں بدلی جا سکتی ہیں فطرت نہیں۔

''تم ہی کچھ کمپرومائز کر لو مائرہ! وہ ہاتھوں سے نکل جائے گا ضد کے کھیل میں۔'' نزہت بیٹے کی فطرت سے خوب آگاہ تھیں اور بھتیجی کی ضد سے بھی۔

''کیا کمپرومائز کروں؟'' وہ پھٹ پڑی۔ ''میرب کو دیکھتی ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے پھپھو! یوں لگتا ہے جیسے میری سوکن کی بیٹی میرے سامنے آ گئی ہو نفرت ہے مجھے اس فتنی سے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''یا تو اس فتنی سے نفرت کر لو یا پھر اس کے باپ سے محبت مگر میری ایک بات یاد رکھنا مائرہ! میرب وہ پل ہے جسے پار کر کے ہی تم منزل تک پہنچ سکتی ہو ورنہ اس پار ہی بھٹکتی رہو گی اور یقین مانو میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گی باوجود اپنی پوری کوشش کے۔''

''خدا کے لیے پھپھو! کوئی راستہ نکالیں ایک بار پھر میں وہیں کھڑی ہوں اسی بند گلی میں جہاں پہلے اس کی ماں میری زندگی اجاڑنے کا باعث بنی اور اب میرب..... میں اب زیاد کو کھونا نہیں چاہتی لیکن میں اس عورت کی

''زندہ یاد'' کو ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے بھی نہیں دیکھ سکتی اور اس پر سے زیاد کا میرب کی ہر ہر بات پر فدا ہونا۔ میرے لیے تو اس کے پاس ابھی سے وقت نہیں ہے اگر یہ ''قیامت'' مستقل ہمارے سروں پر مسلط رہی تو وہ تو کبھی مجھے دیکھے گا بھی نہیں۔'' مائرہ کی آواز آخر تک آتے آتے بھرا گئی نزہت نے گہری سانس بھری۔ سچ بات تو یہ تھی کہ وہ بھی اس معاملے پر بہت پریشان تھیں مگر فی الحال تو کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

''پھپھو! آپ اپنی اسی بات کو فوکس کریں اور اس سے کہیں کہ میرب کو اس کے ننھیال کے حوالے کردے۔''

مائرہ نے انہیں پھر سے اکسایا تو وہ اسے تسلی دینے لگیں۔

''تم فکر مت کرو۔ میں اس کے ڈیڈی سے بات کرتی ہوں ہوسکتا ہے ان کے سمجھانے سے ہی کوئی راستہ نکل آئے۔'' نزہت نے مائرہ کے جلتے دل پہ پھاہا رکھنے کے لیے تسلی دی لیکن نزہت نہیں جانتی تھیں کہ میرب کو اس کے ننھیال کے حوالے کرنے کا مشورہ دے کر وہ کس سوئے ہوئے فتنے کو جگا رہی ہیں۔

''مائرہ کسی طور بھی میرب کو قبول نہیں کرسکتی مما! اور میں اسے کام والیوں کی گود میں نہیں پلنے دے سکتا۔'' زیاد نے ان تین ماہ میں نزہت کے کہنے کے مطابق مائرہ کو ہر موقع دے کر دیکھ لیا تھا۔

''بچے گورنس کے پاس بھی اچھے سے پل جاتے ہیں زیاد! ہماری سوسائٹی میں تو آدھے سے زیادہ بچے گورنس ہی پالتی ہے اب۔''

''میرو کو آپ نے دیکھا ہے مما! وہ ثریا یا نسرین سے بہل کر سو تو جاتی ہے لیکن رات کو درمیان میں اگر جاگ جائے تو پھر جو رونا شروع کرتی ہے اس کا کوئی حل نہیں ان دونوں کے پاس۔ وہ صرف میرے پاس اچھی طرح سوتی ہے تو کیا شادی کے بعد میرب کو کام والیوں کے حوالے کردوں؟ یعنی جس کے لیے شادی کرنی ہے اسی کا کانٹا نکال دوں۔ واہ..... کیا سوچ ہے مائرہ بی بی کی۔'' وہ تلخ ہوتے ہوئے جھلایا۔ تو نزہت گڑبڑائیں۔

''آپ اپنی بھتیجی کی فطرت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ وہ میرب کے بارے میں جو کچھ سوچتی ہے وہ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں ایک ایک لفظ اپنے کانوں سے سن چکا ہوں مما! اب بس۔ مزید کچھ نہیں۔''

نزہت سن ہو گئیں۔

''شادی تو مجھے کرنی ہی ہے۔ اپنے لیے نہ سہی میرو کے لیے سہی۔'' زیاد نے کہا تو وہ جلدی سے بولیں۔

''تم سے پہلے بھی کہا ہے زیاد! میرو کو اس کے ننھیال والوں کے حوالے کیوں نہیں کردیتے۔ نانی خالہ کوئی تو ہوگی اسے سنبھالنے والی۔''

''اب میں نے بھی یہی سوچا ہے مما! مائرہ اس قابل نہیں کہ میرب کو ایک ماں کا پیار دے سکے۔ عباد کی آخری خواہش بھی یہی تھی کہ میرو کو اس کی خالہ کی کسٹڈی میں دے دیا جائے۔ وہ میرب سے بہت پیار کرتی ہے۔'' زیاد نے آزردگی سے بتایا تو نزہت کھل اٹھیں۔

''تو بیٹا اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ تم نے یونہی سب کو امتحان میں ڈال رکھا ہے۔ تمہیں فوراً عباد کی آخری خواہش پوری کرنی چاہیے۔ روپیہ پیسہ سب ہم دیں گے اپنی پوتی کی پرورش کے لیے۔ کسی چیز کی کمی نہ ہوگی۔'' نزہت خوش ہوئیں سانپ بھی مر رہا تھا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ رہی تھی۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ میرب اپنی خالہ کے پاس چلی جاتی تو آسانی سے زیاد اور مائرہ کی شادی ہوسکتی تھی۔ زیاد کو ماں کی بے حسی پہ تاسف ہوا۔

''میرو وہاں نہیں جائے گی مما!۔'' وہ تحمل سے گویا ہوا۔

''اچھا.....'' وہ حیران ہوئیں۔ پھر اندازہ لگاتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔'' تو وہ میرب کی گورنس بن

کے یہاں رہے گی۔

''میرب کی گورنس نہیں مما! میری بیوی اور میرب کی ماں بن کر۔'' سیٹھی ہاؤس کی چھت نزہت کے سر پہ آگری تھی۔ ان کی آنکھیں پھٹیں۔

''یہی عباد کی آخری خواہش یا وصیت تھی۔ میں پھر بھی مائرہ کو چانس دینا چاہتا تھا لیکن وہ کبھی بھی میرب کو قبول نہیں کر سکتی اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا اور نزہت بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو زیاد؟'' بمشکل ان کی آواز نکلی۔

''سچ کہہ رہا ہوں مما! اور یہ سب ایسے ہی ہوگا جیسی عباد کی خواہش تھی۔ میں اس کی روح کی بے چینی کا سبب نہیں بننا چاہتا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔ اور نزہت کا دل چاہ رہا تھا اپنے بال نوچنا شروع کر دیں۔

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ میں مائرہ کو سمجھاؤں گی وہ میرب کو قبول کر لے گی۔''

''یہ دل کے معاملات ہوا کرتے ہیں مما! کسی کے ڈالنے سے دل میں جذبات نہیں ڈالے جاتے۔'' زیاد نے انہیں نرمی سے منع کر دیا تھا، نزہت اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

پچھلے تین روز سے حریم ایک مخصوص گاڑی کو اپنی وین کے پیچھے آتا محسوس کر چکی تھی۔ اس کی وین میں اس کے علاوہ کالج کی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ یہی سمجھی کہ ان میں سے کسی کا پیچھا کیا جاتا ہے مگر آخری اسٹاپ اسی کا تھا اور جب وہ اپنے دروازے کے سامنے اتری تو وہ ڈارک براؤن شیشوں والی گاڑی بھی اس کی وین سے ذرا پیچھے رکی اور اس کے گھر جانے تک وہیں کھڑی رہتی۔ شروع کے تین دن تو اسے وہم سا ہی رہا مگر گزرے ایک ہفتے میں مسلسل یہ روٹین برقرار رہنے پر اسے یقین ہو گیا کہ بدنامی اور بدقسمتی ایک بار پھر اس کے پیچھے لگ چکی ہے۔

حریم کا روم روم خوف میں مبتلا ہو گیا۔ زمین کے گھر سے جانے کے بعد سے ابا کا رویہ اس قدر شک اور غضب سے بھر گیا تھا کہ انہیں اس بارے میں کچھ بتانا ہی قیامت لانے جیسا تھا، ہیں اماں! تو وہ اب ویسے ہی ابا کی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھیں۔ حریم بس اللہ ہی سے فریاد کرتی رہی کہ اس مشکل کو ٹال دے۔

☆☆☆

''سر..... یہ ڈٹیلز ہیں۔ نام حریم مصطفیٰ..... مصطفیٰ احمد والد کا نام ہے چیمہ کالونی میں رہائش ہے مکان نمبر پندرہ۔ ذوالفقار عرف زلفی سے منگنی ہو چکی ہے میڈم کی اور ایک آدھ ماہ تک شاید شادی بھی متوقع ہے۔'' زیاد کے سامنے پیپر رکھتے ہوئے ڈرائیور نے تفصیل بھی بتائی۔ زیاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ آفس کا دروازہ کھولتا باہر چلا گیا۔

پیپر اٹھا کر زیاد نے اس پہ لکھی تحریر پہ نظر ڈالی۔ وہاں وہی سب کچھ لکھا تھا جو ابھی ڈرائیور نے اسے بتایا تھا۔ وہ پرسوچ نظروں سے کاغذ پہ لکھی تحریر کو دیکھنے لگا۔ کیا صحیح تھا کیا غلط۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن جو وہ کرنے جا رہا تھا شاید وہ صحیح کو غلط کر دیتا یا شاید غلط کو صحیح۔

اس نے پیپر پہ لکھا موبائل نمبر دیکھا۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑے۔ اپنا موبائل اٹھا کر زیاد نے اس میں وہ نمبر محفوظ کیا اور پھر اس نمبر پہ کال کی۔ کچھ ہی دیر میں کال ریسیو کر لی گئی۔

☆☆☆

''تمہاری بھتیجیوں نے تو قسم ہی کھالی ہے اماں! کہ میرا گھر نہیں بسنے دینا۔'' زلفی نے گھر آتے ہی تماشا لگا دیا تھا۔ نصرت نے گھبرا کر دل پہ ہاتھ رکھا۔

''منحوس! پوری بات تو بتا۔ کیا آتے ہی تو نے بندروں کی طرح ناچنا شروع کر دیا ہے۔'' پھپھا کے سامنے اسے خاموش رہنے کا اشارہ بھی نہیں کر سکتی تھیں، سو اس پہ الٹ پڑیں۔ وہ تو اب اس اسٹیج پر تھے کہ مصطفیٰ احمد کی بیٹیوں کی ذرا سی بات سنتے اور بم کی طرح پھٹ پڑتے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس گدھے زلفی کو یہ نازک بات کون بتاتا کہ باپ کے سامنے حریم کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بکنا اپنے ہی پاؤں پہ کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔

''آج فون آیا ہے مجھے۔ اس کے کسی عاشق کا۔ کہہ رہا تھا حریم کا پیچھا چھوڑنے کا کیا لو گے؟'' زلفی روہانسا ہو رہا تھا۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی، بات ان کی سوچ سے کہیں زیادہ گمبھیر نکلی تھی۔

''کم بخت۔ تیرے ہی کسی دوست نے یہ بے ہودہ مذاق کیا ہوگا۔'' نصرت ہوش میں آ کر تیز لہجے میں بولیں تو زلفی نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''اور کیا کہہ رہا تھا؟'' پھپھا کی تیوری پر بل پڑ چکے تھے نتھنے مارے غصے کے پھولنے پچکنے لگے۔

''اور بھی کئی دھمکیاں دے رہا تھا کہ یہ منگنی توڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا اور یہ کہ ایک پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی کی زندگی برباد کر رہا ہوں میں۔'' زلفی کو رونا آ رہا تھا۔ زیاد نے یقیناً دو ٹوک ہی بات کی تھی بھی وہ گیدڑ بنا ہوا تھا۔

''میں تو پہلے ہی اس رشتے کے حق میں نہیں تھا مگر تم ماں بیٹے کو شوق تھا پڑھی لکھی بہو گھر لا کر اس کی کمائی پہ عیش کرنے کا۔ کر لو عیش اور برداشت کرو ساتھ اس کے عاشقوں کی لائن کو بھی۔'' پھپھا نے دانت پیسے۔

''زلفی کے ابا! حد کرتے ہیں آپ بھی۔ اتنی معصوم بچی ہے میری۔ کوئی غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کسی کو۔ ہزار دشمن ہوتے ہیں بندے کے۔'' نصرت انہیں کسی انتہائی اقدام تک پہنچنے سے پہلے ہی روکنا چاہتی تھیں، میٹھے لہجے میں بولیں تو انہوں نے خوں خوار نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

''پہلے والی بھی اتنی ہی معصوم لگتی تھی تمہیں۔ جب تک کہ گھر سے بھاگ نہیں گئی۔'' ان کا طنز پھپھو کو تڑپا گیا۔

''اے لو..... تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ باقی بھی۔'' وہ منمنائیں۔

''حالات تو یہی بتا رہے ہیں۔'' وہ تلخ ہوئے۔ ''کل جا کے انگوٹھی منہ پہ مار کے آؤ ان کے اور کوئی شریفوں کی بچی بیاہ کے لاؤ گھر میں ورنہ بے شک ساری عمر کنوارہ بٹھائے رکھو اسے۔''

پھپھا نے دبنگ لہجے میں فیصلہ سنایا تو زلفی کے پیروں تلے سے زمین کھسکی۔ نصرت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا جس نے منٹوں میں بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

''کمبخت مارے۔ ذرا دیر اور صبر کر لیتا تو کیا ہو جاتا۔ اب کنوار کو ٹھاڈال کے بیٹھنا ساری عمر۔ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی حریم جیسی تو نہ ملے گی۔'' پھپھا کے جاتے ہی نصرت نے بیٹے پر چڑھائی کی تھی۔

''مجھے دکھ ہی اتنا تھا۔'' وہ احتجاجاً بولا۔ ''کوئی جولڑکی اچھی نکلی ہو ماموں کی۔''

''گالیاں دیتا اس کمینے کو۔ کچھ دھمکیاں تو بھی لگا دیتا تو دوبارہ ہمت نہ ہوتی اس کی فون کرنے کی۔'' نصرت ہاتھ مل رہی تھیں۔

''اور ابھی پوری بات بتائی کہاں ہے میں نے۔ ابا کے ڈر سے۔'' اس نے روہانسا ہو کر کہا تو نصرت چونکیں۔

''کون سی پوری بات؟''

''اسے گالیاں بھی دیں اور دھمکیاں بھی لگائیں میں نے..... لیکن فون کال کے آدھے گھنٹے بعد اس بندے نے اپنے ڈرائیور اور گارڈ کو بھیج دیا۔ میرے سامنے بیٹھ کے دھمکیاں دے کر گئے ہیں مجھے۔ دفع کرو

مارے حیرت کے گال پہ انگشت شہادت رکھے اسے دیکھنے لگیں۔
"ہوش میں تو ہو۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟" بے یقینی سے کہا۔
"صحیح کہہ رہا ہوں اماں! کوئی بڑا پیسے والا بندہ پھانسا ہے تمہاری بھتیجی نے۔ یہ بڑی گن پکڑی ہوئی تھی اس کے گارڈ نے اور مجھے مرنے کا کوئی شوق نہیں زندہ رہوں گا تو ہی شادی بھی ہوگی نا۔" زلفی بدکا ہوا تھا۔ نصرت سر تھام کر بیٹھ گئیں۔
"اتنی مشکلوں سے یہ رشتہ نکا ہوا تھا زلفی! تو ہے ہی منحوس۔ تیری قسمت میں ہی نہیں کہ تو بیٹھ کے بیوی کی کمائی کھائے۔"
"میں منحوس نہیں اماں۔ تمہاری بھتیجیوں نے ہی بے شرمی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔"
زلفی اترے چہرے کے ساتھ تلملا کر بولا۔ کیا کیا منصوبے نہ بنا لیے تھے حریم کی کمائی اڑانے کے۔ دوستوں میں الگ اب پھر سے ہنسی اڑنے والی تھی۔
"اسے تو میں کل ہی جا کر پوچھتی ہوں۔ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر وار کرتی ہے۔ ان فتنیوں کو میرا ہی گھر ملا برباد کرنے کو۔" نصرت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

☆☆☆

گھر آتے ہی اسے جو الزام سننے کو ملا اس نے حریم کو گنگ کر ڈالا۔
"اماں! مجھے تو پتا بھی نہیں۔ کون کس نے فون کیا زلفی کو؟ جھوٹ بولتا ہے بکواس کرتا ہے وہ۔"
"نصرت انگوٹھی اور کپڑے پھینک گئی ہے۔ دھمکیاں لگائی ہیں کسی نے زلفی کو کہ اگر تم سے شادی کی تو اپنے پیروں پہ چل نہیں پائے گا۔" اماں شاکی اور بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ حریم کی رنگت فق پڑی اور ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تو وہ بستر پہ گر سی گئی۔ طوبیٰ بھاگ کر اس کے لیے پانی لائی تھی۔
"آپ کو پتا ہے اماں! میں نے اپنی مرضی سے زلفی کے رشتے کے لیے ہاں کرنے کو کہا تھا۔ پھر میں کیوں یہ سب کروں گی؟" حریم گھگھیائی۔
"مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ ایک بار پھر میرا گھر آندھیوں کی زد میں ہے۔" اماں نے سسکی بھری۔ تو حریم کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔
"زاہدہ! اس سے کہو۔ سیدھے راستے بلائے اس کو۔ چار کلمے پڑھوا کے رخصت کر دوں گا اسے۔" ابا ٹوٹ گئے تھے۔
"ابا! میرا یقین کریں۔ میں نے کسی کے ذریعے فون نہیں کروایا اور نہ ہی میں کسی زیاد نام کے بندے کو جانتی ہوں۔" حریم کی رنگت فق تھی اور لہجہ گڑگڑانے والا تھا۔ ابا بالکل خاموش تھے۔ لب یوں ایک دوسرے میں پیوست جیسے اب کبھی کچھ نہ بولنے کی قسم کھالی ہو۔
اور حریم کا تو سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے لگا تھا کہ آخر یہ زیاد ہے کون؟ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ "زیاد وسیم سیٹھی" کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ ایک بار تعارف کے دوران ہی شاید اس نے نرمین سے اس کا نام سنا ہوگا تب ہی تو ذہن سے محو بھی ہو چکا تھا، دوبارہ کبھی اس کا ذکر ہی نہیں ہوا ان دونوں کے درمیان۔ اس لیے حریم کا بھولے سے بھی نرمین کے دیور کی طرف دھیان نہیں گیا۔ وہ تو ابا کے سامنے اس "پیشی" پر ہی ڈوب مرنے والی ہو رہی تھی۔

Khawateen Digest August 2021

اس کی بات کا۔'' حریم کے جانے کے بعد اماں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''آگ ہوتی ہے تو دھواں اٹھتا ہے زاہدہ بیگم! ایسے گرے پڑے تو ہم کبھی نہیں تھے کہ کوئی بھی اٹھ کر ہماری عزت اچھال دیتا۔ یہ سب ہماری بدنصیبی ہے جو ہماری اولاد کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔'' ابا ڈھے گئے تھے۔

''کوئی للو پنجو اٹھ کر ایسی بات کرتا تو منہ توڑ دیتا میں اس کا۔ امیر کبیر باپ کا بیٹا ہے۔ نام ہے پورے شہر میں ان کا اور کاروبار بھی۔''

اماں ساکت رہ گئیں تو نرمین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حریم نے بھی اپنی زندگی کا امیر و کبیر ساتھی ڈھونڈ لیا تھا۔ انہوں نے شکوہ کناں نظروں سے حریم کی طرف دیکھا تو وہ بے دم ہو گئی۔

''یہ سب جھوٹ ہے اماں! یقین کریں۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔''

اس کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے الفاظ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ مگر بعض اوقات الفاظ سے زیادہ بے مول اور کچھ نہیں ہوتا کیونکہ ان میں اعتماد کی کمی ہوتی ہے۔

☆☆☆

نزہت کا سر درد کے مارے پھٹنے کو تھا۔ زیاد کی بے جا ضد اور اٹل انداز بتا رہے تھے کہ وہ اپنی بات منوا کر رہے گا میرب کو خیال کے حوالے کرنے والا مشورہ خود ان ہی کے گلے پڑ گیا تھا۔ مائرہ سے وہ اس قدر متنفر ہوا تھا کہ شادی کے لیے اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔

''میں عباد کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ!'' اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''اور میں..... میری کوئی خواہش نہیں؟ میری زبان کا کوئی پاس نہیں تمہیں؟'' نزہت جلبلائیں۔

''میں میرب کے لیے شادی کر رہا ہوں مما! اور مائرہ صرف مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ بات یہیں ختم ہوئی۔ مجھے میرب کے لیے ماں چاہیے۔ بیوی تو کوئی بھی بن سکتی ہے میری۔''

زیاد نے فیصلہ کن انداز میں کہا اس کے آگے کا کڑا مرحلہ۔ نزہت کے آنسو، ایموشنل بلیک میلنگ اور شور شرابا، سب زیاد نے بڑے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا تھا لیکن اپنی بات پر ثابت قدمی سے ڈٹا رہا۔

''اگر آپ کو مجھ پہ اعتراض ہے اور میرب کو بھی نہیں دیکھنا چاہتیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ پیپرز بنوا لیتا ہوں اس کے بھی۔'' یہ آخری حربہ تھا اس کے پاس نزہت کو منانے کا۔ ایک بیٹے کی جدائی میں تڑپتی ماں دوسرا بیٹا کھونے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔ چپ کر گئیں۔

''بے وقوفی مت کرو نزہت! وہ بھائی کی محبت میں جذباتی ہو رہا ہے۔ بہت گہرا صدمہ دیکھا ہے اس نے۔ آخری وقت میں دن رات ساتھ رہا ہے عباد کے تو اس کی باتوں کا ذہن پر اثر بھی گہرا ہوا ہے۔ اسے کرنے دو جو وہ کرنا چاہ رہا ہے۔''

''یعنی پہلے ایک بہن میرا بیٹا لے اڑی۔ اب دوسری کے حوالے اپنا دوسرا جگر کا ٹکڑا کر دوں؟'' نزہت بلک اٹھیں مگر وہ اتنی بات ضرور سمجھ گئی تھیں کہ زیاد اپنے جی میں آئی ضرور پوری کرے گا۔

''اس کی بات مان لو گی تو سکھی رہو گی۔ بیٹا نظروں کے سامنے رہے گا۔ پہلے اسی ضد کے ہاتھوں ایک بیٹا گنوا چکے ہیں ہم۔ کیا ملا سوائے پچھتاوے اور جدائی کے۔ دوبارہ اس راہ پہ قدم مت رکھو۔''

وسیم صاحب کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، وہ کسی بھی ایکس وائی زیڈ سے شادی کر لیتا، وہ صرف اپنے بیٹے کا گھر بستا دیکھنا چاہتے تھے۔ اصل دکھ تو نزہت کا تھا جو اپنے بھائی بھابھی سے نہ صرف زیاد اور مائرہ کے رشتے کی

بات کر چکی تھیں بلکہ مائرہ کے ساتھ تو ان کا رویہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آج کل میں وہ بس ان کی بہو بن کر اس گھر میں آنے والی ہو۔ وہ درد سے پھٹتا سر لیے وہیں لیٹ گئیں۔

☆☆☆

''یہ کیا کر رہے ہیں حریم کے ابا!'' ان کی بات سن کر اماں دنگ رہ گئیں۔

''نصرت تو واویلا مچا دے گی پورے خاندان میں۔ یہ رشتہ کر کے تو آپ اس کی باتوں کو سچ ثابت کر دیں گے۔''

''تو کیا کروں۔ انتظار کروں اس بیٹی کے بھی بھاگنے کا؟'' وہ زہر خند ہو رہے تھے۔ ''بہتر ہے کہ چار بندے بلوا کر جس کے ساتھ چاہتی ہے رخصت کر دوں۔ مزید ذلت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا میں۔''

''پر کون لوگ ہیں۔ ذات برادری؟''

''پہلی کون سا ذات برادری دیکھ کر نکلی تھی۔'' ان کا لہجہ کٹیلا تھا۔ ان کی بات نے اماں کا سر جھکا دیا۔

''میں ہار گیا ہوں زاہدہ! اپنی اولاد کی خودسری سے۔'' ابا کی آواز کپکپائی۔

''ایسا مت کہیں۔'' اماں کا دل لرزنے لگا۔

''نہ میرے خون نے اثر کیا نہ تمہاری تربیت نے۔'' وہ بے چارگی سے بولے۔ ''نظر ہی لگ گئی مصطفیٰ احمد کے آشیانے کو۔ کیا ہی بڑی غلطی کر دی میں نے بیٹی ذات پہ اعتبار کر کے۔'' وہ اپنا سر پیٹ رہے تھے۔ اماں روتے ہوئے انہیں سنبھالنے لگیں۔

''نہ مصطفیٰ صاحب! اللہ سے ناامید مت ہوں۔ وہ ضرور کوئی راہ دکھائے گا۔''

''اب تو ہر امید ختم ہو گئی زاہدہ بیگم! سوچا تھا ایک انڈہ گندا نکلا۔ یہاں تو باقی بھی اسی کے نقش قدم پہ چل نکلیں۔'' وہ بے بسی سے بولے تو اماں کی آنکھیں پھر آنسو بہائے۔

☆☆☆

نزہت مٹھائی اور پھلوں سے لدی پھندی آئی تھیں منہ پہ تو بارہ ہی بجے ہوئے تھے شاید رشتہ ہونے سے روکنے کے لیے وہ کوئی گڑبڑ ہی کر دیتیں لیکن زیادہ نے اسی لیے وسیم صاحب کو ساتھ بھیج دیا تھا۔

''عباد اور زمین کا بھول کر بھی ذکر مت کیجیے گا۔ ہمارے ساتھ زمین بھابی کا کیا رشتہ ہے وہ بالکل نہیں جانتے اور نہ ہی میرب کے بارے میں انہیں کچھ خبر ہے۔ آپ صرف میرے اور حریم کے رشتے کی بات کیجیے گا۔ کہہ دیجیے گا بچوں کی پسند کا رشتہ ہے۔'' اس نے دونوں کو اچھی طرح پڑھا کر بھیجا تھا۔

اماں ابا لاکھ متنفر سہی لیکن ان کی آمد اور شاہانہ انداز سے اندر ہی اندر شاید مرعوب ہو گئے۔ حریم گھر پہ ہوتی تو شاید قیامت ہی اٹھا دیتی۔ اپنے تئیں وہ ابا کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا چکی تھی، اسے کیا خبر تھی کہ ابا کے دل پہ لگا بدگمانی کا تالا بہت سختی سے بند تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اسے کالج جانے سے نہیں روکا تھا اور آج وسیم صاحب کی فیملی کو تمام معاملات طے کرنے کے لیے بلوا لیا۔

''جب ساری بات بچوں کے درمیان طے ہو چکی ہو تو باقی سب صرف تکلفات رہ جاتے ہیں۔'' نزہت کو ان کی شرافت اور سادگی ڈھکوسلہ لگ رہی تھی تب ہی نخوت سے بولیں۔ ابا کا سر مزید جھکا، وسیم صاحب نے تنبیہی نظروں سے بیوی کو دیکھا تو وہ سنبھلیں۔

''منگنی وغیرہ کے جھنجھٹ میں ہم نہیں پڑنا چاہتے۔ آپ بس نکاح کی تیاری رکھیے۔ اس جمعہ کو ہم آٹھ دس لوگ آ جائیں گے۔ باقی ولیمہ دھوم دھام سے ہوگا۔ آپ چاہیں تو اپنے سب دوست احباب کو انوائٹ کر سکتے ہیں۔''

وسیم صاحب نے شائستگی سے بات کی تھی۔ مصطفیٰ صاحب نے ڈھلکے کندھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ نزہت دل میں اٹھتے طوفانوں کو بڑی دقت سے دبائے ہوئے تھیں پھر بھی ان کے چہرے سے بیزاری اور ناپسندیدگی ٹپکی پڑتی تھی۔ حریم گھر آئی تو اسے تمام معاملے کا علم ہوا۔

''اللہ کا واسطہ ہے اماں! میں نہیں جانتی، یہ شخص کون ہے۔ آپ چاہیں تو شام سے پہلے زلفی کے ساتھ نکاح پڑھوا کر رخصت کر دیں مجھے..... لیکن یوں بے اعتبار تو نہ کریں۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''نہ بھی جانتی ہو تو کوئی بات نہیں۔ اچھے امیر لوگ ہیں نامور۔ پیسے والے۔ زلفی کی طرف سے تو ویسے بھی انکار ہو چکا ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہو جانے دو۔ اپنے باپ کو کچھ عرصہ مزید زندہ رہ لینے دو۔''

اماں نے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ ان کے بندھے ہاتھوں کو تھام کر ان پہ اپنی پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

''حریم مصطفیٰ ولد مصطفیٰ احمد۔ آپ کو ایک لاکھ روپے سکہ رائج الوقت حق مہر موجل زیادو سیم ولد وسیم احمد سیٹھی کے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو قبول ہے؟''

(نہیں.....) اس کا دل زور زور سے چلا رہا تھا۔

''ابا! یہ ظلم ہے..... ایسی بے اعتباری مت دکھائیں۔ آپ کی مرضی سے الگ میری کوئی پسند نہیں ہے۔ ایسے بے اعتبار کریں گے تو میں عین وقت پہ انکار کر دوں گی۔''

''انکار کر کے دیکھ لینا۔ مرا ہوا منہ دیکھو گی میرا۔'' ابا کے سرد لہجے نے حریم کی تمام ہمت پست کر دی تھی۔

''قبول ہے۔'' اس کا سرخ دوپٹے کے بوجھ سے جھکا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ پچھلے تین روز سے وہ مسلسل رو رہی تھی مگر ہوا وہی جو قسمت میں شاید زبردستی ہی لکھ دیا گیا تھا۔

''آج سے تم اپنی دنیا میں خوش رہنا اور ہمیں اپنی بہن کی طرح مرا ہوا سمجھ کر بھول ہی جانا۔''

ابا نکاح کے بعد اس کے پاس اکیلے رکے تھے۔ حریم ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونا چاہتی تھی مگر انہوں نے اسے روک دیا۔

''اب کبھی پیچھے مڑ کر مت آنا حری! اگر اپنے ابا کی زندگی عزیز ہے تو۔'' اماں نے تو گھر کا دروازہ ہی بند کر لیا۔ مجبوری تھی اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرنا اور وہ ابا نے اسے ہمیشہ کے لیے کر دیا۔

سرخ گلابوں سے سجی سیاہ شان دار کار سبک رفتاری سے فاصلہ طے کرتی ایک پوش علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔

اس گاڑی میں نئی نویلی دلہن کے ساتھ اس کا دولہا پچھلی سیٹ پر براجمان تھا۔ دلہن کا سر بوجھل اور درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

گھر والوں سے لڑکی کو کتنا بھی پیار کیوں نہ ہو۔ رخصتی کے وقت گاڑی کے چلتے ہی اس کی سانسوں اور خیالات کے تمام دھاگے پہلو میں بیٹھے شخص سے جڑ جاتے ہیں.. آنے والے لمحوں کا خیال دل کو عجیب سے انداز میں دھڑکانے لگتا ہے۔

مگر اس گاڑی میں بیٹھے لوگ..... شاید انسان نہیں روبوٹ تھے۔ دلہن ٹوٹا دل اور دکھتا سر لیے بے دم تھی۔ میکے کی گلیوں سے لپٹنے اور خاک کو چومنے کو جی چاہ رہا تھا اور کچھ نہیں تو دھاڑیں مار مار کر جاہل عورتوں کی طرح گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی روتی رہتی مگر جسے سارے رشتے ختم کر کے وداعی دی گئی ہو۔ وہ سوگ کیا کرے اور

دولہا اپنے پہلو میں بیٹھی نئی نویلی دلہن سے بے پرواسپاٹ چہرہ لیے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتا نجانے کن سوچوں میں گم تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا کوئی کزن براجمان تھا اور فرنٹ سیٹ پر دولہا کی ماں۔ وہ بھی جیسے زبان کو چپ کا تالہ لگائے ہوئے بیٹھی تھی مگر اس کا ذہنی تناؤ اس کے تاثرات سے جھلک رہا تھا۔

گاڑی ایک شان دار سی کوٹھی کے سامنے رکی تو سب ہی جیسے اپنے خیالات سے چونک گئے۔ چوکیدار نے گیٹ وا کیا۔ گاڑی پورچ میں چلی آئی۔ سب سے پہلے دولہا گاڑی سے اتر کر ملازمین سے کچھ پوچھتا ہوا تیز قدموں کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا۔ اگلی سیٹوں کے دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اس نے اپنی ساس کی سرد مہری آواز سنی۔

''ثریا! اسے اندر لے آؤ۔''

''اچھا بی بی جی!'' چوکس کھڑی ثریا جلدی سے آگے بڑھی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ادھ موئی حریم کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالا پھر ایک اور ملازمہ کو ساتھ لگا کر اس کا بھاری کام دار لہنگا سنبھالتے ہوئے اسے اندر لے چلی۔ کسی قسم کا کوئی استقبالیہ نہ تھا نہ راستے پر پھولوں کی پتیاں نہ مہمانوں کی رونق..... مگر دلہن بے چاری ابھی ان سب باتوں پر غور کرنے کے قابل ہی کہاں تھی۔ وہ تو شکر ادا کرتی اگر اسے سر درد کی گولی اور لیٹنے کے لیے فوری طور پر ایک عدد بیڈ مہیا کر دیا جاتا۔

مگر اس دنیا کے رسم و رواج..... اسے سیدھا لے جا کر اس کے بیڈ روم میں بٹھا دیا گیا۔ اس کی ساس اور شوہر اس کے بعد دکھائی نہیں دیے تھے۔ یوں جیسے اس ڈرامے میں ان کا اتنا ہی کردار تھا۔

''ایک سر درد کی گولی مل جائے گی؟'' ملازمہ اسے اس کے بیڈ پر بٹھا کر جانے لگی تھی جب اس نے تمام تر شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے آواز دے لی۔

''جی ابھی لائی۔ ایک کپ چائے بھی بنا دوں؟'' ملازمہ خوش دلی سے بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بیڈ کراؤن سے سر ٹکائے وہ چائے اور گولی کا انتظار کر رہی تھی، جب دولہا صاحب کی انٹری ہوگئی۔ گھونگھٹ تو تھا نہیں، وہ اس کی طرف دیکھے بنا بس سنبھل کر سیدھی ہو بیٹھی۔ پلکیں جھکائے، نظریں گود میں جمائے جیسے سزا سنائے جانے کی منتظر ہو۔ وہ شیروانی کے بٹن کھولتا اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ ثریا کہہ رہی تھی، سر میں درد ہو رہا ہے۔'' بات برائے بات تھی۔ مگر اسے لہجہ بہت جانا پہچانا سا لگا (ابا! اللہ کی قسم لے لیں، میں کسی کو نہیں جانتی) اس کا دل لرزا۔ (تو کیا میں اس لب و لہجے سے واقف ہوں؟)

''جی.....'' حریم نے چاہتے ہوئے بھی پلکیں نہیں اٹھائیں۔ وہ سامنے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگا رہا تھا۔

''ہمم..... تم اتنی دیر میں چینج کر لو۔ ثریا چائے لا رہی ہے۔''

سگریٹ کا دھواں منہ اور ناک سے نکالتے اسے اذن رہائی دیا گیا۔ اب کی بار وہ ذرا سا ٹھٹکی مگر فی الحال اس نے کوئی بھی تاثر ظاہر کیے بنا بستر پر سے اتر کر سینڈلز میں پاؤں ڈالے اور خفیف سی پلکیں اٹھا کر اپنے شریک سفر کی طرف اچٹتی نگاہ ڈالی تو وہ سامنے ڈریسنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ڈریسنگ روم ہے۔ تمہارے کپڑے وہیں ہوں گے۔ دیکھ لینا۔''

مگر وہ سن ہی کہاں رہی تھی۔ اس شان دار گھر کی چھت اس کے سر پر گویا آن ہی تو گری تھی۔

نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے ساتھ پڑی تپائی پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہا تھا یعنی وہ اچھی طرح واقف تھا کہ اس کی شادی ''کس'' کے ساتھ ہو رہی ہے۔

حریم چکراتے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں ناکام ہوگئی۔ کچھ تو پہلے بھی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اوپر سے اس شخص کو جیون ساتھی کے روپ میں اپنے سامنے دیکھنا جس نے کبھی اسے ''دولت کی بھوکی'' کہا ہو۔ اس نے اپنی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت ختم ہوتی محسوس کی تھی۔ کمرے میں دستک دے کر داخل ہوتی ملازمہ پھٹی آنکھوں سے نئی نویلی دلہن کو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھا دیکھ رہی تھی۔

''چائے وہاں رکھو اور تم جاؤ۔'' زیاد تحکمانہ بولا تو ثریا جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھتی تیر کی طرح باہر نکلی۔

سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور حریم کے سامنے جا کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

''اٹھو۔ ٹیبلٹ اور چائے آگئی ہے۔''

''دور رہو مجھ سے اور مجھے بتاؤ کہ کیا گیم کھیلنا چاہ رہے ہو تم میرے ساتھ۔'' وہ یک لخت چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر بھیگے ہوئے مگر پرتپش لہجے میں غرائی تھی۔

''شادی کر کے لایا ہوں تمہیں، بھگا کر یا اٹھا کر نہیں۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''مگر کیوں..... کس لیے.....؟ جبکہ تم میرے بارے میں اپنے اعلا خیالات کا اظہار میرے منہ پر ہی کر چکے تھے پھر کیوں میرے گھر والوں کے سامنے میرے کردار پر دھبہ لگایا تم نے۔ ایسا کون سا افیئر چل رہا تھا ہمارا کہ تمہیں یہ سارا ڈرامہ رچانا پڑا۔'' اس کے آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ وہ ذرا تھما پھر بنا کچھ مزید کہے کمرے سے نکل گیا اسے اور رونا آیا۔

یہ شخص اس دنیا کا آخری مرد بھی ہوتا تو وہ اس سے شادی کرنے سے کنواری مرنا بہتر سمجھتی مگر وائے قسمت۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تو ایک بچی اس کے بازوؤں میں تھی۔ اسے کارپٹ پر اتارتے ہوئے وہ ضبط سے بولا۔

''اس کے لیے یہ گیم کھیلی ہے میں نے۔''

حریم نے بے یقینی سے اس بچی کو دیکھا چند سیکنڈز لگے تھے اسے پہچاننے میں۔ وہ بامشکل ہکلاتے ہوئے پوچھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ..... یہ تو.....؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اسے ماں کی ضرورت ہے۔ اور یہ جگہ تم ہی پر کر سکتی تھیں۔'' وہ جیسے کسی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''کیوں..... اس کی اپنی ماں مر گئی ہے کیا؟'' اس نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہتے ہوئے اپنے تئیں بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا لیکن.....

''ہاں۔'' زیاد کے یک لفظی جواب نے اسے سن کر دیا۔ ہاتھ بے اختیار سینے پر رکھتے ہوئے وہ پھٹی آنکھوں میں بے یقینی لیے اسے دیکھنے لگی۔ بچی بہت پرشوق نگاہوں سے دلہن کو دیکھ رہی تھی اور حریم کی بے یقین

کچھ اتنے دنوں کی ٹینشن اور ڈیپریشن، کچھ ذہنی تناؤ..... اور اب موجودہ صورت حال۔ حریم نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ لہرا کر زمین بوس ہوگئی۔

بادل زور سے گرجے تھے۔ کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی بارش کی کن من دیکھتی حریم اپنے ماضی کے گہرے خیالوں سے چونک کر پلٹی، بادلوں کی گرج سے سوئی ہوئی میرب چونک گئی۔ حریم تیزی سے آگر اس پر جھکی۔ اس کے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ہلکے سے تھپکنے لگی۔

''جاگ گئی ہے کیا؟'' زیاد نے تولیے سے گیلے بال رگڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی عادتاً سونے سے پہلے باتھ لے کر آیا تھا۔

''نہیں۔ بادلوں کی گرج سے ڈر گئی تھی۔'' حریم نے مدھم آواز میں کہا اور سیدھی ہوئی۔

''تم بھی ڈرتی ہو بادلوں کی آواز اور بجلی چمکنے سے؟'' وہ آئینے کے سامنے بال برش کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ حریم ہلکے سے مسکرائی۔

''اب تو شاید کسی بھی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ اتنا کچھ فیس کر لیا ہے زندگی میں۔'' اس کی مسکراہٹ میں تاسف کے سب ہی رنگ تھے۔ زیاد نے شدت سے محسوس کیا۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر رہی تھی جب زیاد اس کی طرف آیا۔

''آئم سوری۔ میں نے تمہاری زندگی میں بھی طوفان مچا دیا لیکن یقین کرو، مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ میرب کا کیا کروں۔ مما مایرہ کے حق میں تھیں اور وہ میرب کی ماں بننے کو تیار نہیں تھی۔ تمہارے متعلق مجھے عباد نے آخری دنوں میں تاکید کی تھی کہ صرف تم ہی ہو جو میرو سے اپنی بہن جتنی ہی محبت کر سکتی ہو۔'' وہ آج پہلی بار اسے کھل کر بتا رہا تھا۔ حریم کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''میں تو تمہارا نام بھی نہیں جانتا تھا۔'' زیاد نے ہنس کر ماحول کی اداسی کو بدلنا چاہا۔ ''کجا محبت کے دعوے، مگر بھائی کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے سچی باتوں میں کچھ جھوٹ بھی ملانا پڑا۔ ورنہ تمہارا رشتہ نہ ملتا۔''

''تم ہمیشہ سے مجھے محبت میں ہارے ہوئے انسان لگتے ہو۔'' حریم نے بے ساختہ کہا تو اس کی مسکراہٹ سمٹی۔

''ہاں۔ میری محبت اس دنیا میں کہیں کھو گئی ہے۔ دوبارہ ملی ہی نہیں۔'' قدرے توقف کے بعد زیاد نے کہا اور اسے مختصراً کیتھی کے بارے میں بتایا۔ اس کے اسلام قبول کرنے سے لے کر گمشدگی تک کی مختصر کہانی سنا دی۔ حریم کو افسوس ہوا۔

''آئم سوری۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ بیچ میں کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔'' حریم کو اس کے زخم کریدے جانے کا افسوس ہوا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''جو معاملہ تھا، وہ بھی آدھا ادھورا ہی رہ گیا۔''

''محبت تو بھولنے والی چیز نہیں ہے۔''

''ہاں۔ یہ تو سچ کہا لیکن زندگی جینے کے لیے آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے، ایک جگہ تھم جانا تو موت ہے۔''

''اونہوں۔'' وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی۔ ''اللہ کرے وہ تمہیں مل جائے اور تم اس کے ساتھ خوب جیو۔'' زیاد اس کے حوصلے پہ دنگ ہوا۔

''اور تم.....؟ تمہیں دکھ نہیں ہوگا؟'' تجسس سے پوچھا۔

''میں.....؟ مجھے کس بات کا دکھ؟'' وہ آزردگی سے ہنسی۔ ''نہ میں تمہاری محبت ہوں نہ ضد۔ میں تو میرو کی

ماں بن کر اس گھر میں آئی تھی... اور وہ ہمیشہ ہی رہوں گی تم چاہے کسی کے بھی ساتھ رہو۔"
زیاد چند لمحوں تک ساکت سا اسے دیکھتا رہا پھر نرمی سے اس کے شانوں پہ دونوں ہاتھ جمائے اور جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔
"اور اگر میرو کی طرح میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہوں تو؟"
"تو....." حریم کی سانس سینے میں ہی کہیں اٹک گئی جواب دینے کی کوشش میں اس کے لب کانپے، پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ زیاد نے آہستگی سے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ لچکیلی ڈال کی مانند اس کی طرف کھنچی چلی آئی۔
"میں تمہیں دل و ذہن کی پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرنا چاہتا ہوں حریم!" وہ بے حد ملائمت سے کہتا حریم کے گرد گویا کوئی حصار باندھ رہا تھا۔ اس کی مضبوط بانہوں کی گرفت میں دم سادھے وہ گنگ تھی اور شاید اپنی قسمت کے اس پھیر پر حیران بھی۔

☆☆☆

آسمان پہ سفید بدلیاں ہواؤں کے سنگ آہستہ آہستہ اڑ رہی تھیں۔ نرم اور ٹھنڈی ہوا موسم کے حبس کو اڑا لے گئی تھی۔ ایسے میں حجاب اور گرے رنگ کے عبایا میں ملبوس دو لڑکیاں ترکی کی معروف و مصروف سڑک کے کنارے چلتی دکھائی دیں۔
"آج بہت عرصے کے بعد لگ رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔" ان میں سے ایک لڑکی نے کہا جس کے بال سنہری اور آنکھیں نیلی تھیں۔
"اسلام آزادی ہی کا نام ہے۔" عائشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ شکریہ تمہارا عائشہ! تم نے اپنے اخلاق کی وجہ سے مجھے سب سے پہلے اسلام کی طرف مائل کیا۔" وہ دونوں سڑک کنارے ریسٹورنٹ کی کرسی پہ آ بیٹھیں۔ عائشہ نے دو کریم کافی آرڈر کی تھیں۔
"جن کی روح مسلمان ہو، وہ جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی اللہ کی تعلیمات کو پہچان ہی لیتے ہیں کیتھ..... اوہ سوری..... آمنہ۔" عائشہ نے بات کرتے ہوئے عادتاً اس کا پرانا نام لیا پھر احساس ہوتے ہی معذرت خواہانہ انداز میں تصحیح کی تو وہ کھل کر مسکرا دی۔

☆☆☆

یہ ایک کھلی نکھری سی صبح تھی۔ زیاد کی آنکھ کھلی تو اس نے بے اختیار اپنے پہلو میں نگاہ ڈالی حریم موجود نہیں تھی بلکہ میرب بھی شاید اس کے ساتھ ہی باہر جا چکی تھی وہ انگڑائی لے کر سستی مندی کو بھگاتا اٹھ کر فریش ہونے واش روم میں گھس گیا۔
حریم کمرے میں آئی زیاد کو واش روم میں پا کر جلدی سے بستر کی چادر درست کی اور میرب کے کھلونے سمیٹنے لگی۔ زیاد کا موبائل مسلسل بجے جا رہا تھا حریم نے تکیے کا کور ٹھیک کرتے ہوئے یونہی اچٹتی نگاہ موبائل کی روشن اسکرین پہ ڈالی تو زیاد اور اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑے بالکل ساتھ جڑ کے کھڑی سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی۔ ان دونوں کے ہنستے ہوئے چہرے۔ حریم کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ لیکن اس کے خوف کی وجہ یہ تصویر نہیں بلکہ وہ نام تھا جو آنے والی کال کے اوپر جگمگا رہا تھا۔
"کیتھی کالنگ۔" حریم دم سادھے ایک ٹک موبائل اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اس کے افسانوں کی قائل تھی۔ (متبسم لہجہ، شوخ شرارتی نظریں) اس نے جیب سے کر فائل واپس لے لی۔

''کیونکہ مجھے صرف معیز ہی لکھنا آتا ہے۔'' اس نے شرارت سے جواب دیا۔

''آ، ہاں۔ واقعی امیزنگ۔'' معیز کی آنکھوں میں شرارتی سا سوال تھا۔ وہ خاموشی سے گلاب میں رنگ بھرتی رہی۔ چند ثانیے ٹھہر کر معیز اس سے مخاطب ہوا۔

''تمہاری کہانیاں اس لیے مسترد ہوتی ہیں کیونکہ ہیروئن میں جرأت اظہار نہیں ہے۔ یار! یہ انیس سو ساٹھ کا زمانہ نہیں ہے، جب ہیروئن ہیرو کی بے وفائی یا محبت کا صدمہ دل میں چھپائے روتی دھوتی دنیا سے رخصت ہو جاتی تھی۔ اب ہیروئن کو دلیری دکھانی ہے۔ زیادتی پر آواز بلند کرنی ہے۔'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''اور ہمیشہ المیہ انجام مناسب نہیں، قاری ذہن فریش کرنا چاہتا ہے۔ کوشش کرو، امید دکھاؤ۔'' ماہا چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار تھا، کوئی شبہ نہیں۔

''اور ہاں ہیروئن کو حوصلہ مند دکھاؤ ورنہ مسائل کبھی حل نہیں ہوتے۔'' اس نے سر ہلایا گویا سمجھ گئی ہو۔

یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے کب وقت بیت گیا خبر نہ ہوئی۔ شام کو نیلگوں سائے میں ایک اچھا دن گزار کر گھر واپسی ہوئی تھی۔

اچھے دن کا اختتام کچھ خوش کن نہ تھا۔ ثوبا آپی کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ حنان اور سماویہ گم صم بھائی بیزارای کا زرد چہرہ۔ (اب مزید کوئی صدمہ نہیں دیکھ سکتی) وہ زیر لب کہے جاتیں۔

جلد ہی عقدہ کھلا کہ توصیف بھائی علیحدگی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ نہ ثوبا آپی اپنے موقف سے ہٹیں نہ ان کی ساس نندیں، درمیان میں بچے اور توصیف پس رہے تھے۔ کسی غم گسار نے دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔

پتھر پر بھی پانی لگاتار برسے، سوراخ کر دیتا ہے۔ وہ تو پھر ایک مرد کا دل تھا۔

عورتوں کی چخ چخ سے بے زار بیوی کی الفت کا متمنی۔ ''سعدیہ صحیح کہتی ہے آپ کسی بیٹی کی تربیت نہ کر سکیں۔ ایک تو چلو حکم ربی ہے بیوہ ہو گر پڑی ہے یہ تو ماں کا کسی کے ساتھ گزارا نہیں۔'' (بیزاری سے سر جھٹکا)

باپ کے گھر بیاہی بیٹیاں کسی مسائل کا شکار ہو کر آئیں تو در و دیوار اجنبی بن کر ملتے ہیں۔ اس کا علم آج ثوبا کو ہوا تھا۔

بڑا بھائی باپ نہیں بن سکتا۔ وہ کسی کا شوہر ہوتا ہے۔ کسی کا باپ، توازن کیسے رکھے بھلا۔ پلڑا ایک طرف جھکتا ہے یا بھائی یا شوہر۔ عالی بھائی شاید خود غرض نہ تھے۔ بس تھک گئے تھے۔ ایک جیسے حالات مسائل، عورتوں کی چخ چخ سعدیہ بھابھی کے ظرف کا پیمانہ بس اتنا تھا۔

ماہا کی شادی ہو جاتی ہے۔

ساسیں کب تک زندہ رہتی ہیں بھلا۔ وہ بلا شرکت غیرے گھر کی مالک بنتیں۔

اب دو نندیں، ایک بیوہ اور دوسری (شاید مطلقہ) سوماتھے کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔ گھر میں جھگڑے بھی، برداشت کسی میں نہ تھی، ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے، کوئی سوچتا ہی نہیں۔

☆☆☆

ماہا کو کوئی نہ ملا تو معیز کو ساری صورت حال بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ بتاؤ کے.....

''عالی بھائی کو چاہیے توصیف بھائی سے بات کریں۔ ایک موقع دیں اور ثوبا آپی کو خالہ سمجھائیں کہ بیٹیاں اپنے گھروں میں اچھی لگتی ہیں۔''

''کیا سوچ رہی ہو ماہا۔'' اچانک اسے ماہا کی خاموشی کا احساس ہوا۔

''کچھ نہیں شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

اس نے ہمیشہ کی طرح سر تسلیم خم کیا اور فون بند

محبت ہم آپ کے ہیں

سیمنٹ کی ٹھنڈک کا تاثر دیتی سیڑھیاں ..... جس کی دیوار کے ساتھ بوگن ویلیا کی بیل تھی اور ساتھ جھکے درختوں کی چھاؤں، ہمیشہ اس کی پسندیدہ جگہ رہی تھی۔ وہ چپکے سے، نظر بچا کر وہاں آجاتی، کاغذ قلم

سنبھالے اس کا تخیل کروٹ لے کر بیدار ہو جاتا اور مندی مندی آنکھوں کے ساتھ کہانیاں جاگ اٹھتیں مسکراتی صفحہ قرطاس پر بیٹھ جاتیں ہمیں تحریر کرو۔

اب بھی وہ تخیل کی ہمراہی میں مرغزاروں کا سفر طے کر رہی تھی۔ ہیرو کے سامنے موجود ہیروئن اپنے جذبات کو الفاظ دینے کی کوشش میں تھی۔

''آج تحریر مکمل ہو ہی جائے گی۔'' اس نے ایک لحظہ رک کر سوچا اور خیالات تیزی سے قلم سے نکل کر صفحہ پر بکھر رہے تھے کہ اچانک تند و تیز آوازوں نے اس کے قلم کے تخیل کو حقیقت میں لا پٹخا تھا۔ وہ جھنجھلا کر رہ گئی، تخیل روٹھ گیا اور قلم ضد پکڑ کر رک گیا کسی نادان بچے کی طرح، آنچل، آنکھوں کی لو سب الفاظ گویا تحلیل ہو گئے۔

وہ کوفت زدہ انداز میں مسودہ سنبھال کر سیڑھیاں اتری تو منظر حسب توقع تھا۔ ثوما آپی اور بھابھی ایک دوسرے کو سنا رہی تھیں۔

بچوں سے شروع ہونے والی لڑائی، خاندانی طعنوں میں بدل چکی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ٹیرس پر، ساتھ والوں کی دیوار پر چند سر نظر آئے۔ متجسس، تمسخرانہ نظریں اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''میرے بھائی کے پیسے پر عیش کرنے والی باہر کی عورت۔'' ثوما نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''اپنا گھر ٹوٹا ہے، دوسروں کو بھی آباد نہیں دیکھ سکتی طلاقن۔'' بھابھی بھی سیر کو سوا سیر تھیں۔

''اللہ نہ کرے بھابھی.....'' ماہا تڑپ اٹھی، بہر حال بہن کا درد رکھتی تھی جو سال بھر سے میکے کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔

''ہو جائے گی ان شاء اللہ۔'' بھابھی نے وثوق سے کہا تھا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ ثوما آپی کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

فصیحہ چپ چاپ برتن سمیٹ رہی تھی۔ امی نے افسوس سے منظر دیکھا ثوما آپی روتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ اور جن کی وجہ سے جنگ و جدل کا منظر بنا تھا وہ اراکین شیر و شکر ہوئے بیٹھے تھے۔

ماہا کا جی چاہا وہ ان دونوں کو دو تھپڑ لگائے لیکن مزید فساد کے اندیشے کے باعث اندر چلی گئی۔

یہ کشیدگی اور تناؤ نجانے کب تک رہنا تھا۔ ماہا نے افسردگی سے سوچا۔

☆☆☆

یہ صبغت اللہ مرحوم کا گھرانہ تھا جن کی بیوہ شوہر کی نیک نامی سنبھالے تین بیٹیوں اور بیٹے کے ساتھ مقیم تھیں، ہر بچے کا الگ مزاج تھا۔

عالی بھائی گھر کے سربراہ کہلاتے لیکن بیوی کے سکھاوے اور کانوں کے کچے ہونے کے باعث کمزور شخصیت رکھتے۔

فصیحہ آپی کم عمری میں بیوگی کے باعث محدود اور خاموش زندگی گزار رہی تھیں۔ ثوما مزاج کی تیکھی، سو آئے روز میکے میں موجود ہوتی ماہا گھر کا چھوٹا اور بے ضرر بچہ، پیاری خالہ اور اچھی پھپھو خوابوں کی دنیا میں رہتی۔ لکھاری بننے کا شوق تھا گھر کے ماحول سے بے زار اسکول میں پڑھا کر وقت گزار رہی تھی۔ خاموش طبع حساس.....

☆☆☆

اتوار کی شام کی خاموشی نے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ اپنی من پسند جگہ پر بیٹھ کر رسالہ الٹ پلٹ کرنے لگی۔ جب سماعت مانوس آہٹ سے روشناس ہوئی اور حس شامہ نے مخصوص پرفیوم کو سمیٹ لیا۔

''معیز کی آمد۔'' دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔

''کوئی افسانہ شائع ہوا۔'' معیز نے رسالہ الٹ پلٹ کرتے دیکھا تو پوچھا۔

''نہیں۔'' انداز میں مایوسی اور دلگرفتی تھی۔

''کیوں بھئی..... اتنا اچھا تو لکھتی ہو.....'' وہ نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ معیز اس کے شوق سے واقف تھا۔ سو اس کو مسلسل لکھنے پر اکساتا رہتا۔

"مدیرہ نے ناقابل اشاعت قرار دے دیا ہے۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے اطلاع دی۔

"او..... سوسیڈ۔" معیز نے مسکراہٹ دباتے ہوئے تسلی دی تھی۔ (بیچاری کا مسلسل پانچواں افسانہ مسترد ہوا ہے)

"مجھے اپنے افسانے دو، میں پڑھ کر رائے دوں گا۔" اس نے پاس رکھی فائل اٹھانی چاہی۔

"نہیں..... رہنے دیں۔" ماہا نے عجلت میں فائل پیچھے کرلی۔

"کیوں بھی؟ میں پڑھ کر رائے دوں گا۔ خامیاں بتاؤں گا۔" معیز نے حیرت سے اس کا ردعمل دیکھا تھا۔ وہ کچھ شرمائی، گھبرائی لگ رہی تھی۔

"اوکے جیسے تم مناسب سمجھو....." وہ جیسے سمجھ کر بولا تھا۔

"اچھا آپ پڑھ لیں۔" اس نے اچانک کہا۔

"لیکن آپ مذاق نہ اڑائیے گا پلیز....."

"اوکے..... میں پڑھ کر رائے دوں گا۔" معیز نے تحمل سے وہ پلندہ دیکھا جو اسے اب لازمی پڑھنا تھا۔ (اف یہ مروت) وہ کراہ کر رہ گیا۔

"آپ کا شکریہ۔" ماہا نے چمکتی آنکھوں سے کہا۔

"کس بات کا بھئی۔" معیز نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے جھینپی نظروں سے پلندے کی طرف اشارہ کیا اور ہنس پڑی۔

☆☆☆

امینہ خالہ بیمار تھیں۔

مزاج برہم اور ہمیشہ ایسا ہوتا تھا معمولی بخار پر بھی شور مچاتیں اب بات ہی دوسری تھی۔

ان کی دیورانی اچانک ہارٹ اٹیک کے باعث فوت ہوگئیں جواں موت سب کے لیے صدمے کا باعث تھی۔ اپنے گھر کے ساتھ دیور کا گھرانہ بھی ان کی ذمہ داری بن گیا تھا۔ کام کا بوجھ، نازک مزاجی، نزلہ زکام (موسمی) بیٹی نہ ہونے کا دکھ۔ (یہ ان کا دکھ تھا کہ اللہ لوگوں کو درجنوں کے حساب سے بیٹیاں دیتا ہے اور ان کو بس دو بیٹے ہی دیے۔ وہ بھی نکمے آرام طلب، بیٹی ہوتی تو چائے بنا کر دیتی۔ دکھ سکھ سنتی (سسرالی برائیاں) کھانا گرم کرتی۔

"ماں بیٹی سہیلی ہوتی ہیں۔" وہ ماہا کو اکثر کہتیں۔

اب فون پر ایسا ہی واویلا جاری تھا۔ امی نے گھبرا کر ماہا اور فصیحہ کو روانہ کیا۔

"خالہ کا خیال رکھنا..... چند روز میں، میں بھی چکر لگاؤں گی۔" فصیحہ آپی کے ہاتھوں سے تیار دو تین پکوان چٹنیاں روانہ کیں، ماہا کو بھی اس بنگلے نما گھر میں مزا آتا۔

ہلکا پھلکا کھلا سا ماحول اس کی سب سے دوستی تھی۔ لان میں ٹہلتے ہوئے یوں لگتا جیسے اس کی کہانیوں کے کردار پھولوں، کیاریوں کے پاس منتظر ہیں۔ (آہ ماہا کا تخیل) سو وہ ہمیشہ خوشی خوشی جاتی۔

☆☆☆

خالہ کے ٹی وی لاؤنج میں سب شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب معیز کی بائیک کا مخصوص ہارن بجا۔

"ارے واہ! آج تو بڑے لوگ آئے ہیں۔" ہلکے پھلکے انداز میں خوشی کا اظہار کرتا معیز اندر آیا اور سب کو مشترکہ سلام کیا تاہم نظریں ماہا پر تھیں۔

"بس معیز! آج سوچا خالہ کی خیریت پوچھ لیں، تم سب سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔" فصیحہ آپی نے محبت سے کہا۔

"ارے مجھ سے کہاں ہوتا ہے کام سب کچھ ان بچیوں نے سمیٹا ہے۔" امینہ خالہ کے چہرے پر آسودگی تھی اور خاصی مطمئن لگ رہی تھیں۔ چڑچڑا پن غصہ سب ندارد، ماہا نے گھر کا سب بکھرا واسمیٹ دیا تھا۔ فصیحہ آپی نے تین چار کھانے بنا کر فریج میں رکھ دیے تھے۔

اب فیصل چاچو کے تینوں بچے ماہا کے پاس بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے۔

"بابا! یہ تمہارے ہیرو کا نام معیز کیوں ہوتا ہے۔" وہ ننھی تاشا کو واٹر کلر کرنا سکھا رہی تھی۔ جب ایک دم سوال پر چونک کر سر اٹھایا۔ معیز کے ہاتھ میں

اس کے افسانوں کی قائل تھی۔ (تبسم لہجہ، شوخ شرارتی نظریں) اس نے جھینپ کر فائل واپس لے لی۔

"کیونکہ مجھے صرف معیز ہی لکھنا آتا ہے۔" اس نے شرارت سے جواب دیا۔

"آ، ہاں۔ واقعی امیزنگ۔" معیز کی آنکھوں میں شرارتی سا سوال تھا۔ وہ خاموشی سے گلاب میں رنگ بھرتی رہی۔ چند ثانیے ٹھہر کر معیز اس سے مخاطب ہوا۔

"تمہاری کہانیاں اس لیے مسترد ہوتی ہیں کیونکہ ہیروئن میں جرأت اظہار نہیں ہے۔ یار! یہ انیس سو ساٹھ کا زمانہ نہیں ہے، جب ہیروئن ہیرو کی بے وفائی یا محبت کا صدمہ دل میں چھپائے رونی دھوتی دنیا سے رخصت ہو جاتی تھی۔ اب ہیروئن کو دلیری دکھانی ہے۔ زیادتی پر آواز بلند کرنی ہے۔" اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اور ہمیشہ المیہ انجام مناسب نہیں، قاری ذہن فریش کرنا چاہتا ہے۔ کوشش کرو، امید دکھاؤ۔" ماہا چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار تھا، کوئی شبہ نہیں۔

"اور ہاں ہیروئن کو حوصلہ مند دکھاؤ ورنہ مسائل کبھی حل نہیں ہوتے۔" اس نے سر ہلایا گویا سمجھ گئی ہو۔

یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے کب وقت بیت گیا خبر نہ ہوئی۔ شام کو نیلگوں سائے میں ایک اچھا دن گزار کر گھر واپسی ہوئی تھی۔

اچھے دن کا اختتام کچھ خوش کن نہ تھا۔ ثوما آپی کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ حنان اور سماویہ گم صم بھائی بیزار امی کا زرد چہرہ۔ (اب مزید کوئی صدمہ نہیں دیکھ سکتی) وہ زیر لب کہے جاتیں۔

جلد ہی عقدہ کھلا کہ توصیف بھائی علیحدگی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ نہ ثوما آپی اپنے موقف سے ہٹیں نہ ان کی ساس نندیں، درمیان میں بچے اور توصیف پس رہے تھے۔ کسی غم گسار نے دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔

پتھر پر بھی پانی لگاتار برسے، سوراخ کر دیتا ہے۔ وہ تو پھر ایک مرد کا دل تھا۔

عورتوں کی چخ چخ سے بے زار بیوی کی الفت کا متمنی۔ "سعدیہ چچی کہتی ہے آپ کسی بچی کی تربیت نہ کر سکیں۔ ایک تو چلو حکم ربی سے بیوہ ہو کر پڑی ہے یہ ثوما اس کا کسی کے ساتھ گزارا نہیں۔" (بیزاری سے سر جھٹکا)

باپ کے گھر بیاہی بیٹیاں کسی مسائل کا شکار ہو کر آئیں تو در و دیوار اجنبی بن کر ملتے ہیں۔ اس کا علم آج ثوما کو ہوا تھا۔

بڑا بھائی باپ نہیں بن سکتا۔ وہ کسی کا شوہر ہوتا ہے۔ کسی کا باپ، توازن کیسے رکھے بھلا۔ پلڑا ایک طرف جھکتا ہے یا بھائی یا شوہر۔ عالی بھائی شاید خود غرض نہ تھے۔ بس تھک گئے تھے۔ ایک جیسے حالات مسائل، عورتوں کی چخ چخ سعدیہ بھابھی کے ظرف کا پیمانہ بس اتنا تھا۔

ماہا کی شادی ہو جاتی ہے۔

ساسیں کب تک زندہ رہتی ہیں بھلا۔ وہ بلا شرکت غیرے گھر کی مالک بنتیں۔

اب دو نندیں، ایک بیوہ اور دوسری (شاید مطلقہ) سوما تھے کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔ گھر میں جھگڑے بھی، برداشت کسی میں نہ تھی، ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے، کوئی سوچتا ہی نہیں۔

☆☆☆

ماہا کو کوئی نہ ملا تو معیز کو ساری صورت حال بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ بنا ٹوکے.....

"عالی بھائی کو چاہیے توصیف بھائی سے بات کریں۔ ایک موقع دیں اور ثوما آپی کو خالہ سمجھائیں کہ بیٹیاں اپنے گھروں میں اچھی لگتی ہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو ماہا۔" اچانک اسے ماہا کی خاموشی کا احساس ہوا۔

"کچھ نہیں شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح سر تسلیم خم کیا اور فون بند

کرنے کے لیے پر سمرتھ کرتا ہیں کوشش کریں۔

☆☆☆

معیز خوابوں کے شہزادوں جیسا تھا۔ محبت کرنے والا، ساتھ دینے والا اس نے ہمیشہ ماہا کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ پڑھنے میں۔ لکھاری بننے میں۔

ماہا اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی، لیکن اس کے سامنے زبان چپ ہو جاتی۔ یہ معیز سے محبت تھی جس نے اسے شاعرہ بنا دیا تھا وہ مانوس اجنبی نامعلوم شخص کے نام اپنی غزلیں نظمیں لکھتی تھی، لیکن اس کے جذبات اس کی ڈائری تک محدود تھے۔ اب افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کر رہی تھی۔ لیکن کامیابی کچھ خاص نہ تھی۔ معیز کی سالگرہ آ رہی تھی لیکن وہ کیسے کہے کہ معیز ہی اس کا آئیڈیل ہے وہ اس کی ڈی پی کو دیکھ کر سوچتی۔

"کیا میری محبت کی تپش آپ تک پہنچتی ہے؟"

معیز کی تصویر ساکت تھی۔ کمرے کی خاموشی میں اس کی خود کلامی ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

☆☆☆

مسلسل کوشش کے بعد ماہا کا افسانہ شائع ہو ہی گیا۔ یہ ایسی کامیابی تھی جو وہ سب سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آئس کریم منگوائی۔ فصیحہ آپی نے اپنی خوشی کا اظہار چکن رولز اور سموسے بنا کر کیا۔

اب سٹنگ روم میں بیٹھ کر سب یہ لمحے یادگار بنا رہے تھے۔ ثوبا آپی با آواز بلند اس کا افسانہ پڑھ کر امی کو سنا رہی تھیں۔

"خواب نگر" نام تو بڑا آرٹسٹک ہے چھوٹی....."

ثوبا آپی نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں بھئی ہیروئن بڑی جی دار ہے۔" معیز نے ٹکڑا جوڑا۔ وہ خالہ کے ساتھ ماہا کی کامیابی کو یادگار بنانے آیا تھا۔

ماہا شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ تبصرے سن رہی تھی۔ ماحول خوش گوار تھا۔ بھائی نے پیسے دیے۔ بھابھی کی خاموش موجودگی ہی بھلی تھی۔

سب کی تعریف نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

قدم باہر رکھتیں لیکن لکھاری کی گھریلو مصروفیت کے باعث قدم پیچھے کر لیتیں۔ کچھ دنوں سے گھر میں خاموشی تھی۔ عالی بھائی کے رویے میں کھنچاؤ آ رہا تھا۔

"امی! اس چڑیل کا سکھاوا ہے۔" ثوبا وثوق سے کہتی۔

"اور جادو بھی ہے....." اب تو امی کو بھی یقین ہونے لگا تھا۔ بھائی امی کو سرسری سلام کر کے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک دو بار حنان کو ڈانٹ دیا تھا وہ پنکی سے ریموٹ چھین رہا تھا۔ ثوبا آپی نے بات کرنا چاہی تو سنی ان سنی کر کے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ماہا نے کہنا چاہا۔ "آپ کا رویہ طنزیہ جملے گھر کی فضا کشیدہ کر رہے ہیں۔"

لیکن آپی تو بھڑوں کا چھتہ بن چکی تھیں۔ روز روز کی کل کل نے گھر کے معاملات کو تماشا بنا دیا تھا۔

آخر لاوا پھٹ ہی گیا۔

بات بچوں کی لڑائی پر شروع ہوئی تھی۔ سماویہ نے پنکی کی گڑیا توڑ دی۔ ارسل نے حنان کو دھکا دیا۔ ثوبا نے زور سے تھپڑ مارا۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کیونکہ اب بھائی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا وجہ صرف بھابھی کا سکھاوا نہیں تھا بلکہ روز روز کی کل کل، ذمہ داریوں کا بوجھ فرائض کی ادائیگی میں ناکامی، لوگوں کے تبصرے۔

"تنگ آ گیا ہوں میں، یہ تربیت ہے آپ کی امی۔ کسی بیٹی کا گھر آباد نہیں ہوتا۔ فلاحی ادارہ کھولا ہے کیا۔ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر پاتا۔" امی سفید چہرے کے ساتھ کھڑی تھیں۔

"یہ شخص کون تھا ان کا بیٹا یا کوئی غیر مرد۔" وہ تیورا کر گر پڑیں۔

اس جھگڑے کا خاتمہ امی کے ہارٹ اٹیک پر ہوا تھا۔ فصیحہ آپی اور ماہا رو رہی تھیں۔ ثوبا شرم سار کم صم (آہ! یہ زبان کے کرشمے) بھائی، بھاگ دوڑ میں مصروف۔ ماہا نے امینہ خالہ کو رو رو کر بتایا۔

"عالی کو سربراہ بنانہیں آیا ثوما بھی قصور وار ہے۔ بیاہی بیٹیاں دل مار کر رشتے نبھاتی ہیں۔" امینہ خالہ افسوس سے سر ہلا رہی تھیں۔ بھابھی غیر معینہ مدت کے لیے میکے جا چکی تھیں۔ یہ ان کا معمول تھا اور اب ہر شخص خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

چند روز کے بعد امی کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ لیکن گھر کے در و دیوار میں ناراضی اتر آئی تھی۔ ہر شخص دوسرے سے لاتعلق بے نیاز، بھائی چپ چاپ تھے امی کے پاس آئے اور ہاتھ چومنے لگے، امی نے بھی معاف کر دیا تھا (ماؤں کے معصوم دل)۔

گھر کے ماحول سے گھبرا کر ماہا خالہ سے ملنے چلی آئی۔ وہاں جا کر دل مزید مکدر ہو گیا۔ بکھرا گھر، ادھورے کام، گلے شکوے امینہ خالہ تھوڑی سی خود غرض ہیں بلکہ کافی زیادہ۔" ماہا نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا۔

"ارے ننھیال والے بھی تو ہیں ناں، اپنا گھر دیکھوں یا دیور کا، ماں مری ہے باقی رشتے تو ہیں ناں۔"

ذمہ داریاں اتنی نہ تھیں پیسے کی بھی کمی نہ تھی بس ظرف میں تنگی تھی۔ سو ہر بات بڑھا چڑھا کر کہہ رہی تھیں۔

"بچوں کے ماموں یو کے میں سیٹ تھے خالائیں دوسرے شہر۔" ماہا نے یاد دلانا چاہا لیکن بے سود آخر خاموش سامع بن کر بیٹھ گئی۔

"ثوما کا کیا بنا...؟" خالہ کے حواس بحال ہوئے تو پوچھا۔

اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"غلطی ثوما کی ہے۔ کنواریوں کو رشتے نہیں مل رہے۔ مطلقہ کو کہاں ملے گا اور فصیحہ بے چاری تو....."

خالہ نے افسوس سے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ماہا خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ تینوں بچے چچا کے پاس بیٹھے تھے۔ شاید اسکول کا کوئی قصہ کسی دوست کی شکایت۔ تاشا منہ بسور رہی تھی۔

کتنے ادھورے لگ رہے تھے ناں یہ سب اور اداس بھی ماہا نے سوچا۔ سامنے کا منظر شام کے ملگجے سائے کا حصہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

دو افسانوں کی اشاعت نے اس کا اعتماد خاصا بڑھا دیا تھا۔

"اپنے کرداروں کا خود انٹرویو کرو۔ ان کی خوبیاں خامیاں پھر وہ کہانی صفحہ قرطاس پر تحریر کرو۔"

اس نے کہیں پڑھا تھا سو اب ناول پر طبع آزمائی کر رہی تھی۔

"میں سوچتی ہوں ایک بار توصیف سے بات کر لیتے ہیں۔" امی آہستہ آہستہ بھائی سے کہہ رہی تھیں۔

"ہم لڑکی والے ہیں جھک جانے میں ہرج ہے کیا۔"

"جب سعدیہ کہتی تھی تب تو آپ کا طنطنہ آسمان پر تھا، اونہہ۔" وہ بے زار تھے۔

بھائی بدل گئے ہیں۔ ماہا نے دکھ سے سوچا۔

"بات بگڑنے سے پہلے اگر ایک کوشش کر لیں بچے تو ہیں ناں۔" ماہا نے چائے کا کپ بھائی کے سامنے رکھا۔ اور امی کو مخاطب کیا۔

"امی! آپ موبائل پر بات کر لیں ناں پہلے۔"

بھائی پر سوچ نظروں سے دونوں کو دیکھتے رہے۔

"میں اور امی خود تو صیف سے ملنے جائیں گے کل، چھوٹی تم دعا کرنا۔" ماہا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"کتنے عرصے بعد چھوٹی کہا ہے بھائی نے۔"

☆☆☆

اس کا قلم اپنے ناول کے پلاٹ پر کام کر رہا تھا۔ میرے ناول میں کسی کے ساتھ برا نہیں ہوگا اور نہ موت ہوگی۔

وہ اس کی جزئیات پر توجہ دے رہی تھی۔ ہیروئن کو دلیر ہونا چاہیے۔

بھائی اپنی مصروفیت میں بھول گئے کہ توصیف

''ماہا! تم خود نمبر ملاؤ.....'' امی نے اسے کہا۔ توصیف بھائی کال اینڈ نہیں کر رہے تھے۔ ماہا کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ امی کا چہرہ آس و نراس لیے منتظر تھا۔

ایک دو پانچ آخر چھٹی بیل پر فون سن لیا گیا۔ امی کی ساری شکایتیں۔ گلے طنطنہ پانی میں بہہ گئے تھے۔ جس بیٹے کی تابعداری پر بھروسہ تھا وہ ٹوٹ گیا تھا سو عاجزی خود بخود در آئی تھی۔

توصیف بھائی نے روکھے لہجے میں بات کی۔

''آپ دکان پر آجائیں.....'' امی نے اسے بھی غنیمت سمجھا، اگلے روز دونوں رازداری نبھاتے ہوئے کپڑے خریدنے کے بہانے گھر سے نکلیں، دن کا وقت تھا دکان پر رش نہیں تھا۔ توصیف بھائی کچھ ناراض، بے زار، اکتائے ہوئے لگے۔ امی کا مایوس چہرہ دیکھا تو سخت بات کہنے سے خود کو روکا۔ ماہا مکمل نظرانداز تھی۔

''آپ آپی کو ایک موقع دیں۔ امید ہے مایوس نہیں ہوں گے۔ بچے آپ کو یاد کرتے ہیں۔ سماویہ تو روتی ہے۔'' ماہا کو لگا درست ٹائم پر بولنا ہی ضروری ہے۔ سو لہجہ کو با اعتماد بنا کر بولی۔

توصیف بھائی نے چونک کر اسے دیکھا جیسے اس کی موجودگی سے اب تک بے خبر ہوں۔

بچوں کے ذکر پر ہلکی سی مسکراہٹ چھب دکھلا کر غائب ہوگئی۔ امی نے دوسری شادی کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ ہاں جب دونوں نے رخصت طلب کی تو توصیف بھائی نے کھڑے ہو کر رخصت کیا۔

''بیٹا! میں تمہارا انتظار کروں پھر.....'' (امی کا ٹوٹا لہجہ) توصیف بھائی نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

گرم سہ پہر ڈھلتی شام میں بدل گئی تھی دونوں کے اٹھتے قدم مطمئن تھے۔ ماہا کو امی پر بے حد پیار آیا۔ اگر امی ہمت نہ کرتیں؟ اگر میں زبان نہ کھولتی؟ واپسی کا سفر آسان تھا۔

پانچ دن گزر گئے۔ توصیف بھائی نہ آئے۔ امی مایوس تھیں۔ ثوما کو پاس بٹھا کر سمجھاتیں۔ ''دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔ اپنے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی۔''

ثوما آپی آنسو پی کر سر ہلائے جاتیں۔ جنہیں کوئی نہ سکھا سکے انہیں وقت کی ٹھوکریں سکھاتی ہیں۔

اپنے والدین کے گھر میں اجنبی بن کر رہنا احسان مند ہو کر..... ثوما کو اب سمجھ میں آیا تھا۔

واپسی کا سرا ڈھونڈتی رہتیں۔ سارا طنطنہ غائب تھا۔ آخر جمعے کے دن توصیف بھائی آ گئے۔ اپنی والدہ کے ساتھ، امی کی بیماری اور بڑھاپے پر ترس آ گیا تھا۔ یا بچوں کی یاد نے دل بدل ڈالا تھا۔ یا پھر ماہا کی بات مان لی تھی۔

جو کچھ بھی تھا یہ بات سب کے حق میں مثبت رہی تھی۔ پچھلی کسی بات کا تذکرہ نہ ہوا تھا۔ ایک گھنٹہ بیٹھ کر اٹھنے لگے تو کہا۔

''چلو ثوما۔''

اور ثوما یں تیاری پکڑ کر روانہ ہوئیں جیسے ایک آدھ دن کے لیے آئی تھیں۔ اب گھر جا رہی ہیں۔ ازدواجی زندگی یونہی ہوتی ہے۔ بنتے بنتے بکھر جاتی ہے اور ٹوٹتے ٹوٹتے سمٹ جاتی ہے۔

☆☆☆

''تم جب سے امینہ کے گھر سے آئی ہو بہت خاموش ہو، کیا ہوا ہے۔'' امی کئی دن سے اسے الجھا الجھا دیکھ رہی تھیں۔

''ہم.....'' اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور نظریں اپنے ناخنوں پر جما دیں۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ الجھن کو خاموش رہ کر سلجھن میں بدلتی۔

''خالہ نے کچھ کہا ہے۔''

''وہ تو خود پریشان ہیں فری چچی کے انتقال کے بعد سارا گھر ان کے سر پر ہے، بس کچھ چڑچڑی ہوگئی ہیں۔'' معیز اور سمیر کی دیکھا دیکھی وہ بھی چچی کہتی۔

عمر ہے اس کی، بچے سنبھالے، گھر سنبھالے۔'' امی بہن کے دکھ میں کھو گئیں۔

ماہا خاموشی سے فصیحہ آپی کو کچن میں ہنڈیا بھونتے ـــــ دیکھ رہی تھی۔ بار بار چہرے سے پسینہ صاف کرتی مسالے کے ڈبے اپنی جگہ پر سیٹ کرتی مسالہ چکھتی ایک کی فرمائش دوسرے کا حکم.....

وہ کتنی تھکی ہوئی مایوس لگ رہی تھیں اور اداس بھی۔

کتنے برسوں سے ان کی یہی روٹین تھی ماہا کو یہ احساس اب ہو رہا تھا۔

رات کو وہ اپنے ادھورے افسانے دیکھنے لگی۔

''یار! تمہاری ہیروئین گھٹ گھٹ کر رہتی ہے اسے زبان دو۔'' معیز اس کے افسانے پڑھ کر رائے دیتا۔

''امی! کیا فصیحہ آپی کی شادی امینہ خالہ کے دیور سے نہیں ہو سکتی.....'' اس نے پہلے تو فصیحہ آپی کے سو جانے کا یقین کیا پھر آہستہ سے کہا۔

''وہ پکی عمر کا میری نازک سی فصیحہ کے لیے رہ گیا ہے۔'' امی کی آواز غصے سے بلند ہو گئی۔ وہ بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''ارے پرائے بچے پالے۔'' امی نے تڑپ کر کہا۔

ماہا چند لمحے ان کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔

''ادھر بھی تو یہی کام کر رہی ہیں۔''

امی چپ چاپ اس کا چہرہ تکنے لگیں۔ آنکھوں میں پانی چمکا اور چہرے پر ملال اتر آیا۔ جیسے حقیقت عیاں ہو گئی ہو۔

''آپی خوب صورت ہیں۔ جوان ہیں لیکن بیوہ ہیں۔ کتنے برس سے.....'' اس نے ماہ و سال انگلیوں پر گننے کی کوشش کی۔ ماں کے چہرے پر وہ عرصہ دکھ بن کر نمایاں ہو گیا تھا۔

''آپ پھر سوچ لیں امی، بہر حال فیصلے کا حق

مکمل کرنے لگی۔ آج اس کی ہیروئین کو اظہار کی طاقت مل گئی تھی۔

اس نے قلم تھاما اور الفاظ لڑی کی مانند پرونے لگی۔ کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔

لیکن کھڑکی کے پاس لیٹا وجود اپنے آنسو تکیے میں چھپا رہا تھا۔ یہ تکیے، کمبل بھی کتنے راز سموئے ہوتے ہیں ناں۔

☆☆☆

فصیحہ پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ سو خوب لاڈ پیار سمیٹے۔ لیکن اس لاڈ پیار نے بگاڑ پیدا نہ کیا تھا۔ پڑھائی سے زیادہ کھانے پکانے کا شوق تھا، کچھ شوق کچھ ماں کی تربیت سو سارے خاندان میں دھوم تھی۔ سلمان بچپن کی محبت تھی اور دونوں کی محبت میں بڑوں کی رضا شامل ہو گئی دعا بن کر۔

پانچ برس بعد حادثے میں سلمان فوت ہو گیا۔ بچہ تھا نہیں سسرال میں کون تھا بھلا؟ چچا چچی تو بیٹے کے دکھ میں کچھ عرصے بعد چل بسے تھے۔

خوب رو..... خوش اطوار فصیحہ بیوگی کی اوڑھنی لپیٹے والدین کی دہلیز پر واپس آ گئی تھی بھائی، بھابھی سب نے اسے سمیٹ لیا۔

فصیحہ نے کچن تک خود کو محدود کر دیا اور پھر وہیں کی ہو رہی۔ بھابھی نے بھی شکر کیا۔ کم گو بے ضرر نند اس کے لیے کبھی مسئلہ نہ بنی تھی۔ کم عمری، خوب صورتی دیکھ کر رشتے آئے، کچھ اپنی جذباتیت، کچھ سلمان کی محبت، سوا انکار پر ڈٹی رہی۔

کتنے ماہ و سال بیتے تھے۔ یاد نہیں۔

اس نے انگلیوں پر شمار کرنا چاہا ناکام ہو کر آنکھیں موند لیں، کھڑکی کے پار تاروں سے سجا آسمان اندر جھانک کر اس کے آنسو دیکھنے لگا۔ افسوس بھری نظروں سے فصیحہ نے کروٹ بدلی۔

اب جو بھائی بھابھی کے تیور دیکھے۔ بہنوں کے حالات دیکھے تو پہلی بار سوچ نے سر اٹھایا تھا۔

''شاید عورت شوہر کے گھر سے معتبر ہوتی ہے۔

دل پر جو کسی گزرے بھرم کو قائم رہتا ہے ناں۔

ماہا سب سے چھوٹی تھی۔ سو اولاد کی طرح عزیز۔ معصوم سے شوق تھے اس کے، معیز کے بعد وہ ہی تھیں جو اس کے لکھنے کے شوق کی حوصلہ افزائی کرتیں۔" اب اس چھوٹی نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ سلمان کی جگہ کوئی لے سکتا ہے بھلا؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ اور خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان کے فیصلے ان کے تابع ہو جاتے ہیں گھر کے ماحول میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ رویے سوچ رشتے سب بدل رہے تھے۔

عالی بھائی گھر خرید رہے تھے (اڑتی اڑتی خبر تھی) اچھی بات یہ تھی کہ ثوما آپی کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا تھا۔ وہی باتیں، ماحول بس ان کی اپنی سوچ بدل گئی تھی۔

امی کے دل کو یک گونہ سکون ہوا تھا۔ ان ہی دنوں خالہ اپنے دیور کے لیے آئیں۔

کافی بھاری بھرکم مضمون تیار کیا تھا۔ لیکن تمہید کی ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ امی ہاتھ پکڑ کر پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔ شاید کسی اپنے کو دیکھ کر دل کی الجھنیں غم یاسیت آنسوؤں میں بہہ جاتی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل فصیحہ آپی کے لیے ایسا رشتہ ناقابل قبول ہوتا لیکن وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے۔ سوچ بھی اور نظر بھی سو بہت سی گرہیں کھل رہی تھیں اور آسانیاں نظر آنے لگیں۔ خالہ نے امی سے مثبت جواب لیا اور عالی بھائی کو پاس بٹھا کر حالات رکھے۔ وہ کچھ لاتعلق سے نظر آئے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" والا بے زار رویہ خالہ نے غور سے عالی بھائی کا چہرہ دیکھا اور سر ہلا کر ماہا اور فصیحہ آپی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ آپا کا رونا اب سمجھ میں آیا تھا۔

☆☆☆

گھر میں شادی کا خوش گوار سا ہنگامہ جاگ اٹھا تھا۔

"کتنے عرصے بعد یہ گھر ہنسی سے آشنا ہوا ہے۔" ماہا پھولوں کی پلیٹیں سیٹ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ بچہ پارٹی کو ساتھ ملا کر ڈھولکی پر گیت گائے جاتے۔ ہلکی پھلکی لائٹنگ کا بھی انتظام تھا۔

خالہ نے پوری کوشش کی تھی بہن پر بوجھ نہ پڑے اور بھرم بھی قائم رہے۔

فصیحہ کے لیے فیصلہ دشوار تھا۔ دل کرب میں تھا۔ سلمان کی یادیں دل کے ایک اداس گوشے میں دفن کر دی تھیں اور ان کو تالا لگا کر چابی جانتے بوجھتے کہیں گم کر دی تھی۔

"دل کو سمجھانا دشوار ہے لیکن ناممکن نہیں اپنے پیارے رشتوں کی آنکھوں میں سکون اور خوشی دیکھنے کے لیے تو چلو یونہی سہی۔"

ایک خاموش آنسو نکل کر آنچل میں گم ہو گیا۔

ماہا مہارت کے ساتھ ان کی کوری ہتھیلیوں پر اپنا ہنر آزما رہی تھی۔

"آپ کو فیصل بھائی خوش رکھیں گے۔" اس نے پیار سے بہن کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر الوہی چمک تھی۔ اور انوکھا روپ چھب دکھلا رہا تھا۔

"دلہن ماما یہاں ہیں۔" تاشا نے کمرے میں جھانکا تھا۔ سرخ غرارے اور سنہری بندیا میں ننھی پری۔ فصیحہ نے پیار سے بلا کر اس کی پیشانی چومی۔

"بچے سب سے پہلے پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔ تم پیار کرو گی وہ پیار دیں گے۔ ترش رویہ رکھو گی تو دور ہو جائیں گے۔" خالہ آپی کو سمجھا رہی تھیں۔

"آپی کا دوسرا نام محبت ہے۔" ماہا نے جھٹ کہا۔

"ہاں بھئی تم تو کہو گی، مس رائٹر۔" خالہ نے ہنس کر کہا۔

ثوما آپی اپنی فیملی کے ساتھ آئیں۔ بھابھی پرجوش ہو کر ملیں۔ ماہا نے دیکھا آپی کی آنکھوں میں صبر تھا اور شخصیت میں ٹھہراؤ شاید وقت سب سکھا دیتا ہے۔ گھر کی چہل پہل میں خوش گوار سا تاثر تھا۔ عالی بھائی بہت مطمئن تھے۔

دھارے پر چھوڑ کر دعا گو تھیں۔

''دیکھو خوش گوار انجام ہے تمہاری آپی کی اسٹوری کا.....'' معیز نے مذاقاً کہا، ماہا نے سر ہلایا۔ وہ اپنے آنسو پی رہی تھی کچھ بھی تھا اسے آپی سے محبت تھی۔ کتنا عرصہ وہ ان سے لپٹ کر سوتی تھی۔

''تم رو کیوں رہی ہو۔'' معیز نے حیرت سے پوچھا۔

''افسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری شادی تو کیا منگنی بھی نہیں ہوئی۔'' معیز نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ اس نے خفگی سے دیکھا، سبز غرارہ سوٹ میں ماہا سب سے نمایاں لگ رہی تھی۔ رونے کے باعث آنکھیں گلابی اور پلکیں گیلی۔

''کچھ آنسو اپنی رخصتی کے لیے رکھ دو۔''

اس نے ماہا کو مخاطب کیا۔ اس نے ناراض نظروں سے معیز کو دیکھا جس کی آنکھوں میں بہت سے رنگ تھے اور یہ پل فوٹو گرافر نے محفوظ کرلیا۔

☆☆☆

دھوپ کی کرنیں پتوں سے نکل کر سیڑھیوں پر آرہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی پسندیدہ جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ کرنیں سمٹ کر اس کے قدموں کو چھونے لگیں۔

خاموشی کو ہم راز بنا کر ہمیشہ کی طرح وہ سوچوں میں گم تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب قدرت کسی بات کا ارادہ کرتی ہے ناں تو ایسے اسباب مہیا کرتی ہے جو بعید از عقل ہیں۔

اچانک لڑائی جھگڑا، بھائی کی چیخ و پکار، امی کی بیماری شاید فصیحہ آپی کے عقد ثانی کے اسباب بن رہے تھے۔

تو ماآپی میں تبدیلی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت بہت سے لوگوں کے چہرے بے نقاب بھی کر دیتا ہے۔

اس نے بھائی بھابھی کے ہنستے مسکراتے چہرے پر نظر ڈالی اور آنسو پونچھ ڈالے۔ بچے سکون سے کھیل رہے تھے۔

''چلو یہی بہتر تھا۔ شاید اسی طرح ہر شے نے سوچوں کا سفر جاری تھا یہاں تک کہ آسمان نیلگوں سے سیاہ لبادہ اوڑھ بیٹھا۔

''ماہا۔'' امی کی آواز اسے خیالوں سے باہر کھینچ لائی۔

☆☆☆

فصیحہ آپی اکثر آتیں کبھی تاشا کی انگلی تھامے، کبھی ڈولی اور ارمان بھی ساتھ ہوتے۔ بچے مانوس لگتے تھے۔ امی غور سے فصیحہ کا چہرہ پڑھتیں۔

''تم خوش ہو ناں، فیصل کیسا ہے تمہارے ساتھ۔'' امی تسلی چاہتی تھیں۔

''شکر ہے امی..... وہ ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔'' وہ آسودگی سے مسکراتیں۔

''بس وہ ماضی سے نہیں نکل پا رہے امید ہے آپ کی دعا سے مزید حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اور امی دعائیں کرتیں۔

''اچھی عادات صبر ضرور رنگ لاتا ہے۔'' ماہا کو یقین تھا۔

☆☆☆

بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ بچوں کا جوش دیدنی تھا۔ خالہ نے اپنے گھر کے لان میں باربی کیو کا اہتمام کیا تھا۔ سب خوشی خوشی شریک تھے۔

''فصیحہ آپی نے کتنے برس بعد چمک دار کپڑے پہنے ہیں اور چہرے پر کتنے رنگ سجے ہیں۔'' ماہا نے خوشی سے امی کو مخاطب کیا تھا۔

''اولاد مطمئن ہو ناں تو والدین کے دل بھی ٹھنڈک پاتے ہیں۔'' امینہ خالہ نے اس کی بات پر تبصرہ کیا۔

سب مل کر ہلا گلا کر رہے تھے۔ بچے لان میں دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ لڑکے مل کر باربی کیو میں مصروف تھے اور مرد حضرات آج سیاست پر تبصرہ کر رہے تھے۔

ماہا بوریت محسوس کرنے لگی تو لان میں چہل قدمی کرنے لگی۔ بارش میں مٹی کی باس، باربی کیو میں کوئلے کی مہک اسے ہمیشہ سے پسند تھیں، وہ لان چیئر پر بیٹھ گئی۔

کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

سفید لان کے سوٹ پر پیازی کڑھائی تھی۔ ماہا ہمیشہ اپنی میچنگ کا خیال رکھتی تھی۔

آج بھی ہر شے وائٹ پسند کی تھی۔ نیچرل میک اپ کے ساتھ وہ سب سے نمایاں لگ رہی تھی۔ اپنی تعریف پر وہ جھینپ گئی۔

''خالہ! معیز کے لیے تمہارا رشتہ چاہتی ہیں۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی رائے ضرور دو۔ میں نہیں چاہتی ہماری پیاری بہن محض سمجھوتے کی زندگی گزارے.....'' فصیحہ آپی اس کا چہرہ پڑھ رہی تھیں۔ جس پر مختلف رنگ سجے تھے۔

''معیز بھائی کیا کہتے ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''وہ خالہ کی مرضی پر راضی ہیں۔''

''یعنی میری کوئی اہمیت نہیں۔'' اس نے دل گرفتی سے سوچا۔

''جو آپ سب کی رائے ہو آپی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اسی وقت کھانے کا شور مچا اور سب چھوٹے بڑے بلا گلا مچاتے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ماہا اداس تھی۔ گھر آ کر ماہا نے لباس تبدیل کیا سب کو چائے بنا کر دی۔ سب ایک خوشگوار احساس میں گھرے تھے۔

امی بھائی کو معیز کے رشتے کے متعلق بتا رہی تھیں۔ ماہا نے کھڑکی سے سب کے خوش چہرے دیکھے شاید افسانوی دنیا اور حقیقت میں فرق ہے۔ یہ ہی زندگی ہے۔

''کیا تمہاری ہیروئین نے اپنے جذبات کا اظہار سیکھ لیا ہے۔'' رات کو وہ اپنے ناول کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی جب میسج کی آواز نے تسلسل توڑ دیا۔

''ہاں۔'' اس نے یک لفظی جواب دیا۔

''کیا وہ ہیرو کو کہہ سکتی ہے کہ اب رشتہ لینے آجاؤ۔'' ساتھ دو مسکراتے ایموجیز تھے۔

''نہیں۔'' اس نے غصے والے ری ایکٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''اس لیے کیونکہ ہیروئین اب بھی ہیرو سے شرماتی ہے۔'' اب کی بار شرمیلا ایموجی تھا۔ منہ چھپا کر ہنستا ہوا۔ اس کا ناول ادھورا تھا۔ ہیروئین کو ہیرو کے اظہار کا انتظار تھا۔ اور وہ کوئی صورت حال سوچ رہی تھی۔ معیز کے فون اور پیغامات نے تسلسل توڑ دیا تھا۔ سو کاغذ قلم ایک طرف رکھ کر اس نے کال اینڈ کر لی۔

''ماہا! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ سچی اور ساتھ نبھانے والی کل امی، ابو سب آرہے ہیں۔''

اس نے یوں اطلاع دی جیسے اب نہ کہا تو کبھی نہ کہہ سکے گا۔

''کچھ تو بولو دیکھو ہیرو نے تو پہلے اظہار کر کے ہیروئین کی لاج رکھ لی ہے۔ اب وہ میری تصویر کو سامنے رکھ کر گفتگو نہیں کرے گی۔'' وہ جانتا تھا دوسری جانب وہ مسکرا رہی ہے۔

''اور، مانوس اجنبی کے نام کے بجائے معیز کے نام شاعری کرے گی۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

بعض اوقات خاموشی کتنی بھلی لگتی ہے جب اس میں خوشی ہو، مسکراہٹ ہو۔

''بولو ناں یار.....'' وہ عجلت سے بولا۔

''میری کہانی کو وہ سچویشن مل گئی ہے اور وہ مکالمہ بھی، جب ہیروئین، اظہار محبت سن کر طمانیت بھرا سانس لے گی۔'' ماہا کی آواز ابھری تھی۔ ماہا دل کی بات کبھی نہیں کرے گی۔ معیز خاموشی سے اس کی آواز کے ساز سن رہا تھا۔

''ہاں وہ ڈائریکٹ کبھی نہیں کہے گی کہ وہ اس کی منتظر ہے۔ اس کے اظہار کی طلب گار۔ اس کے ہمراہ سفر کی متمنی بس کسی کردار کی زبانی۔

کسی کہانی کے پیراگراف میں اپنی دل کی بات کہہ دے گی۔ نامحسوس طریقے سے سرگوشی کی مانند اور وہ یقیناً سمجھ لے گا۔ ایک لکھاری کے ہمدم کو اب اتنا تو سمجھ دار ہونا چاہیے ناں۔

☆

جبین چیمہ

تقدیر بدلتی ہے

''آہ!'' درد کی ایک لہر سی اس کے وجود میں پھیلی۔

''میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں ــــ !'' اس نے سامنے بیٹھے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہ تم چند دنوں سے کیسی خواہش کر رہی ہو جس کا انجام سوائے موت کے کچھ نہیں۔'' اس نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''تم نہیں جانتے، جب سے میں نے اپنے اندر ایک اور وجود کو محسوس کیا ہے، مجھے اپنی ماں کی بہت یاد آ رہی ہے کہ انہوں نے کتنے ارمانوں سے اور کتنی تکلیفیں اٹھا کر مجھے جنم دیا ہوگا۔ میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔''

''معافی تو مجھے بھی مانگنی ہے، ان دونوں کی محبت کا بہت بڑا قرض ہے میرے اوپر لیکن.....؟'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

☆☆☆

رات اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ کچھ سورج ڈوبنے کی وجہ سے اور کچھ بادلوں کی وجہ سے سرِ شام گاؤں پر اندھیرے کی سیاہ چادر تن گئی تھی۔ گاؤں کی گلیاں سنسان ہو چکی تھیں۔ بادلوں کی گھن گرج اور بے پناہ سردی نے ہر شخص کو گھر میں محصور کر رکھا تھا۔

وہ بھی اپنے کمرے میں انگیٹھی میں کوئلے دہکائے سونے کی تیاریوں میں تھے۔ یہ چوہدری فرید کا گھر تھا۔ جہاں نوکر نوکرانیاں اپنے اپنے کام ختم کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

پیو ماچھن جو دن رات ان کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بھی اپنا کھانا لے کر اپنی کوٹھڑی میں گھس گئی تھی۔

چوہدری فرید سارے دن کے تھکے ہارے گرم کمرے اور گرم بستر میں لیٹتے ہی ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے ــــ ان کی بیوی زینب بھی سونے کی تیاریوں میں تھیں۔ جب انہیں لگا۔ جیسے باہر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ہے۔ اس خیال سے چوہدری فرید کی آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ جلدی سے باہر

تھیں۔ پتو تو آواز دی۔

باہر کی زوردار بارش میں اس دفعہ دستک زیادہ زور سے دی گئی تھی۔

''پتو!'' انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔ مگر وہ بھی گدھے گھوڑے بیچ کے سو چکی تھی۔

''کون!'' انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی صحن کی طرف قدم بڑھائے۔ ''بھئی کون ہے۔'' انہوں نے دوبارہ کڑک کے پوچھا۔

مگر جواب ندارد۔

''یہ پتو بھی نا!'' وہ دانت پیستے ہوئے دروازے تک پہنچیں۔ بارش میں بھیگتے اور سردی سے کانپتے ہوئے۔ انہوں نے دروازے کی جھری سے جھانکا۔ تو گویا پتھر کی ہو گئیں۔ زمین نے پاؤں جکڑ لیے۔ اور آسمان - سر پر آگرا۔

''اماں!'' باہر سے ایک سسکی سی سنائی دی۔ ''خدا کے لیے اماں اندر آنے دیں۔ نہیں تو میں اسی چوکھٹ پر جان دے دوں گی۔''

ان کے دل میں اس کے لیے غصے کا ایک طوفان سا اٹھا مگر جانے کیسے اس کی سسکیوں نے غصے پر پانی ڈال دیا۔ اور اس کی جگہ ماما نے لے لی۔

وہ خود بھی بارش میں بری طرح بھیگ چکی تھیں۔ مگر باہر کھڑی لڑکی جانے کب سے بھیگ رہی تھی۔ اور جانے کون سے طوفانوں سے گزر کر آئی تھی۔

ان کا ہاتھ بے اختیار کنڈی کی طرف بڑھا۔ مگر اندر سوئے خاوند کے ڈر سے نیچے گر گیا۔

''تم جہاں سے آئی ہو۔ وہیں لوٹ جاؤ۔ تمہارا اور ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔'' انہوں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جانے کے لیے نہیں آئی اماں! میں اسی چوکھٹ پر جان دینے آئی ہوں۔ اور پھر میں اس وقت کہاں جاؤں۔ اماں گلی میں کوئی آرہا ہے۔ خدا کے لیے

ہوئے وہ ان کے قدموں میں کبھی سسک رہی تھی۔

''چلو اندر۔ تمہارے ابا جی نے دیکھ لیا۔ تو قیامت آجائے گی۔'' وہ اسے گھسیٹتے ہوئے پتو کی کوٹھری میں لے آئی تھیں۔

''پتو!'' انہوں نے پتو کے اوپر سے رضائی اٹھائی پتو ہڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی بی بی جی!'' مگر بی بی جی کے پیچھے چھپے وجود کو دیکھ کر اسے لگا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہے۔

''بی بی جی! زینیا با جی۔''

''چپ!'' انہوں نے اسے چپ کرا دیا۔

''اس کے لیے کپڑے لاؤ اور اسے اپنے ساتھ کوٹھڑی میں سلا لو۔ جب تک یہ ادھر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔'' اس کے کپڑوں سے پانی نچڑ نچڑ کے نیچے تالاب بنتا جا رہا تھا۔ تب اس نے بے اختیار اپنے اوپر اوڑھی ہوئی موٹی چادر اتاری۔ اور اس کا حلیہ دیکھ کر جہاں پتو نے نظریں چرائیں۔ وہیں بے اختیار ان کا ہاتھ اٹھا۔ اور اس کے منہ پر نشان چھوڑ گیا۔

''بے غیرت! یہ سب کر کے باپ کو زندہ گاڑ کے اب ہمارا اور تماشا بنانے آئی ہے۔ ہمیں اور کتنا بے عزت کرے گی۔ اور ہمیں اور کس کس طرح مارے گی۔

''تو ایک ہی دفعہ ہمیں زہر کیوں نہ دے گئی کہ ہم بار بار کے مرنے سے ایک ہی دفعہ مر جاتے۔''

وہ لڑکھڑائی تھی۔ مگر گری نہیں تھی۔ اس کے بالوں سے بہتا ہوا پانی اس کے آنسوؤں سے مل کر اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

تب ہی پتو اس کے لیے ان کے ہی کپڑوں کا

تھیں۔ پپو کو آواز دی۔

باہر کی زوردار بارش میں اس دفعہ دستک زیادہ زور سے دی گئی تھی۔

''پپو!'' انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔ مگر وہ بھی گدھے گھوڑے بیچ کے سو چکی تھی۔

''کون!'' انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی صحن کی طرف قدم بڑھائے۔ ''بھئی کون ہے۔'' انہوں نے دوبارہ کڑک کے پوچھا۔

مگر جواب ندارد۔

''یہ پپو بھی نا!'' وہ دانت پیستے ہوئے دروازے تک پہنچیں۔ بارش میں بھیگتے اور سردی سے کانپتے ہوئے۔ انہوں نے دروازے کی جھری سے جھانکا۔ تو گویا پتھر کی ہو گئیں۔ زمین نے پاؤں جکڑ لیے۔ اور آسمان ۔ سر پر آگرا۔

''اماں!'' باہر سے ایک سسکی سی سنائی دی۔ ''خدا کے لیے اماں اندر آنے دیں۔ نہیں تو میں اسی چوکھٹ پر جان دے دوں گی۔''

ان کے دل میں اس کے لیے غصے کا ایک طوفان سا اٹھا مگر جانے کیسے اس کی سسکیوں نے غصے پر پانی ڈال دیا۔ اور اس کی جگہ مامتا نے لے لی۔

وہ خود بھی بارش میں بری طرح بھیگ چکی تھیں۔ مگر باہر کھڑی لڑکی جانے کب سے بھیگ رہی تھی۔ اور جانے کون سے طوفانوں سے گزر کر آئی تھی۔

ان کا ہاتھ بے اختیار کنڈی کی طرف بڑھا۔ مگر اندر سوئے خاوند کے ڈر سے نیچے گر گیا۔

''تم جہاں سے آئی ہو۔ وہیں لوٹ جاؤ۔ تمہارا اور ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔'' انہوں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جانے کے لیے نہیں آئی اماں! میں اسی چوکھٹ پر جان دینے آئی ہوں۔ اور پھر میں اس وقت کہاں جاؤں۔ اماں گلی میں کوئی آرہا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اندر آنے دیں۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

انہوں نے بے اختیار کنڈی کھول دی۔

بارش کے پانی میں شرابور بری طرح کانپتے ہوئے وہ ان کے قدموں میں بیٹھی سسک رہی تھی۔

''چلو اندر۔ تمہارے ابا جی نے دیکھ لیا۔ تو قیامت آجائے گی۔'' وہ اسے گھسیٹتے ہوئے پپو کی کوٹھری میں لے آئی تھیں۔

''پپو!'' انہوں نے پپو کے اوپر سے رضائی اٹھائی پپو ہڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی بی بی جی!'' مگر بی بی جی کے پیچھے چھپے وجود کو دیکھ کر اسے لگا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہے۔

''بی بی جی! زینیا باجی۔''

''چپ!'' انہوں نے اسے چپ کرا دیا۔

''اس کے لیے کپڑے لاؤ اور اسے اپنے ساتھ کوٹھڑی میں سلالو۔ جب تک یہ ادھر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔'' اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک ٹپک کے نیچے تالاب بنتا جا رہا تھا۔ تب اس نے بے اختیار اپنے اوپر اوڑھی ہوئی موٹی چادر اتاری۔ اور اس کا حلیہ دیکھ کر جہاں پپو نے نظریں چرائیں۔ وہیں بے اختیار ان کا ہاتھ اٹھا۔ اور اس کے منہ پر نشان چھوڑ گیا۔

''بے غیرت! یہ سب کر کے باپ کو زندہ گاڑ کے اب ہمارا اور تماشا بنانے آئی ہے۔ ہمیں اور کتنا بے عزت کرے گی۔ اور ہمیں اور کس کس طرح مارے گی۔

''تو ایک ہی دفعہ ہمیں زہر کیوں نہ دے گئی کہ ہم بار بار کے مرنے سے ایک ہی دفعہ مر جاتے۔''

وہ لڑکھڑائی تھی۔ مگر گری نہیں تھی۔ اس کے بالوں سے بہتا ہوا پانی اس کے آنسوؤں سے مل کر اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

تب ہی پپو اس کے لیے ان کے ہی کپڑوں کا ایک جوڑا لے آئی۔

''باجی! ادھر آ کے تسی کپڑے بدل لو۔'' وہ اسے ساتھ لے کر کوٹھڑی کے اس حصے میں چلی گئی۔

اس کے کپڑے بدلنے تک پینو اس کے لیے دوسری چارپائی پر بستر بچھا چکی تھی۔

"یہ بات اس کوٹھڑی سے باہر گئی۔ تو میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کروادوں گی۔"

چودھرانی زینب نے پینو کو دھمکی دی۔

"لیں بی بی جی! میں بھلا کس کو بتاؤں گی۔" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

"کیوں تمہارے اگلے پچھلے سب مرگئے ہیں جو تم کسی کو نہیں بتاسکتیں۔" وہ گرجیں۔

"لو جی ڈگی کھوتے توں نے غصہ کمہارے۔" (گری گدھے سے اور غصہ کمہار پر) پینو دل ہی دل میں ہنسی۔

"چلو، اب تم بھی سوؤ۔" بی بی جی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ کپڑے بدلتے بال خشک کرتے انہیں چھینکوں پر چھینکیں آرہی تھیں۔

"کی گل اے زینب! سردی تے نئیں لگ گئی۔ کافی رات گزر گئی اے۔ بہن سونے دی کرو۔" چوہدری فرید نیند میں ہی بول رہے تھے۔

جانے صبح کیسی شامت لائے جب انہیں پتا چلے گا کہ وہ واپس آگئی ہے۔ تو جانے کیا کر بیٹھیں۔ اگر اسے قتل کردیں گے تو خود جیل جائیں گے۔

تو میں کدھر جاؤں گی کس کے در پر۔ ان کے بھائی بھتیجے بھلے ہی آس پاس ہیں کہ ہم میاں بیوی کی آنکھیں بند ہوں اور وہ ہمارے گھر اور زمینوں پر قبضہ کریں۔

میں اگر اکیلی رہ گئی۔ تو مجھے تو کوئی ایک رات بھی ادھر نہیں رہنے دے گا۔ اور میں نے زندہ رہ کرنا بھی کیا ہے۔

یا اللہ مجھے ان سے پہلے اٹھالے۔" وہ منہ میں دوپٹا ٹھونسے سسکیوں کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔

میں اس کو کہاں چھپاؤں اگر اسے مار دیتے ہیں

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہروں والے منی آرڈر بھیج دیں، جنرل پارسل سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

کبھی چھپے ہیں۔"

وہ رات بڑی بھیانک تھی، ان سب ہی راتوں سے زیادہ بھیانک جو وہ اس کے جانے کے بعد گزارتی رہی تھیں۔ اس رات ان کی آنکھ اگر جھپکی بھی۔ تو اپنے چاروں طرف خون ہی خون دیکھ کر وہ ہڑبڑا اٹھتیں۔

☆☆☆

رات کو شدید بے آرامی اور بارش میں بھیگنے کا نتیجہ ظاہر تھا کہ وہ صبح بخار میں تپ رہی تھیں۔

چوہدری فرید نے ڈیرے پر جانے سے پہلے جب ان کو سوتے ہوئے دیکھا اور نوکرانیوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ بی بی تو ابھی اٹھی ہی نہیں تو انہوں نے پیچو سے پوچھا۔ کہ تم رات میں کدھر تھیں۔ جب انہیں خود کسی کام کے لیے باہر نکلنا پڑا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں باہر نکلی تھی۔" وہ گھبرا کر بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "باہر تو کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے وہم ہوا تھا شاید باہر دروازے پر کوئی ہے۔" وہ اندر سے کانپ رہی تھیں مگر بظاہر مضبوطی سے اپنے قدموں پر کھڑی تھیں۔

"چلو بس لیٹی رہو۔ میں کسی کو بھیجتا ہوں ڈاکٹر کی طرف دوائی لانے کے لیے۔"

تب ان کے ڈیرے پر جانے کے بعد انہوں نے پیچو سے پوچھا۔ "وہ کیسی ہے۔"

"جی باجی ہوری تے بے سدھ ستے نیں۔"

انہوں نے اپنی ہمت جمع کرنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تب تک باقی کام کرنے والی نوکرانیاں بھی آچکی تھیں۔

"میداں اور آشاں (حمیدہ اور عائشہ) تم دونوں ڈیرے پر جاؤ کسی آدمی کو بلا کر کہو۔ کہ سوکھی لکڑیاں گھر بھجوائے۔ رات کی بارش سے سارا بالن گیلا ہوگیا ہے۔ اور تم دونوں وہاں بھینسوں کے باڑے کی صفائی کرآؤ۔" انہوں نے انہیں چلتا کیا۔ اور باہر کا دروازہ بند کرکے پیچو کی کوٹھڑی میں چلی ان ہی کی طرح وہ بھی سردی لگ جانے سے بخار میں جل رہی تھی۔

انہوں نے پیچو کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح اسے اٹھایا، منہ ہاتھ دھلا کے ناشتہ کروایا۔ اور پھر بخار کی گولی دے کر باہر آگئیں۔

"اگر جو یہ بات باہر نکلی تو اس کے باپ سے پہلے شریکے (برادری والے) ٹوکے کلہاڑیاں لے کر آجائیں گے اس کے ٹکڑے کرنے۔" انہوں نے اس کمرے کی طرف دیکھا۔ جو پیچو کو دیا ہوا تھا۔ یہ باورچی خانے کے ساتھ ایک کچا کمرہ تھا۔ جس میں فالتو چارپائیاں بستر اور باقی چیزیں رکھی تھیں۔ وہیں ایک طرف پیچو نے اپنی چارپائی ڈالی ہوئی تھی۔ وہ گلی کی طرف تھا۔ کچی دیواروں اور کچی چھت والا کمرہ کتنی دیر اس کی پناہ گاہ بنے گا۔

آہ! یہ ماں کا دل۔ بچے جو بھی کرلیں۔ وہ انہیں دل میں چھپانے کو ہمیشہ تیار۔ انہوں نے سوچا۔

"نی پیچو۔" باہر سے زوردار دستک ہوئی۔ گاؤں کی کچھ عورتیں اس کو آوازیں دے رہی تھیں۔

"نی دروازہ کھول آئی وڈی پردھان۔"

پیچو نے دروازہ کھولا، تو باہر ریحانہ اور رشیدہ کھڑی تھیں۔

"نی بوہا کیوں نہیں کھول رہی تھی۔" انہوں نے اسے گھرکا۔

"کی آفت آگئی ہے تمہیں، لوتسی پردھان بن جاؤ، میری خیر اے۔" پیچو بڑبڑ کرتی اندر کہیں گم ہوگئی۔

"بی بی جی اے پیچو! بڑی سر چڑھ گئی ہے، کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔" رشیدہ کشمیرن بولی۔

"نی پیچو چاء بنا، میں دکان توں بخار دی گولی لے کے آوں اں (میں دکان سے بخار کی گولی لے کر آتی ہوں) ریحانہ بولی۔

"میں گولی کھلا چکی آں۔ آئی بڑی کہیں کی۔" پیچو نے اسے تمسخر سے دیکھا۔

☆☆☆

دن کے دس گیارہ بجے جب چوہدری فرید گھر لوٹے تو ان کے ہاتھ میں دوائیوں کے لفافے تھے۔

"پپو! زینب بی بی نے کراہتے ہوئے کہا" تم ڈیرے سے سبزیاں لے آؤ۔ خاص طور پر پالک۔" انہوں نے پپو کو باہر دوڑایا۔

چوہدری فرید صحن میں بچھی ان کی چارپائی کے ساتھ کرسی رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

"چوہدری صاحب اگر زندگی میں کبھی آپ کو زینی نظر آجائے تو آپ کیا کرو گے؟" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے اپنے خاوند سے پوچھا۔

"میں اپنے پستول کی ساری گولیاں اس کے اندر اتار دوں گا سوائے ایک گولی کے۔ جو میں آخر میں اپنے سر میں ماروں گا۔"

"اور میں۔ میں کدھر جاؤں گی۔ آپ مجھے کس کے لیے زندہ رکھیں گے۔" وہ کانپتے ہوئے بولیں۔

"میں نے کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ اس کا ذکر کبھی اس گھر میں نہیں ہوگا۔ کیوں تم مجھے بھولنے نہیں دیتیں کہ میرے ذمہ ابھی اس بے غیرتی کا بدلہ لینا باقی ہے۔ جب میں اپنے آپ کو قطرہ قطرہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو تم کیوں ایک ہی لفظ میں میرے جسم کے پرخچے اڑا دیتی ہو۔ میں نے اپنے اندر سے اسے کھرچ کے نکال دیا ہے۔ اب اس کی جگہ میرے دل میں صرف زہر ہی زہر ہے۔ جس نے مجھے اندر باہر سے نیل ونیل کر دیا ہے۔ اور جس دن یہ زہر میرے اندر سے نکل گیا۔ اس دن میں بھی نہیں رہوں گا۔" وہ ہانپنے لگے تھے۔

☆☆☆

اس سے اگلی رات وہ پھر ان کے قدموں میں بیٹھی سسک رہی تھیں۔

"فرید صاحب! وہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ بے شک میں نے اس کو بھی اولاد سے بڑھ کر جانا۔ مگر زینی کی جگہ کسی کو نہیں دی۔ اس سب میں قصور ہمارا بھی تھا۔

آپ کیوں اس کو گھر میں لائے۔ کیوں اتنا پیار دیا۔ کیوں اس پر اتنا بھروسا کیا۔ وہ تو بچی تھی۔ نادان تھی۔ مگر آپ تو نادان نہیں تھے۔ بھول تو ہم سے بھی ہوئی ہے۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔

"ہاں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔" وہ کافی دیر بعد بولنے کے قابل ہوئے۔ "اور اس کا خمیازہ میں ساری عمر بھگتوں گا۔ میں تب سے کسی پنچایت میں نہیں بیٹھا۔ برادری کی کسی غمی خوشی میں میرے لیے جانا اتنا مشکل ہو گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو جس کونے میں بھی چھپاؤں لوگوں کی نظروں کے تیر مجھے گھائل کرتے رہتے ہیں۔" ان کے لفظوں میں درد ہی درد تھا۔

"فرید صاحب! غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔ اور وہ ہماری نسل کا نات تھی۔ آپ اسے قتل کر کے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس طرح آپ کے دل کو سکون مل جائے گا۔" زینب اب ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

"آپ کو پتا ہے اس کے جانے کے بعد ہمارے گھر میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئی۔ ہمیں عید بقرعید کا پتا ہی نہیں کب آئیں اور کب گزر گئیں۔ ہمیں نہ کھانے کا ہوش ہے۔ نہ موسموں کا پتا ہے۔ پچھلے سال کی ساری فصل محض اس لیے گھر نہیں آئی۔ کہ ہماری ضرورتیں ہی ختم ہو گئی ہیں۔ پکی ہوئی گندم کی فصل آپ نے گاؤں کے لوگوں سے کہا۔ کہ وہ کاٹ لیں اور گھر لے جائیں۔ کیونکہ ہم دو زندہ درگور لوگ موت کی آس میں بیٹھے ہیں۔

فرید صاحب! ہم ایسے قیدی ہیں جنہیں سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ بس گلے میں پھندا کسنے کا انتظار ہے۔

ایسے میں کسی کے ساتھ نفرت کیسی۔ اگر وہ زندگی میں کبھی آپ کو مل جائے۔ تو اسے معاف کر دیجیے گا کہ اس سب میں سب سے بڑی غلطی ہماری اپنی تھی۔"

وہ بمشکل اٹھ کر اپنے بستر تک آئیں اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

''بس اس پر مزید بات نہیں یہ کل سے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کا کہیں سے پتا تو نہیں چل گیا۔'' وہ مشکوک ہوئے اور وہ سن سی ہو گئیں۔

''اگر وہ سامنے آ گئی۔ تو اس گھر میں کتنے خون ہوں گے۔'' وہ بے دم سی ہو گئیں اور وہ غصے میں گھر سے نکل گئے۔

وہ جب سے آئی تھی۔ وہ اس کے لیے لاشعوری طور پر اس کی پسند کے کھانے پکوا رہی تھیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کھاتی بھی ہے یا نہیں۔ جانے کتنے دن اور زندہ ہے۔ وہ حسرت سے سوچتیں۔

وہ اپنے بستر میں پڑی کانپ رہی تھیں۔ اس کے دن قریب ہیں' میں کیسے اتنا بڑا راز ان سے چھپا سکتی ہوں۔ اگر قیامت آنی ہے تو پھر ابھی آئے یا چند دن بعد۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بمشکل اٹھیں۔ اور اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی اس کی کوٹھڑی تک آئیں۔

وہ نڈھال سی بستر پہ پڑی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر بے خیالی میں اسے دیکھے گئیں۔ وہ جو نازوں پلی تھی جانے کہاں رلتی رہی تھی۔ سوکھ کے کانٹا ہو چکی تھی۔ چہرہ مرجھا چکا تھا۔ وہ حسن جس پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ جانے کہاں گم کر آئی تھی۔

تب ہی اس نے کراہ کر آنکھیں کھولیں۔ اور خشک لبوں پر زبان پھیری۔

تب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے گرم گرم دودھ لے آئیں۔ وہ کئی دنوں سے اپنی نوکرانی کے کمرے میں بند تھی۔ وہ کمرہ جس میں اس نے کبھی جھانکا بھی نہیں تھا۔ جانے یہ اس کے غرور کی سزا تھی یا گناہوں کی کہ آج وہی کمرہ اس کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔

اسی گھر میں اس کا ایک روشن کھڑکیوں والا کمرہ تھا۔ جس میں جالی اور مخمل کے پردے تھے۔ وہ سردیوں میں نرم گرم کمبل لے کر سوتی۔ یا ریشمی کوریا والی نرم نرم رضائی' وہ بہت نفاست پسند تھی۔ مگر پچھلے ایک سال نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا۔

''تمہارے ابا جی بہت غصے میں ہیں۔ وہ تمہیں بھی مار دیں گے اور اپنے آپ کو بھی۔'' انہوں نے اسے حقیقت بتائی۔

''انہیں بتا دیں اماں۔ میں اب خود بھی اور زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ انہیں بتا دیں۔ کہ میں نے بھاگ کر نکاح کر لیا تھا۔ مگر میں اب اور نہیں بھاگ سکتی۔ میں واپس آ گئی ہوں۔ اپنی سزا بھگتنے کے لیے۔ میں نے اگر آپ کو دکھ دیا ہے تو خود بھی دکھی رہی ہوں۔ آپ میرا حال دیکھ رہی ہیں۔ میں نے اس گھر سے نکل کر صرف غم کھائے اور آنسو پیے ہیں۔ میں ہر لمحے آپ دونوں کے لیے تڑپی ہوں۔ اب ایک ہی گھر میں اس کوٹھڑی میں آپ مجھے کب تک چھپا کے رکھ سکتی ہیں۔ آپ ابا جی کو بتا دیں تاکہ میں جو کب سے سولی پر لٹکی ہوئی ہوں۔ میری سزا پوری ہو۔

اماں میں مرنا چاہتی ہوں۔ شاید مرنے کے بعد ہی میں سکون پا سکوں۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''تم کیوں باپ کے ساتھ دشمنی پر اتری ہوئی ہو۔ تم ہمیں زندہ درگور تو کر گئی تھیں۔ اب انہیں پھانسی پر چڑھا دیکھنا چاہتی ہو۔'' وہ غصے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

زینب جانتی تھیں۔ کہ یہ بات زیادہ دنوں تک چھپ نہیں سکتی کہ کسی دن اسے ڈاکٹر کی ضرورت پیش آئے گی۔ یا اب تک پپو کسی نہ کسی کو بتا چکی ہو گی۔

اور اگر انہوں نے کسی اور سے یہ سب سنا تو ان پر کیا گزرے گی۔ یقیناً ان کا اعتبار اپنی بیوی پر سے اٹھ جائے گا۔ تو پھر وہ کہیں کی نہ رہیں گی۔

☆☆☆

اور اس رات بارش تو نہیں ہو رہی تھی۔ مگر سرد ہوائیں جسم میں خون جمانے پر تلی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے پپو کو اس کا کھانا دے کر بھیجا۔ تب تک چوہدری فرید بھی گھر آ چکے تھے۔ اوپر اوڑھا ہوا کمبل انہوں نے اتار کر بستر کے کنارے پر رکھا۔ اور رضائی اوڑھ کے بیٹھ گئے۔

پپو نے ان کے بستر کے ساتھ میز رکھ کر ان کے

کھانے کی ٹرے اس پر رکھ دی۔

''زینب! آپ بھی تو کچھ کھائیں۔'' انہوں نے انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر کہا۔

''مجھے بھوک نہیں، نہ کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔'' وہ اکتائی سی بولیں۔

انہوں نے بلب کی زرد روشنی میں اپنی بیوی کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔ یوں جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

''اچھا تھوڑا سا میرے لیے۔'' انہوں نے منت سے کہا۔

''آپ مجھے مر کیوں نہیں جانے دیتے۔ مجھے نہ کھانے کی ضرورت ہے نہ دوائیوں کی، میں مرنا چاہتی ہوں چوہدری صاحب۔ بس اب میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے حلق سے کچھ نہیں اتر رہا۔ بس میں سونا چاہتی ہوں۔'' وہ لحاف تان کے سوئی بن گئیں۔

تب کھانا سامنے رکھے رضائی کی بکل مارے چوہدری فرید بھی اپنی سوچوں میں کھو گئے۔

وہ دونوں سگے خالہ زاد تھے۔ فرید کی امی نے زینب کو پیدا ہوتے ہی فرید کے لیے مانگ لیا تھا۔ بڑے ہونے پر فرید کا کردار اس کی شائستگی اور بارعب شخصیت زینب کے گھر والوں کو بھی اتنی بھائی کہ وہ تو وہ اس کے گھر والے بھی فرید کے دیوانے ہو گئے۔

ادھر زینب بھی اپنے طریقے سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے علاوہ اپنی خوب صورتی اور سلجھی ہوئی طبیعت کی وجہ سے ان کے گھر میں جانے سے پہلے ہی اپنی جگہ بنا چکی تھی۔

شادی کے بعد اس جوڑے کو جہاں خاندان میں مثالی مانا جاتا تھا۔ وہیں باہر کے لوگ بھی ان کے گھر کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ بھئی جوڑی ہو۔ تو زینب اور فرید جیسی۔ زینب نے جہاں فرید کے بہن بھائیوں کو ایک بہن کی طرح پیار دیا تھا۔ وہیں فرید بھی اپنے خالہ خالو کے لیے بیٹے سے بڑھ کر ثابت ہوا تھا۔ خوشیوں کے دن پر لگا کر اڑتے جا رہے تھے۔

اور وہ آنے والے وقت سے بے خبر ایک دوسرے کی سنگت میں کھوئے ہوئے وقت سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے میں مگن تھے۔ پہلے دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ تیسرے سال میں دبی دبی سرگوشیاں ان کے کانوں میں پڑنے لگیں۔

''بھئی بہت دیرا کیلے پھر لیا۔ اب کوئی ننھا منا بھی آنا چاہیے۔''

مگر وہ دونوں سنی ان سنی کر کے اپنی ہی دنیا میں کھوئے رہتے۔ چوتھے سال کے شروع میں خالہ کو تشویش ہوئی انہوں نے دونوں پر زور دیا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائیں اور اس سے مشورہ کریں۔ مگر فرید ہمیشہ ہنس کے ٹال دیتے۔ مگر جب زینب کی طرف سے بھی مطالبہ زور پکڑ گیا تو وہ دونوں قریبی شہر کی مشہور گائنا کالوجسٹ کے پاس پہنچے۔

اور پھر جب معمولی علاج کے بعد زینب کو ماں بننے کی خوش خبری ملی۔ تو دونوں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ ان کے گھر والے بھی ایسے خوش تھے۔ جیسے آنے والا بچہ دنیا میں پہلا بچہ ہے۔

''میرا دل چاہتا ہے۔ میرا پہلا بیٹا ہو۔ جو ہو بہو آپ کی شکل کا ہو۔'' وہ اپنے شوہر کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتی۔

''اور عادتیں ساری کی ساری تمہاری طرح ہوں تم یہ چاہتی ہو۔'' وہ منہ بناتے۔

''میں نے یہ کب کہا۔'' وہ حیرت سے پلکیں جھپکتی۔

''کہا نہیں تو کیا ہوا۔ مطلب تو یہی ہے نا؟'' وہ اسے چھیڑتے۔

''نہیں، میں چاہتی ہوں کہ بنا بنایا فرید جونیئر ہو۔'' وہ ہنستی۔

''اور میں چاہتا ہوں میری پیاری سی بیٹی ہو۔ جو بنی بنائی زینب ہو۔'' وہ اس کی نقل اتارتے۔

''اچھا جی۔ میری نقل اتاری جا رہی ہے۔'' وہ انہیں گھورتی۔

''بھئی ہم تو بیوی کے غلام ہیں۔ جو وہ ارشاد

فرماتی ہیں۔ ہم وہی مان لیتے ہیں۔'' وہ اسے شوخ نظروں سے دیکھتے۔ اور وہ قند ھاری انار بن جاتی۔

دن پر لگا کر اڑتے جا رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زینب کی ناز برداریوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ارم فرید کی بڑی بہن اور احسن فرید کا چھوٹا بھائی بھی زینب کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ ارم جب بھی میکے آتی وہ زینب کی ہر طرح سے مدد کرتی۔ اسے مشوروں سے نوازتی اس کے ساتھ صبح شام سیر کرتی۔ اور احسن جب بھی قریبی شہر جاتا۔ چن چن کے ایسے کھٹے میٹھے پھل لاتا جو زینب شوق سے کھاتی۔

اور وہ جو اپنی خوش قسمتی کے عروج پر تھی۔ اور سوچتی تھی کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی خوش قسمت ہو سکتا ہے اس کو شاید اپنی ہی نظر لگ گئی۔

چوہدری فرید کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔ کبھی کبھی یہ خوشیاں دروازے سے ہی کیوں لوٹ جاتی ہیں۔ ہم جو چاہ رہے ہوتے ہیں۔ تقدیر کے فیصلے اس کے بالکل الٹ کیوں ہوتے۔

اور ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا عین وقت پر زینب کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ بچے کی سانسیں بھی رکتی جا رہی تھیں۔ آپریشن کا فیصلہ ڈاکٹر کے لیے بہت مشکل تھا۔ اور پھر زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرتی ہوئی زینب نے مردہ بیٹے کو جنم دیا تھا۔

ان دنوں انہیں صرف زینب کی فکر تھی۔ بچے کا دکھ کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔

مگر زینب کی حالت بھی سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کوئی بھی صدمہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ بھی ہوش میں آتے ہی بچے کے لیے ضد کرتی۔ تب وہ اسے بمشکل اسے بہلاتے کہ بچے کو علیحدہ اس لیے رکھا ہے کہ تاکہ وہ جلدی سے صحت یاب ہو سکے۔ مگر صحت کی طرف آہستہ آہستہ لوٹتے ہوئے اب اس کی تکرار بڑھتی جا رہی تھی۔ تب انہوں نے وہ فیصلہ کیا۔ جس کے نتائج سے وہ بے خبر تھے۔

☆☆☆

''بی بی جی!'' انہوں نے پیتو کی سرگوشی نما آواز سنی۔

''بی بی جی! وہ بہت تکلیف میں ہیں وہ درد سے مر رہی ہیں۔''

وہ ان کے کان میں تھسی کھسر پھسر کر رہی تھی۔

''کیا ہوا پیتو۔'' چوہدری فرید اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''اوہ! جی کچھ نہیں۔ میں بی بی جی سے پوچھ رہی ہوں کہ دودھ کو گرم کر کے کسی لگائی ہے یا ایسے ہی لگا دوں۔'' اس نے جلدی سے بات بنائی۔

''جو مرضی ہے کرو مگر ان کو سونے دو۔'' وہ اکتائے ہوئے سے بولے۔

''چلو میں دیکھتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگیں تو چوہدری فرید جلدی سے آگے بڑھے۔

''اتنی سردی میں آپ کیوں اٹھ رہی ہیں۔ پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''نہیں کچھ نہیں ہوتا مجھے، تم کو ئلے دہکا کر اندر لے جاؤ۔ میں آتی ہوں۔'' انہوں نے اشارے سے کہا کہ وہ جائے۔

''چوہدری صاحب! میں نے کچھ راتوں سے جو بوجھ اٹھا رکھا ہے اس نے میرے کندھے توڑ دیے ہیں میں اس کو اور زیادہ اکیلے نہیں اٹھا سکتی۔''

وہ نڈھال ہو کر ان کے قریب ڈھے سی گئیں۔

''کیا ہوا۔ کیسا بوجھ۔'' فرید صاحب بری طرح چونکے۔ ''کیا اس کی کوئی خبر مل گئی ہے؟'' وہ ان کو جھنجوڑنے لگے۔

''وہ..... وہ مل گئی ہے فرید صاحب۔ کاش وہ کبھی نہ ملتی۔'' الفاظ ان کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے اور وہ جو ہمیشہ اپنے آپ کو اس وقت کے لیے تیار کرتے آئے تھے۔ ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئے۔

''کہاں ہے وہ؟'' انہوں نے سرسراتی آواز

''پچو کی کوٹھڑی میں۔'' وہ کہتے کہتے ہانپنے لگیں۔ یوں جیسے اس کی قسمت کے فیصلے کے ساتھ ہی ان کی سانسیں اٹکی ہوئی ہیں۔

اور چوہدری فرید کو یوں لگا۔ جیسے گھر کی دیواریں ان پر آگری ہوں۔

☆☆

''جلدی جاؤ اور جنتے دائی کو بلا لاؤ۔'' انہوں نے پچو کو بھگایا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئیں۔

اس کو دلاسا دیتیں۔ وہ اس وقت عجیب کیفیت میں تھیں۔ دعائیں اس کے لیے جو وہ شروع سے کرتی آئی تھیں اس وقت بھول گئی تھیں۔ اور بددعا وہ دے نہیں سکتی تھیں کہ زندگی کی ڈور اسی سے بندھی تھی۔ اگرچہ پچھلے سال ڈیڑھ سال سے اس نے انہیں سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا تھا۔

''اگر اس وقت یہ مرجائے۔ تو اس کا باپ اس کے خون سے ہاتھ رنگنے سے بچ جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔'' انہوں نے درد سے تڑپتے ہوئے اس کے بے حال وجود کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہوئی جارہی تھیں۔ اور وہ تکلیف کی آخری حدوں پر تھی۔

''کیوں کیا تم نے یہ سب اگر جو ہم تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کرتے۔ تو اس وقت تمہارے سسرال والے اور ہم سب کتنے خوش ہوتے۔ میں تمہارے لیے اور بچے کے لیے چیزیں بنا بنا کر کمرہ بھر دیتی۔ اور اس وقت اس کے استقبال کے لیے کتنی دنیا تمہارے اردگرد ہوتی۔ مگر اب اس وقت۔'' انہوں نے بے دلی سے اس کا ہاتھ چھوڑا۔ ''نفس کی غلامی میں تم نے ایک دفعہ بھی ہمارے بارے میں نہ سوچا۔''

دروازے پر کھٹکا سا ہوا۔ جنتے دائی، پچو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور وہ جب جاب سلام

اپنے کمرے میں ان کی جانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ وہ کانپتے لرزتے وجود کے ساتھ، ساتھ والے کمرے میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگیں۔

''یا اللہ یہ اتنی بڑی آزمائش اور ہم دو بوڑھے میاں بیوی کیسے سہیں گے۔'' انہوں نے سسکاری سی لی۔

''ہر آزمائش ہمارے اپنے اعمال کے نتیجے میں آتی ہے۔'' ان کے اندر سے کوئی بولا۔

''بیٹا ہوا ہے۔'' پچو نے ان کے کان میں کوئی سحر سا پھونکا۔

''بیٹا!'' اس ایک لفظ کو سننے کے لیے ان کے کان ساری عمر ترسے تھے۔ ان کے گھر میں بیٹا ہوا ہے۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھر پچو کے کمرے میں گئیں۔

جہاں زندگی اور موت کی کشمکش سے نبرد آزما ہوکر ان کی اکلوتی اولاد بے سدھ پڑی تھی۔ زرد چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔

جنتے نے بستر کی چادر میں لپٹا ہوا ننھا وجود ان کی جھولی میں ڈال دیا۔

''بی بی جی کا کا تے چودھویں دا چن اے۔ ایدے ابا جی وی آئے نیں — بڑ جنتے نے پوچھا۔ (بی بی جی کا کا تو چودھویں کا چاند ہے کیا اس کے ابا جی بھی آئے ہیں۔)

وہ جو اس چاند کو دیکھنے میں محو تھیں۔ جس کی روشنی سے کوٹھڑی جگمگا اٹھی تھی۔ جنتے دائی کی ہمت اور جرأت پر حیران رہ گئیں۔ اب لوگ اس کے باپ کے بارے میں سوال کریں گے۔ چوہدری فرید کا سینہ چھلنی کریں گے۔ اسے غیرت دلائیں گے۔ کہ اس کی گھر سے بھاگی ہوئی بیٹی نے کسی کی اولاد کو جنم دیا ہے۔ تو وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور پھر خود بھی زندہ نہیں رہیں گے۔ اور میری زندگی اس کا کیا بنے گا۔

''میرے بچے میرے مجھ کہہ کر'' ہوں

''پیو کی کوٹھڑی میں۔'' وہ کہتے کہتے ہانپنے لگیں۔ یوں جیسے اس کی قسمت کے فیصلے کے ساتھ ہی ان کی سانسیں اٹکی ہوئی ہیں۔

اور چوہدری فرید کو یوں لگا۔ جیسے گھر کی دیواریں ان پر آگری ہوں۔

☆☆

''جلدی جاؤ اور جنتے دائی کو بلا لاؤ۔'' انہوں نے پیو کو بھگایا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئیں۔

اس کو دلاسا دیتیں۔ وہ اس وقت عجیب کیفیت میں تھیں۔ دعائیں اس کے لیے جو وہ شروع سے کرتی آئی تھیں اس وقت بھول گئی تھیں۔ اور بددعا وہ دے نہیں سکتی تھیں کہ زندگی کی ڈور اسی سے بندھی تھی۔ اگرچہ پچھلے سال ڈیڑھ سال سے اس نے انہیں سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا تھا۔

''اگر اس وقت یہ مر جائے۔ تو اس کا باپ اس کے خون سے ہاتھ رنگنے سے بچ جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔'' انہوں نے درد سے تڑپتے ہوئے اس کے بے حال وجود کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اور وہ تکلیف کی آخری حدوں پر تھی۔

''کیوں کیا تم نے یہ سب اگر جو ہم تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کرتے۔ تو اس وقت تمہارے سسرال والے اور ہم سب کتنے خوش ہوتے۔ میں تمہارے لیے اور بچے کے لیے چیزیں بنا بنا کر کمرہ بھر دیتی۔ اور اس وقت اس کے استقبال کے لیے کتنی دنیا تمہارے اردگرد ہوتی۔ مگر اب اس وقت۔'' انہوں نے بے دلی سے اس کا ہاتھ چھوڑا۔ ''نفس کی غلامی میں تم نے ایک دفعہ بھی ہمارے بارے میں نہ سوچا۔''

دروازے پر کھٹکا سا ہوا۔ جنتے دائی، پیو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور وہ چپ چاپ باہر اپنے کمرے میں ان کی جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کانپتے لرزتے وجود کے ساتھ، ساتھ والے کمرے میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگیں۔

''یا اللہ یہ اتنی بڑی آزمائش اور ہم دو بوڑھے میاں بیوی کیسے سہیں گے۔'' انہوں نے سسکاری سی لی۔

''ہر آزمائش ہمارے اپنے اعمال کے نتیجے میں آتی ہے۔'' ان کے اندر سے کوئی بولا۔

''بیٹا ہوا ہے۔'' پیو نے ان کے کان میں کوئی سحر سا پھونکا۔

''بیٹا!'' اس ایک لفظ کو سننے کے لیے ان کے کان ساری عمر ترسے تھے۔ ان کے گھر میں بیٹا ہوا ہے۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھر پیو کے کمرے میں گئیں۔

جہاں زندگی اور موت کی کشمکش سے نبرد آزما ہو کر ان کی اکلوتی اولاد بے سدھ پڑی تھی۔ زرد چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔

جنتے نے بستر کی چادر میں لپٹا ہوا ننھا وجود ان کی جھولی میں ڈال دیا۔

''بی بی جی کاکا تے چودھویں دا چن اے۔ ایدے ابا جی دی آئے نیں۔'' جنتے نے پوچھا۔ (بی بی جی کاکا تو چودھویں کا چاند ہے کیا اس کے ابا جی بھی آئے ہیں۔)

وہ جو اس چاند کو دیکھنے میں محو تھیں۔ جس کی روشنی سے کوٹھڑی جگمگا اٹھی تھی۔ جنتے دائی کی ہمت اور جرأت پر حیران رہ گئیں۔ اب لوگ اس کے باپ کے بارے میں سوال کریں گے۔ چوہدری فرید کا سینہ چھلنی کریں گے۔ اسے غیرت دلائیں گے۔ کہ اس کی گھر سے بھاگی ہوئی بیٹی نے کسی کی اولاد کو جنم دیا ہے۔ تو وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور پھر خود بھی زندہ نہیں رہیں گے۔ اور میری زندگی اس کا کیا بنے گا۔

''میرا بچہ میرا بیٹا مجھے دکھاؤ۔'' اس نے نقاہت

سے کہا تو انہوں نے بچہ پپو کو تھما دیا۔

''پپو! انڈے ابال کے لے آؤ، دودھ کو تو نسی لگا دی ہے۔ اب اس وقت دودھ تو نہیں ملے گا۔ دن چڑھنے پر پھر یخنی کا بندوبست کر لینا۔''

وہ کمرے میں دہکتے انگاروں پر نگاہ جمائے کچھ سوچتی ہوئی اپنی بیٹی کو دیکھ کر اٹھ گئیں۔

''اماں! میں نے ابھی اس کو دیکھا نہیں۔ اس کو آپ پال لینا۔ میرے مرنے کے بعد آپ کے جینے کا سہارا ہوگا۔ میں اسی لیے واپس آئی ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور وہ اپنی چیخوں کا گلا دباتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

''بی بی جی میری مبارکی۔'' (مبارکباد کے پیسے) جنتے نے انہیں کمرے سے نکلتے دیکھا تو راستے میں آ گئی۔

جنتے کو رخصت کر کے وہ اپنے کمرے میں آئیں۔ تو فجر کی اذانیں ہونے والی تھیں۔ مگر چوہدری فرید ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اور وہ جانے کتنی دیر سے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورے جا رہے تھے۔

''کچھ بتایا اس نے؟'' اچانک انہوں نے سر اٹھا کر ان سے پوچھا۔

''کیا؟'' انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ وہ اب تک کہاں رہی؟'' ان کی آواز کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔

''نہیں! نہ میں نے کچھ پوچھا۔ نہ اس نے کچھ بتایا۔'' انہوں نے بے بسی سے کہا۔

''اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہمارے لیے وہ اسی دن مر گئی تھی جس دن وہ یہاں سے گئی تھی۔''

وہ دونوں ہاتھ پیچھے ٹکائے بے آرام سے بیٹھے بہت نڈھال نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

دن چڑھے تک بات چاروں طرف پھیل چکی تھی کہ زینی گھر آ گئی ہے۔

سردیوں کے دن تھے۔ اور زرد زرد مری مری سی دھوپ دیواروں سے دھیرے دھیرے صحن میں اتر رہی تھی۔

باورچی خانے کی کھٹر پٹر سے بے نیاز دونوں میاں بیوی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جو پہلے ہی چوکنی بیٹھی تھیں۔ جلدی سے اٹھ کر دروازے تک گئیں اور ان کے خدشے کے عین مطابق دروازے پر ان کے دیور کے دونوں بیٹے کھڑے تھے۔ شاہ میر اور شاہ زیب۔

''کیا بات ہے بیٹا اتنی صبح؟'' انہوں نے دھڑکتے دل سے کنڈی کھولی۔

''تائی جی! تسی اینیاں وڈیں گلاں ہضم کر جاندے او۔ تسی تے لک ہضم پتھر ہضم دی بجائے جنگل ہضم پہاڑ ہضم او۔'' شاہ میر بولا۔

''ویسے او ہے کتھے؟'' انہوں نے تجسس سے ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔

''کون کس کی بات کر رہے ہو؟'' انہوں نے بظاہر اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''او جی! ہونا کی اے۔ سنیا اے زینیا شہزادی سارے چن چڑھا کے واپس آ گئی اے تے نال تحفہ وی لے آئی اے۔'' شاہ زیب بولا۔

''اچھا پھر؟ اگر آئی ہے تو تم لوگ صبح صبح اسے قتل کرنے آئے ہو۔ اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ اور اس کا فیصلہ وہی کرے گا۔'' انہوں نے غراتے ہوئے کہا۔

''نہیں تائی جی! یہ ایہہ گل ہون تہاڈے کار دی نئیں (یہ بات اب آپ کے گھر کی نہیں رہی) وہ میری سنگ سی۔ اور میں پچھلے ڈیڑھ سال توں لوکاں دے تیر سہ رہیاں۔

''تائی جی ہم اپنے ہاتھوں سے اس کا کام تمام کریں گے۔ تایا جی کو اس عمر میں کیوں تکلیف دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کورٹ کچہری کے کاموں سے

علیحدہ ہی رہیں۔"

زینب نے دیکھا کہ ان دونوں کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ مارے خوف کے ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"ٹھیک ہے۔ فی الحال تمہارے تایا جی گھر پر نہیں۔ جب وہ آئیں گے۔ تو تم بھی آجانا۔" انہوں نے انہیں باہر کا راستہ دکھایا۔

"فرید صاحب! باہر شاہ میر اور شاہ زیب تھے۔ وہ زینی کو قتل کرنے آئے تھے۔ مگر وہ اس کے بچے کو بھی ماردیں گے، اس ننھی سی جان کا کیا قصور ہے۔ جس نے ابھی کل رات اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے۔" وہ بے طرح رو دیں۔

"بچہ زینی کا بچہ!" وہ چارپائی سے اچھل پڑے۔ "اس کی اولاد میرے گھر میں پلے گی۔" انہوں نے پورے زور سے مٹھیاں بند کیں۔ اور ہانپنے لگے۔

"کیوں جنم دیا۔ زینب تم نے ایسی بیٹی کو جس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ لوگ شاید اسی لیے بیٹیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے۔"

"اس نے نکاح کیا ہے فرید صاحب!" زینب نے کراہتے ہوئے کہا۔

"میں کسی ایسے نکاح کو نہیں مانتا۔ جس میں ولی کی مرضی شامل نہ ہو۔ میں اسے نہیں بچا سکتا۔ تم بھی دل پر پتھر رکھ لو۔ یہی ہماری ریتی رواج ہے۔ اور یہی ہمارا مذہب ہمیں سکھاتا ہے۔"

وہ فوراً ہی باپ سے بڑھ کر مفتی کا درجہ اختیار کر گئے۔

چڑھتے دن کے ساتھ ساتھ ان کے کانوں میں موت کا شور بڑھتا جارہا تھا۔ وقت جوں کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ خود بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔ انہیں نہ گھر کا ہوش تھا۔ اور نہ کسی اور چیز کا۔

دونوں میاں بیوی چپ کی بکل مارے بت بنے آنے والے وقت کی آہٹیں سن رہے تھے۔

جی جی وہ ڈرتے ڈرتے کن کی طرف نگاہ کرتیں تو انہیں کام کرنے والی عورتیں کھسر پھسر کرتی اور پپو کی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرتی نظر آتیں۔

ایک دو دفعہ انہیں پپو اپنی کوٹھڑی کی طرف کچھ لے جاتی بھی نظر آئی۔

دن جب کافی چڑھ آیا تو وہ ان کے لیے ناشتہ لائی مگر دونوں نے ہی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

جانے کتنی ہمتوں کے بعد چوہدری فرید اٹھے۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد سر پر صافہ باندھتے ہوئے بغیر ارد گرد نگاہ کیے باہر نکل گئے۔

جانے کتنی دیر تک وہ اپنی جگہ بت بنی بیٹھی رہیں۔ اور آخر ہمت کرکے وہ بھی باہر دھوپ میں آبیٹھیں۔ اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جانے کہاں کہاں سے لمحے چرا کے یادوں کی مالا پروتی رہیں۔

وہ ان کا پہلا بچہ تھا۔ یا وہ پہلا بچہ تھا۔ جسے ماں کی طرح انہوں نے سینے سے لگایا۔ جب وہ روتا تو ان کی سانسیں اٹکنے لگتیں۔ اور جب ہنستا۔ تو ان کی ساری ہستی خوشیوں سے بھر جاتی۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ عین ولادت کے وقت بہت پیچیدگی ہوگئی تھی۔ وہ خود موت کو چھو کر لوٹی تھیں۔ مگر اب ننھے مرتضیٰ کے ساتھ ایک نئی زندگی جی رہی تھیں۔ وہ جسے انہوں نے جنم تو نہیں دیا تھا مگر اب وہ ان کی کل کائنات تھا۔

چوہدری فرید انہیں خوش اور مطمئن دیکھ کر خوش تھے۔ وہ شام کو گھر آتے تو زینب کے پاس مرتضیٰ کی باتوں کا اتنا ڈھیر ہوتا۔ کہ وہ سنتے سنتے تھک جاتے۔ تب وہ انہیں چھیڑتے۔

"تم کو تو اب صرف ہر طرف مرتضیٰ ہی نظر آتا ہے۔ ہم تو کہیں ہیں ہی نہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا۔ چونکہ ڈاکٹروں نے فرید صاحب کو بتا دیا تھا کہ اب زینب کا ماں بننا مشکل ہے۔ اس لیے دونوں میاں بیوی اب اس بچے کو اپنی کل کائنات سمجھ کر اس پر دنیا لٹا رہے تھے۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مرتضیٰ کے پانچ سال بعد ایک بار پھر انہیں ماں بننے کی نوید ملی۔

اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھا گیا۔ اور اتنی مدت کے بعد جب وہ ایک جیتی جاگتی گڑیا کے ساتھ گھر آئیں تو چوہدری فرید کے بھی پاؤں زمین پر نہیں لگتے تھے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے دیکھتے کہ زینیا کو سانس تو آ رہا ہے۔ وہ جب بھی گھر میں ہوتے اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ اس بچی میں ان کی جان تھی۔

"آپ کو بیٹے سے زیادہ بیٹی کیسے پیاری ہوگئی۔" وہ اچنبھے سے کہتیں۔

"یہ میرا خون ہے۔ یہ اس گھر کی زینت ہے۔ اس سے پیار نہیں ہوگا تو پھر کس سے ہوگا۔" وہ دل میں سوچتے۔ مگر بظاہر ہنستے ہوئے کہتے۔

"وہم ہے آپ کا، مجھے تو دونوں بچوں سے بہت پیار ہے۔"

مرتضیٰ بھی ننھی بہن کے آنے سے بہت خوش تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا۔ اسے جھولے جھلاتا۔ اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتا۔

☆☆☆

زینی کا عقیقہ تھا۔ چوہدری فرید نے وسیع پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بہن بھائی کے علاوہ گاؤں کے لوگوں کو بھی کھانے کی دعوت دے رکھی تھی۔

اور اس رات جب وہ باہر باورچی خانے میں سب ملازموں کو کھانا دینے کے بعد کمرے میں آئیں۔ تو ارم کو بھائی کے ساتھ سرگوشیاں کرتے سنا۔ مگر وہ سرگوشیاں اتنی اونچی ضرور تھیں کہ ان کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔

"فرید! آپ کو مرتضیٰ کی اصلیت سب کو بتا دینی چاہیے۔ اب آپ کی اپنی اولاد ہوگئی ہے تو اب آپ کا غیروں کو پالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں میں بھی چاہتا تو یہی ہوں۔ مگر ہمت نہیں پڑتی۔ زینب کو اس سے بہت پیار ہے وہ کبھی اسے اپنے سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔ وہ بے بسی سے بولے۔

"مگر کل کو اور مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔" ارم بولیں۔ اور وہ جو دروازے سے لگی کانپ رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح خود کو گھسیٹتی ہوئی اندر پہنچیں۔

"کیسی حقیقت ارم؟" ان کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ تو آپ ہی اعلان کروا دیں۔ مگر مرتضیٰ میرا بیٹا۔ اور بیٹا رہے گا۔ وہ مجھے اتنا پیارا ہے کہ میں اس کی پل بھر کی بھی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ جب میرے ذہن نے یہ کبھی قبول نہیں کیا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ تو میں لوگوں کو کیسے بتاؤں کہ یہ میرا نہیں ہے۔ اور پھر آپ اسے کیا کہیں گی کہ خالہ جان کو کبھی بھی مرتضیٰ کی ذات پر اعتراض نہیں ہوا۔ بلکہ وہ جب تک حیات رہیں۔ مرتضیٰ کے آدھے کام وہی کرتی رہیں اور آپ اس کو کیا کہیں گی مرتضیٰ کی شکل بھی کافی حد تک فرید صاحب سے ملتی ہے، خالہ کو اس میں فرید کا بچپن نظر آتا تھا۔ آپ مہربانی کر کے اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔" انہوں نے گویا ارم کی منت کر ڈالی۔

مگر ارم سے بات ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی والی ہوگئی۔ احسن چوہدری فرید کے چھوٹے بھائی اور ان کی بیوی نزہت مرتضیٰ کو اتنی حقارت سے دیکھتے۔ جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ اور ہوتے ہوتے یہ بات مرتضیٰ تک بھی پہنچ ہی گئی۔

وہ ننھا سا بچہ اپنے گھر میں ہی اجنبی ہوگیا۔ وہ اسکول سے چھٹی ہونے پر بھی اسکول میں ہی بیٹھا رہتا۔ وہ اسکول سے واپسی پر بھاگتا ہوا جیسے پہلے ان سے چمٹتا تھا۔ اس طرح ملنا چھوڑ دیا۔ وہ بہت حساس ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر احسن اور اس کی بیوی کو یہ بات کسی طور پر گوارا نہیں تھی کہ چوہدری فرید اپنی زمین جائیداد میں سے کچھ بھی اس لے پالک کے نام کریں۔ وہ دونوں برملا کہتے۔

"بھائی! اگر آپ نے بچہ لینا ہی تھا تو ہمارے لیتے جانے کس کا گندہ خون ہمارے گھر میں پل رہا ہے۔"

چوہدری فرید تو چپ کر جاتے۔ مگر زینب کو بہت غصہ آتا، مرتضیٰ کی ڈھال بن جاتیں۔

وہ آہستہ آہستہ دنیا سے کٹتا گیا۔ اور کتابوں سے جُڑتا گیا۔ ہر جماعت میں اول، اسکول میں بہترین طالب علم ٹرافیوں پر ٹرافیاں اکٹھی کرتا گیا۔ اور جانے کون کون سی ڈگریاں لیتا رہا۔ وہ زینب کا فخر تھا۔

زینی بھی اب کافی بڑی ہوگئی تھی۔ مرتضیٰ اس کا اسی طرح خیال رکھتا۔ جیسے وہ چھوٹی سی گڑیا ہو۔ زینی کی خوب صورتی کے چرچے بچپن سے تھے۔ مگر جوں جوں وہ بڑی ہورہی تھی۔ اور خوب صورت ہوتی جارہی تھی۔

وہ کالج میں فرسٹ ائیر میں تھی۔ اور پری میڈیکل کی طالبہ تھی۔ جب اسے اپنے سائنس کے مضامین کے لیے ٹیوشن کی ضرورت پڑی۔

چوہدری فرید اور زینب دونوں ہی کسی غیر آدمی سے ٹیوشن پڑھانے کے خلاف تھے۔ ایسے میں مرتضیٰ نے کہا کہ وہ زینی کو پڑھادے گا۔

زینی جس وقت چاہتی۔ وہ مرتضیٰ بھائی کے کمرے میں جا پہنچتی۔ اور دن میں بھی وہ صحن کے کسی کونے میں اسے پڑھاتا نظر آتا۔ سردیوں میں چھت پر پڑھ رہا ہوتا تو زینی بھی کھانے پینے کی چیزوں اور کتابوں کے ساتھ اوپر پہنچ جاتی۔

وہ خود بھی مقابلے کے امتحان کی تیاری کررہا تھا۔ جبکہ احسن چاچا کے دونوں بیٹے جو زینی کو بچپن سے ہی بہت برے لگتے تھے۔ بی اے کرکے اپنی زمینیں سنبھال چکے تھے اور آئے دن گاؤں میں کسی نہ کسی سے جھگڑتے رہتے تھے۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے جانے وہ کب ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے۔ کہ زینی کو مرتضیٰ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہ آتا۔ وہ سارا وقت اس کے اردگرد ہی منڈلاتی رہتی۔ بہانا وہی پڑھائی کا تھا۔

ایسے میں ایک دن نزہت نے زینی کو مرتضیٰ سے پڑھتے دیکھ لیا۔ اور اسی شام وہ اور احسن، شاہ میر کا رشتہ لے کر آپہنچے۔

''بھائی جی! باہر اس بات پر کافی باتیں بن رہی ہیں کہ گھر میں ایک لے پالک جوان لڑکا آپ نے رکھا ہوا ہے۔ جس کے باپ کا بھی پتا نہیں۔ اب ہماری بیٹی بھی بڑی ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شاہ میر کے ساتھ زینی کا نکاح کردیا جائے اور رخصتی جب آپ چاہیں ہوجائے گی۔ ہمیں رخصتی کی کوئی جلدی نہیں۔'' احسن نے بات شروع کی۔

''مگر زینی تو ابھی بچی ہے۔ بہت چھوٹی ہے ابھی کل تک تو وہ گڑیوں کی شادیاں کرتی رہی ہے۔ آج اس کے بیاہ تک بھی بات آپہنچی۔'' چوہدری فرید بولے۔

''اور مرتضیٰ، زینب کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ اللہ ہر ایک کو ایسی اولاد دے۔ میں نے اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔''

''زینی اور مرتضیٰ سگے بہن بھائی کی طرح رہتے ہیں۔'' زینب بولیں۔ ''میرا مرتضیٰ تو فرشتہ ہے فرشتہ۔'' انہوں نے فخر سے کہا۔

اور یہی ان کی بھول تھی۔ مرتضیٰ بھی فرشتہ نہیں انسان تھا۔ جسے دنیا میں دو ہی لوگ پسند تھے۔ اس کی ماں زینب اور دوسری زینہ جو پہلے اس کے لیے کھلونے جیسی تھی۔ پھر کھیل کھیل میں ساتھی بنی۔ پھر وہ اس کی محرومیوں کی حصے دار بنی۔ اور آخر میں وہ حاصل زیست ٹھہری۔

اور زینی جس کی آنکھوں نے ابھی سپنے دیکھنے شروع ہی کیے تھے کہ ظالم سماج درمیان میں آگیا۔

خیر، اس دفعہ تو انہیں ٹال دیا گیا۔ مگر زینی کے بی ایس سی کے پہلے سال میں ہی شاہ میر کے لیے زینی کے رشتے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ اور آخر چوہدری فرید کو ہاں کہتے ہی بنی کہ باہر بیٹی دینے سے زمین جائیداد بھی باہر جاتی۔ جو احسن کے ساتھ ساتھ فرید کو بھی گوارا نہیں تھی۔

''کاش شاہ میر کی جگہ مرتضیٰ، احسن کا بیٹا ہوتا۔ یا شاہ میر مرتضیٰ جتنا قابل نہ سہی۔ اس سے آدھی

Khawateen Digest August 2021

قابلیت کا ہی مالک ہوتا۔ وہ زینب سے کہتے۔

کاش میں زینی کو مرتضیٰ سے بیاہ سکتا۔

چوہدری فرید دل ہی دل میں سوچتے۔ اس کی وجاہت، اس کی ذہانت، اس کی قابلیت، اس کا کردار سب ہی خاندان کے باقی لڑکوں سے بہت بلند تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا تھا۔ اور وہ انہیں بہت عزیز تھا۔ مگر زینی کے لیے وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نہ اس کے ماں باپ کا علم تھا نہ خاندان کا۔

اور پھر گھر میں زینی نے نہ صرف شاہ میر اس کی شادی کا شادی سے انکار کر دیا بلکہ رو رو کر گھر سر پر اٹھالیا۔ وہ فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اس کے حق میں مرتضیٰ نے بہت دلائل دیے تھے۔

اور پھر وہ دن جب زینی کے احتجاج کے باوجود شاہ میر کے نام کی انگوٹھی اسے پہنادی گئی تھی اور وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی اور پھر ایک عرصے تک اسے چپ لگی رہی تھی۔ وہ یا تو بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ یا اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجتی رہتی۔ اور زینب یاں ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

اور پھر ایک دن انہیں مرتضیٰ نے آگھیرا تھا۔

''اماں! زینی شاہ میر کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس کے کردار پر بھی شبہ ہے۔ آپ اس کے مطابق لڑکا ڈھونڈیں۔ جس کے ساتھ وہ خوش رہ سکے۔'' وہ انہیں بہت رسان سے سمجھا رہا تھا۔

''میں لڑکا ڈھونڈ نے کہاں جاؤں۔ بس خاندان میں یہی ایک لڑکا اس کے جوڑ کا ہے۔ اور پھر اب تو بات پکی ہو گئی ہے۔ بس تم اس کے حق میں دعا کرو۔ اس دنیا میں ہمارے بعد وہ سب سے زیادہ تمہارے ہی قریب ہے۔ تم اسے کبھی بھی اکیلا پڑنے نہ دینا۔''

انہوں نے دیکھا کہ مارے ضبط کے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ جانے وہ ضبط کی کن کڑی منزلوں سے گزر رہا تھا۔

''اماں! میرے بس میں ہو تو میں دنیا کی ساری خوشیاں چرا کے زینی کی جھولی میں بھر دوں۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔'' اس نے چور چور لہجے میں کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

پھر زینی کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

مگر اس رات جب زینی نے صاف صاف اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کی شادی زبردستی کسی سے بھی کی گئی تو وہ زہر کھالے گی۔ تو وہ اسے محض دھمکی سمجھی تھیں۔

مگر پھر ایک دن وہ کالج گئی۔ تو لوٹ کے نہیں آئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا فرشتہ بیٹا بھی غائب تھا۔ وہ دونوں اپنی زندگی کی ساری پونجی لٹ جانے پر نیم مردہ پڑے تھے۔

دیور، دیورانی اور ان کے دونوں بیٹوں کے طعنے سن سن کر زندگی سے بالکل ہی بے زار ہو چکے تھے۔ وہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ان کو سناتے۔ جانے کن کے گناہوں کی پوٹ وہ گھر میں اٹھالائے تھے۔ اور اب ایسی ناجائز اولاد کے ساتھ ان کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ بھی بھاگتی۔ ان کے نزدیک اس کی سزا صرف موت تھی۔ مگر اب تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

ان کا دیور اور اس کے بیٹے انہیں جگہ جگہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اور وہ ذرا ذرا سے کھٹکے پر چونک اٹھتی تھیں کہ جانے کیا ہوا ہے۔ باہر ذرا سا شور ہوتا تو وہ کلیجہ تھام کے بیٹھ جاتیں، تب ہی انہیں ڈاک سے ان کے نکاح نامے کی کاپی موصول ہوئی تھی جسے چوہدری فرید نے بغیر پڑھے ہی پھاڑ دیا۔

''آہ! کب سورج نکلا۔ کب نصف النہار پر پہنچا۔ اور کب ڈھلنا شروع ہوا۔ انہیں کچھ پتا نہیں چلا بس پانی کے چند قطروں سے وہ اپنا حلق تر کرتی رہی تھیں۔ آتی جاتی سانسوں کے درمیان انہوں نے اس دن سورج کو ڈھلتے دیکھا اور شام کے سائے اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھے۔

شام ہوتے ہی ان کے گھر کو موت نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

ان کا دیور احسن اور ان کی دیورانی نزہت ان کو اپنے گھر لے جانے آپہنچے تھے۔

"بھابھی جی! آپ یہاں سے ہٹ جائیں۔ یہ مشکل وقت گزر جائے تو پھر آپ اور بھائی فرید اپنے گھر آجائیے گا۔" نزہت بولی۔

"نہیں، تم دونوں کو جو بھی کرنا ہے۔ میرے سامنے کرو۔ میں تمہارے گھر میں بیٹھ کر اس کے مرنے کا انتظار نہیں کرسکتی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی مروں گی۔"

وہ ایک عزم سے اٹھیں اور اس کے کمرے کے سامنے ڈٹ گئیں۔ جس میں ان کی دنیا تھی گھر میں شور بڑھتا جارہا تھا۔ لوگ صحن میں جمع ہورہے تھے۔ چھت پر چڑھ گئے تھے، اردگرد کی چھتوں پر بھی سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ وہ سب زینی کو رخصت کرنے آئے تھے۔

وہ پپو کی کوٹھڑی کے سامنے کھڑی تھیں۔ دنیا میں ایک بھی مددگار اور ہمدرد نظر نہیں آرہا تھا۔ تب انہوں نے عرش عظیم کے رب کے سامنے جھولی پھلادی۔

"میرے رب میں گناہ گار اور انتہائی بے بس تیرے سامنے جھولی پھیلائے کھڑی ہوں۔ ہم نے تیری قائم کی ہوئی حدیں توڑیں۔ ہم بیٹی کو بتانا بھول گئے کہ ٹھیک کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے شیطان کے راستے آسان کیے۔ مگر میرے رب ہم آدم کی اولاد ہیں جس کا پہلا گناہ تو نے اپنی رحمت سے معاف کردیا تھا۔ آج ہمارا گناہ بھی اپنی اسی شان کریمی سے بخش دے۔ وہ ننھی جان جو ابھی کل اس دنیا میں آئی ہے، اسے کس جرم میں قتل کیا جارہا ہے۔"

وہ جھولی پھیلائے بلک رہی تھیں۔ ان کی چادر ان کے آنسوؤں سے تر ہورہی تھی اور ان کی آہیں اللہ

شام ہوتے ہی ان کے گھر کو موت نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

ان کا دیور احسن اور ان کی دیورانی نزہت ان کو اپنے گھر لے جانے آپہنچے تھے۔

"بھابھی جی! آپ یہاں سے ہٹ جائیں۔ یہ مشکل وقت گزر جائے تو پھر آپ اور بھائی فرید اپنے گھر آجائیے گا۔" نزہت بولی۔

"نہیں، تم دونوں کو جو بھی کرنا ہے۔ میرے سامنے کرو۔ میں تمہارے گھر میں بیٹھ کر اس کے مرنے کا انتظار نہیں کرسکتی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی مروں گی۔"

وہ ایک عزم سے اٹھیں اور اس کے کمرے کے سامنے ڈٹ گئیں۔ جس میں ان کی دنیا تھی گھر میں شور بڑھتا جارہا تھا۔ لوگ صحن میں جمع ہورہے تھے۔ چھت پر چڑھ گئے تھے، اردگرد کی چھتوں پر بھی سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ وہ سب زینی کو رخصت کرنے آئے تھے۔

وہ پپو کی کوٹھڑی کے سامنے کھڑی تھیں۔ دنیا میں ایک بھی مددگار اور ہمدرد نظر نہیں آرہا تھا۔ تب انہوں نے عرش عظیم کے رب کے سامنے جھولی پھلادی۔

"میرے رب میں گناہ گار اور انتہائی بے بس تیرے سامنے جھولی پھیلائے کھڑی ہوں۔ ہم نے تیری قائم کی ہوئی حدیں توڑیں۔ ہم بیٹی کو بتانا بھول گئے کہ ٹھیک کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے شیطان کے راستے آسان کیے۔ مگر میرے رب ہم آدم کی اولاد ہیں جس کا پہلا گناہ تو نے اپنی رحمت سے معاف کردیا تھا۔ آج ہمارا گناہ بھی اپنی اسی شان کریمی سے بخش دے۔ وہ ننھی جان جو ابھی کل اس دنیا میں آئی ہے، اسے کس جرم میں قتل کیا جارہا ہے۔"

وہ جھولی پھیلائے بلک رہی تھیں۔ ان کی چادر ان کے آنسوؤں سے تر ہورہی تھی اور ان کی آہیں اللہ

آوازوں پر چھا گئی تھی۔

"تائی جی! سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ابا جی ان کو تو یہاں سے ہٹائیں۔"

شاہ میر گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے سر پر کھڑا تھا۔ اور گاؤں کے لوگ محض ان کے لحاظ میں دروازوں کو نہیں توڑ رہے تھے۔

شاہ میر ان کو دروازے کے آگے سے گھسیٹ رہا تھا۔ اور باقی لوگ شاید دروازے پر ٹوٹ پڑے تھے۔

تب ہی انہوں نے وہ آواز سنی۔ جس نے گویا پرصور اسرافیل پھونک دیا تھا۔ اور ہر کوئی اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟ اور یہ تم لوگ بھابھی کے ساتھ کیا کررہے ہو۔"

وہ زمین پر گھٹنوں کے بل پڑی تھیں۔ اور ان کے دونوں ہاتھ سختی سے شاہ میر نے تھام رکھے تھے۔ بیرسٹر خلیل جلدی سے آگے بڑھے اور انہیں اوپر اٹھایا۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ سب آنے والوں سے پوچھ رہے تھے۔

"پھوپھا جان! زینی واپس آگئی ہے۔" شاہ میر نے گویا دھماکا کیا۔ "اور اپنے ساتھ اس شخص کی اولاد بھی لائی ہے۔ جس کے باپ کا ہی پتا نہیں۔"

"تو بجائے پولیس کو بتانے کے یا کورٹ میں اس کے خلاف مقدمہ کرنے کے تم لوگ خود یہاں کیا کررہے ہو؟" وہ پھر اطمینان سے بولے۔

"پھوپھا جان! آپ اس کام میں دخل نہ دیں۔ یہ ہماری غیرت اور عزت کا سوال ہے۔ ہم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بعد میں کورٹ کچہری جائیں گے۔"

"مگر مجرم کو صفائی کا موقع دیے بغیر آپ کیسے اسے سزائے موت دے سکتے ہیں۔"

"بھابھی!" ارم ان کی نند انہیں سنبھالے کھڑی

کنٹرول کررہے تھے۔

انہوں نے لوگوں کو چھتوں سے ہٹایا۔ گھر کو لوگوں سے خالی کروایا۔ ان کے ساتھ ان کے گارڈ اور ان کا ڈرائیور بھی تھا۔

''آیئے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔ کس کس کی موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔''

وہ گھر کی بیٹھک کی طرف بڑھے۔ تو ان کے پیچھے پیچھے احسن، نزہت، شاہ میر، شاہ زیب اور وہ اور ارم بھی پہنچ گئے۔ اچانک دروازہ کھول کر چوہدری فرید کمرے میں آئے۔ ان کے چہرے پر گویا ہلدی ملی ہوئی تھی۔

''ہاں! تو احسن صاحب! بات آپ سے شروع کی جائے۔ یا شاہ میر سے یا بھائی فرید آپ کی عزت اور غیرت سے۔''

''آپ لوگ اپنی اپنی بات کرو۔ اس کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ اس گھر میں کتنے قتل ہوں گے۔'' بیرسٹر خلیل انتہائی متانت سے بولے۔

''خلیل صاحب!'' فرید صاحب ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھے۔ ''یہ سب کیا دھرا آپ کا ہے۔ میری زندگی کا سب سے برا دن وہ تھا جب زینب نے مردہ بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اسے اس بات کا علم ہو گیا۔ تو وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے گی اور آپ کہیں سے اس حرامی بچے کو لے آئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ اور اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے۔ بس یہ آج سے آپ کا ہوا۔''

''بس فرید بھائی! بس۔ ایک لفظ بھی اور نہیں۔ آپ نے اتنی بڑی گالی مرتضیٰ کو کیسے دے دی۔ جبکہ ایک مدت تک آپ اور آپ کی بیوی اسے سینے سے لگائے رہے۔ اگر میں نے اسے لا کر آپ کی جھولی میں ڈالا۔ تو کیا برا کیا۔ میں نے ایک ایسے وقت میں آپ کی مدد کی جب آپ کا گھر اجڑنے کے قریب تھا۔''

''بڑا بسایا آپ نے میرا گھر۔'' چوہدری فرید

''وہ آپ کا اپنا عمل تھا فرید بھائی! جس نے آپ کو یہ دن دکھایا۔ کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ لے پالک سگی اولاد نہیں ہوتی؟ کیا بالغ ہوتے ہی آپ نے اس کے گھر کے اندر آنے جانے پر اس پر پابندی لگا دی تھی؟ یا آپ نے زینی کے بالغ ہونے پر اس کا مرتضیٰ سے پردہ کروا دیا تھا۔ کیا تب اللہ نے اس بارے میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔'' بیرسٹر خلیل بولے۔

''تب تو دن رات مرتضیٰ مرتضیٰ ہوتا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو۔ گھر کا سب سے اچھا کمرہ اسے دیا ہوا تھا۔ زینی کے ہوتے ہوئے بھی پہلے کھانا مرتضیٰ کو ملتا تھا۔ آپ کے سامنے وہ ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرتے۔ زینی آپ کے سامنے اس کے پیچھے بھاگتی۔ وہ بے تکلفی سے زینی سے باتیں کرتا۔ اسے پڑھاتا۔ اسے کالج لینے اور چھوڑنے جاتا۔ میں نے بارہا آپ سے کہا۔ کہ اسے بتائیں۔ کہ وہ غیر ہے۔ وہ بڑا ہو گیا ہے، اس لیے وہ زینی سے دور رہے۔'' ارم بولی۔

''مگر بھابھی کو تو اس کے ننھے سے دل کے ٹوٹنے کا ڈر تھا بس اس کا دل جڑا رہے۔ باقی چاہے سب کے دل ٹوٹ جائیں۔'' ارم طنزیہ ہنسی۔

''وہ میرا بیٹا تھا۔ جب مجھے پتا چلا۔ کہ یہ کسی اور کی اولاد ہے۔ تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا ذہن اسے اپنا بچہ مان چکا تھا۔ اس وقت اس کی جدائی میرے لیے موت سے بدتر تھی۔ ہاں میں نے غلطی کی۔ میں نے اس کے جوان ہونے پر بھی اسے نامحرم نہیں سمجھا۔'' زینب روتے ہوئے بولیں۔

''اس نے اپنا آپ دکھا دیا۔ اس نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔ اس نے سال ڈیڑھ سال زینی کو اپنے پاس رکھا۔ اور پھر مرنے کے لیے ہمارے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ زینی کے بعد میں اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے کروں گا۔'' فرید صاحب جوش سے بولے۔

فرید بھائی! وہ زینیہ کو لے کر سیدھا میرے پاس آیا تھا۔ میں نے خود اپنے گھر میں دونوں کا نکاح کروایا۔ اس نکاح نامے کی کاپی اگلے دن آپ کو روانہ کردی مگر آپ نے اسے بغیر دیکھے ہی پھاڑ دیا ہوگا۔'' بیرسٹر خلیل بولے۔

''میں کسی نکاح کو نہیں مانتا۔ جو ولی کی رضا مندی کے بغیر ہو۔'' فرید صاحب غصے سے بولے۔

''اچھا تو آپ لوگ تھے جو ان دونوں کو چھپائے بیٹھے رہے، آپ کو ہماری عزت کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔''

احسن اور شاہ میر اکٹھے بول رہے تھے۔

''ہم یہاں ڈیڑھ سال سے لوگوں کے طعنے سہہ رہے ہیں ور آپ ان دونوں کو گود لیے بیٹھے ہیں۔'' شاہ زیب بولا۔

''مجھے تم بلکہ اپنی بھی عزت کی پروا تھی۔ جو میں نے ان دونوں کا فوراً نکاح کردیا۔ عزت کا تماشا تو تم لوگ خود بنا رہے ہو۔ جو گاؤں کے مسٹنڈوں کے ساتھ مل کر زینی اور اس کے بچے کو قتل کرنے چلے تھے۔

''فرید بھائی!'' وہ ان کی طرف مڑے۔

''آپ کو یہ تو خوب یاد رہا کہ ولی کی مرضی ضروری ہے۔ مگر شاہ میر کے ساتھ زبردستی کی شادی کرواتے وقت آپ یہ کیوں بھول گئے کہ ولی سے بھی پہلے لڑکی کی مرضی ضروری ہے۔ آپ جیتے جاگتے انسانوں سے وہ حقوق کس طرح لے سکتے ہیں۔ جو ان کے رب نے انہیں دیے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر دفعہ بچے ہی غلط ہوں۔ کبھی کبھی ہماری اپنی غلطیاں بھی اس سب کے ساتھ شامل ہوتی ہیں

اسلام میں اگر کسی برائی کی سزا دی گئی ہے۔ تو وہ سارے راستے بند کرنے کے بعد جس راستے سے وہ برائی معاشرے میں آسکتی تھی۔ مگر یہاں تو سارے راستے کھلے ہیں صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے ہم نے سزا کا ہتھوڑا اٹھا رکھا ہے۔'' بیرسٹر خلیل بولے۔

''میں مان بھی جاؤں کہ آپ نے ان کا نکاح کروادیا تھا مگر وہ حرامی جس کے باپ کا بھی پتا نہیں خلیل بھائی! آپ نے جتنی کالک ہمارے منہ پر تھوپنی تھوپ چکے، اب ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔'' احسن بولا۔

''آج ہم ثابت کردیں گے کہ ہماری غیرت اور عزت ہمیں ہر چیز سے پیاری ہے۔'' شاہ میر بولا۔

''آرام سے بھئی آرام سے۔ اور اب کوئی بھی مرتضیٰ کو گالی دینے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے زینی کے ولی کی حیثیت سے نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ اور مرتضیٰ تو آیا ہی میری وجہ سے تھا۔ اس لیے وہ بھی میری ہی ذمہ داری تھا۔ ہے کوئی اس کے مقابلے کا پورے خاندان میں؟'' وہ پورے سکون سے بولے۔

اس کی بوٹیاں کرنی ابھی باقی ہیں۔ وہ بھی ہم اپنے ہاتھوں سے کرکے چیل کوؤں کو کھلائیں گے۔'' شاہ میر اور شاہ زیب بولے۔

''اگر تم زینی اور اس کے بچے کے اقدام قتل سے بچ گئے فی الحال اپنی فکر کرو۔''

''آپ کو کوئی حق نہیں تھا کہ آپ کسی اور کی گندگی تایا جی کے منہ پر ملتے۔'' شاہ میر تلخی سے بولا۔

''اگر وہ تمہارے پاس تھا۔ تو اب وہ حرامی کہاں ہے؟'' احسن بھنکا۔

''احسن! آپ تو کم از کم اسے حرامی نہ کہیں۔'' ارم کو لگا جیسے وہ خفیف سا مسکرائے ہوں۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''کیوں میں کیا اس کے آوارہ ماں باپ کے نکاح میں شریک تھا؟'' احسن تپ گیا۔

''آرام سے بیٹھیں۔ ہوسکتا ہے۔ ایسا ہی ہوا ہو۔'' بیرسٹر خلیل پراسرار طریقے سے مسکرائے۔ اور بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھ لیا۔ بریف کیس کے اندر سے ایک سالوں پرانی تصویر نکلی۔ جو کسی کیمرے سے لی گئی تھی۔

''اس کو دیکھیں فرید بھائی اور احسن آپ بھی۔ اس کو آپ جانتے ہیں؟'' انہوں نے تصویر آگے بڑھائی۔

"ارے..... ارے یہ تو پھوپھی رابعہ کی فرزانہ ہے۔"

پھوپھی رابعہ ان کے والد کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ جنہوں نے بیوگی کے بعد ان کے گھر میں اپنی بیٹی سمیت کچھ وقت گزارا تھا۔ مگر بیٹی کے اچانک غائب ہوجانے کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکی۔

"ارے یہ تو اچانک غائب ہوگئی تھی۔ اس کو تم نے غائب کیا تھا۔" فرید صاحب احسن کی طرف مڑے۔

"نہیں پاء جی ایہہ چوٹھ اے۔ احسن پر آپ اتنی بڑی تہمت نہیں لگا سکتے۔" احسن کی بیوی احسن کی مدد کے لیے آئی۔

"کیوں تہمتیں لگانا صرف آپ کا حق ہے۔" زینب بولیں۔

"دیکھیں، میں کسی پر کوئی تہمت نہیں لگا رہا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ احسن نے اسے ورغلایا۔ اس سے نکاح بھی کرلیا۔ مگر جب وہ ماں بننے والی تھی۔ تو اسے ہسپتال میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ شہر کی کسی گلی میں ایک کمرے میں اسے رکھ کے یہ کبھی کبھار ادھر بھی چکر لگا آتا تھا۔"

"کدھر ہے نکاح نامہ؟ ہم کسی کہانی پر یقین نہیں کرتے۔" شاہ زیب اور شاہ میر بولے۔

"اسے پہچانتے ہو؟" انہوں نے نکاح نامہ احسن کے سامنے لہرایا۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملا۔" زینب نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جن دنوں آپ ہسپتال میں داخل تھیں۔ میں اپنے کسی کام کے سلسلے میں شہر آیا ہوا تھا۔ ارم نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ میں آپ کی بیمار پرسی کے لیے ہسپتال جاؤں۔ وہیں میں نے احسن کو فرزانہ کے ساتھ دیکھا۔ فرزانہ کے گھر سے بھاگنے کا قصہ ابھی اتنا پرانا نہیں ہوا تھا۔ یہ ہسپتال میں اسے داخل کروانے آیا تھا۔ میں اس کی نظروں میں آئے بغیر اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ یہ جب فرزانہ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ تو میں نے اس سے اصل حالات جاننے کی ٹھانی۔ تب اس نے مجھے اپنا نکاح نامہ دکھایا۔"

فرید صاحب نے نکاح نامہ احسن کی طرف بڑھایا۔

"تم جانتے ہو احسن! تم نے اس یتیم اور لاوارث لڑکی کا قتل کیا۔ تم اسے ہسپتال میں لاوارث چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہیں اس نے تمہارے بیٹے کو جنم دیا۔ اور لاوارثوں کی طرح مرگئی۔" بیرسٹر خلیل بولے۔

"وہ بچہ بھی جانے کہاں جاتا۔ کہ میں نے بروقت پہنچ کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور قدرت پہلے ہی اسے اپنے ہی گھر میں پالنے کا بندوبست کرچکی تھی۔ وہ بچہ میں نے فرید صاحب کی گود میں ڈال دیا۔" بیرسٹر خلیل نے بتایا۔

"لو جی ہن نے گل ای مک گئی۔" ارم ہنسی۔ فرید اور زینب آپ احسن کے بیٹے سے ہی زینی کو بیاہنا چاہتے تھے نا۔ تو میرے میاں صاحب نے وہ کام احسن طریقے سے کردیا ہے۔"

"مرتضیٰ تمہارا بیٹا ہے احسن؟" زینب بولیں "یہ وہ بچہ ہے جس کا سینہ طعنوں سے سب سے زیادہ تم نے چھلنی کیا ہے۔ اب کیا کہتے ہو۔ تمہاری غیرت اور عزت کے کیا کہنے۔ صرف ایک لمحے کے لیے سوچو کہ کیا غریبوں اور مجبوروں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ کیا ان میں غیرت نہیں ہوتی۔" زینب کو آج حساب برابر کرنے کا موقع ملا تھا۔

"مرتضیٰ کی رگوں میں آپ ہی کے باپ، دادا خون ہے۔ فرید صاحب! اس لیے میں نے اس کا نکاح زینی سے کیا تھا۔ اور احسن صاحب! وہ آپ کی ساری اولاد میں سب سے بہترین ہے۔" انہوں نے گنگ بیٹھے احسن کو آئینہ دکھایا۔

"چوہدری جی باہر پولیس آگئی ہے۔" ظفر مصلی بھاگتا ہوا آیا۔

"پولیس!" کمرے میں بیٹھے سارے نفوس

لے ہوں اڑ لے۔

''انہیں یہیں لے آؤ۔'' بیرسٹر خلیل اطمینان سے بولے۔ ''آپ لوگ اندر چلی جائیں۔'' انہوں نے خواتین سے کہا۔

پولیس کے آنے پر شاہ زیب اور شاہ میر کو ان کے ساتھ جانا پڑا۔

کیونکہ مرتضیٰ نے ان پر اپنی بیوی اور بچے کے اقدام قتل کا مقدمہ دائر کر دیا تھا۔

نزہت اور احسن جو فرید صاحب کے گھر کے اجڑنے کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ خود ہی تماشا بن چکے تھے۔

''مجھے میری بچی سے تو ملاؤ۔'' ارم بولی۔

☆☆☆

پچو کی کوٹھڑی میں جس حالت میں وہ اور اس کا بچہ پڑے تھے۔ اس نے سب کے دل چیر کر رکھ دیے۔

''میں اپنی بچی کو اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں جس کو ضرورت ہو، وہ آ کر مل جائے۔''

ارم نے کمبل میں ننھے وجود کو لپیٹا۔ اور زینی کو اٹھنے میں مدد دینے لگی۔

''ارم! خدا کے لیے یہ رات تو گھر میں گزار لو۔ میں نے تو ابھی اس کو دیکھا بھی نہیں۔'' زینب روتے ہوئے بولیں۔

''مگر اس کا باپ جو اتاولا ہوا بیٹھا ہے۔'' ارم تمہیں پتا ہے اتنے دنوں سے وہ نہ سویا ہے۔ اور نہ گھر آیا ہے۔ وہ یہیں کہیں قریب ہی ہے۔''

مرتضیٰ دائی کے گھر میں تھا اور پچو اس کو پل پل کی خبر دے رہی تھی۔ زینیا نے پچو کو سب بتا دیا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جب وہ باورچی خانے میں مہمانوں کے لیے کچھ بنانے گھسیں۔ اس وقت وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کر رہی تھیں۔ یوں جیسے کسی انسان کو دوزخ میں پھینکتے پھینکتے اچانک اسے جنت کی نوید دے دی گئی ہو۔

وہ کھانے سے فارغ ہوئیں۔ تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھیں۔ وضو کیا اور اللہ کے حضور جھک گئیں۔ آخر انہوں نے اس ہستی کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ جس سے انہوں نے چند کلیاں مانگی تھیں۔ اور اس نے سارا باغ ان کے حوالے کر دیا تھا۔

بے شک تقدیر بدلتی ہے، دعاؤں میں اثر ہے۔

ارم، زینی کو پچو کی کوٹھڑی سے نکال کر اس کے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اور صورت حال کے بدلنے سے زینی کا رنگ بھی لمحوں میں بدلا تھا۔ اور آج دن بھر وہ جی بھر سونا چاہتی تھی۔

گہری اور پرسکون نیند جس کے لیے وہ جانے کب سے ترس رہی تھی۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

قرۃ العین خرم ہاشمی

دریچۂ گلاب

مکمل ناول

وہ دروازے کی اوٹ میں ساکت کھڑی تھی۔ دو دروازے کی دوسری طرف دو افراد آمنے سامنے کھڑے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ جیسے آج کوئی فیصلہ کر کے رہیں گے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا فیصلہ تھا۔

جب ہمارے مستقبل کا فیصلہ، ہمارے ہاتھوں سے نکل کر کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلا جائے تو اس سے بڑی بدنصیبی اور مشکل کوئی نہیں ہوتی ہے۔ جیتا جاگتا وجود، دوسروں کے اشاروں پہ ناچنے والی کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ مگر زندگی کے تماشے میں اکثر کٹھ پتلی بننے کا فیصلہ ہم خود کرتے ہیں۔ جیسے کہ اس نے کیا تھا۔

وہ دونوں کے چہروں پر باری باری نگاہ ڈالتی اور خوف سے کانپ جاتی۔ اس کے آگے اندھیرا تھا اور پیچھے تنہائی کی گہری کھائی۔

جس میں زندہ اترنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ وہ زندگی جینا چاہتی تھی اس مرد کے ساتھ، جسے اس نے آنکھ کھلنے سے لے کر شعور کی پہلی منزل پر قدم رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنی زندگی میں وہ مرد کے نام پر صرف دو لوگوں سے ہی تو واقف تھی۔ ایک باپ اور دوسرا وہ مرد جو پوری شان سے سامنے کھڑا تھا۔ جس کی زندگی میں وہ پہلے آئی مگر اپنی جگہ نہیں بنا سکی تھی اور آج.....

پناہ گاہ سے باہر نکل کر بے خیالی میں ٹیرس پر چلی گئی۔ بارش کی تیز پھوار اسے بھگو رہی تھی مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز تھی۔ سنگ مرمر پر گرتی بارش کی بوندوں کو دیکھتے ہوئے وہ سرخ اینٹ پر ناچتی بارش کی بوندوں والے آنگن میں پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

''پھوپھو صدقے! میری گڑیا کا کیا حال ہو گیا ہے۔''

زینب نے چھ سالہ درنایاب کے کمزور چہرے اور گندے کپڑے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

''مٹی سے کھیل رہی تھی۔'' ذوالفقار نے مسکرا کر کہا تو زینب نے کٹیلی نگاہ بھائی کے مطمئن چہرے پر ڈالی تھی۔

زینب گاؤں سے آج صبح، اپنے بھائی ذوالفقار حیدر عرف ذلفی سے ملنے آئی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا حیدر بھی اس کے ساتھ تھا۔ حیدر کی عمر نو سال تھی مگر اچھے قد کاٹھ کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی لگتا تھا۔ حیدر نے بیزاری سے چاروں طرف نگاہ گھمائی۔ ماموں کے چھوٹے اور پرانے سے گھر میں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔

سامنے چارپائی پر، اس کی بھاری بھر کم ماں زینب، اپنے بھائی ذلفی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جبکہ زینب نے اپنی لاڈلی اور اکلوتی بھتیجی کو زور سے خود میں بھینچا ہوا تھا۔ جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپاتی ہے یا جیسے بلی بلونگڑے کو گردن سے پکڑ کر کلی کلی گھومتی ہے۔ اپنی مثال سوچ کر حیدر بے ساختہ مسکرا دیا۔

''بے بے!'' اچانک درنایاب کی نظر مسکراتے حیدر پر پڑی تو اس نے جلدی سے زینب کا بازو ہلاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ کیا۔ زینب نے تیز نگاہوں سے مسکراتے بیٹے کو گھورا تو حیدر گھبرا گیا۔

''میں تو ویسے ہی مسکرا رہا تھا۔''

حیدر نے جلدی سے وضاحت دی تو زینب حیدر فوراً سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ درنایاب نے فخریہ انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا مگر اب کی بار حیدر نے جواباً مسکرانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ زینب اپنی لاڈلی بھتیجی کی محبت میں، سب کے سامنے اس کی چھترول بھی کر سکتی تھی۔

''ذلفی! میں نے کتنی بار کہا کہ درنایاب کو لے کر مجھ سے ملنے چلے آؤ مگر تمہیں نئی زندگی کے جھمیلوں سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ اکلوتی بہن کی یاد آئے۔''

زینب نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تو باورچی خانے سے شربت کے گلاس لے کر نکلتی شبنم قہقہہ مار کر ہنس دی۔ زینب نے ناگواری سے بھی سنوری، شبنم کی طرف دیکھا تھا۔

''توبہ ہے بھئی! کسی کی خوشی بھی برداشت نہیں ہوتی۔'' شبنم نے زینب کو شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔ زینب نے بمشکل تھاما۔

شبنم، ذلفی کے پاس ہی چارپائی کے کونے پر اٹک کر بیٹھ گئی۔ شبنم کی بے باکی پر زینب پہلو بدل کر رہ گئی۔ زینب کی توجہ دوسری طرف دیکھ کر درنایاب فوراً وہاں سے کھسک گئی کیونکہ اسے اپنی سوتیلی ماں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے وہ سوتیلی ماں کا سامنا کم سے کم کرتی تھی۔ حیدر نے حیرت سے اسے اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا۔ وہ حیدر کے پاس آ کر اسے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔ حیدر سر ہلاتا اٹھا اور پھر وہ دونوں چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

شبنم نے طنزیہ نگاہ ان دونوں پر ڈالی تھی جبکہ زینب نے شکر ادا کیا کہ بچے یہاں سے چلے گئے ہیں۔ شبنم کو تو کسی آئے گئے کا لحاظ نہیں تھا۔ وہ اتنی ہی بے باک تھی۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ چھ مہینے کے اندر ہی درنایاب مرجھا کر رہ گئی ہے۔ نہ اس کی پہلے جیسی شکل رہی ہے اور نہ صحت۔''

جارحانہ ہو گئے تھے۔

''زینب باجی! شبنم تو بہت خیال رکھتی ہے درنایاب کا۔ بالکل سگی ماں کی طرح۔'' ذلفی نے جلدی سے اپنی بیوی کی طرف داری کی۔

''مگر میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے؟'' زینب نے تیکھے انداز میں کہا۔

''اچھا کس سے؟ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔۔'' شبنم نے غصے سے کہا تو زینب طنزیہ انداز میں مسکرا دی۔

''یہ چھوڑو! درنایاب کی حالت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔'' زینب نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ذلفی! آپ دیکھ رہے ہیں؟ آپ کے سامنے میری کتنی بے عزتی کی جا رہی ہے۔ کیا سچ میں درنایاب کے لیے میں نے کچھ نہیں کیا؟'' شبنم نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا ذلفی تڑپ گیا۔

''ایسا نہیں ہے شبو! زینب باجی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ذلفی! نجانے کب تک تمہاری آنکھوں پر دوسری بیوی کی محبت کی پٹی بندھی رہے گی۔ میری درنایاب کی قسمت میں ماں کی اچانک موت کا دکھ لکھا ہوا تھا۔ وہ بے چاری تو اچھا وقت گزار کے چلی گئی۔ پیچھے رہ گئی میری لاڈو!'' زینب نے رندھے لہجے میں کہا۔

''زینب باجی!'' ذلفی نے بہن سے کچھ کہنا چاہا جب زینب نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

''بس ذلفی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' زینب نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسا فیصلہ؟'' وہ دونوں چونکے۔

''تم اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش اور مگن ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں درنایاب کی

زینب نے کہا تو ذلفی حیرانی سے دیکھتا رہ گیا جبکہ شبنم کا چہرہ ایک لمحے کے لیے تاریک ہوا تھا۔

''مگر زینب باجی! یہ کیسے ممکن ہے؟ میں درنایاب کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔'' ذلفی نے حیرانی سے کہا۔

''ذلفی! بہت جلد تم دوسری بار باپ بننے والے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کے درمیان درنایاب کی شخصیت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے میں درنایاب کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں۔ گاؤں یہاں سے کون سا دور ہے۔ دو گھنٹے کا سفر ہے تمہارا جب دل کرے درنایاب سے ملنے آ جانا یا درنایاب تمہارے پاس رہنے آ جائے گی۔ درنایاب کے آنے سے میری بھی بیٹی کی کمی دور ہو جائے گی۔'' زینب نے نرم لہجے میں کہا تو ذلفی سوچ میں پڑ گیا۔

''سوچ میں زینب باجی! درنایاب کی ذمہ داری ساری زندگی بھی اٹھانی پڑ سکتی ہے۔'' اچانک شبنم نے کہا تو وہ دونوں چونک پڑے۔

''کیا مطلب؟'' زینب نے ناگواری سے سوال کیا۔

''مطلب صاف ہے۔ اگر آپ درنایاب کی ذمہ داری قبول کرنا چاہتی ہیں تو وعدہ کریں کہ دونوں بچوں کے بڑے ہوتے ہی ان کا نکاح کر دیں گی۔ تاکہ ہم بھی مطمئن رہیں کہ بچی کسی نامحرم کے ساتھ نہیں رہ رہی ہے۔ کیوں ذلفی؟''

شبنم نے کہا تو ذلفی نے فوراً سر ہلا دیا۔ ذلفی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ جبکہ شبنم جالاکی سے مسکرا دی۔ وہ زینب کو پریشان دیکھنا چاہتی تھی مگر زینب کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے بھی پریشانی نہیں چھائی تھی۔

''سو بسم اللہ۔ مجھے منظور ہے۔ وقت آنے پہ ایسا ہی ہوگا۔'' زینب نے خوشی سے کہا تو شبنم کا چہرہ بجھ گیا۔

پھوپھو کے گھر ہمیشہ خوش وخرم رہے گی۔'' ذلفی نے خوشی سے کہا تو زینب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونوں بہن بھائی کو باتوں میں مگن دیکھ کر شبنم وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

''اونہہ! بڑی آئی درنایاب کی ذمہ داری اٹھانے والی۔''

شبنم نے اپنے دل کی جلن پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ شرط صرف زینب کو پریشان کرنے کے لیے رکھی تھی مگر زینب نے فوراً ہی اسے مان کر شبنم کو دھچکا پہنچایا تھا۔

''ویسے اچھا ہی ہے کہ درنایاب یہاں سے چلی جائے گی۔ میرے ہونے والے بچے کی حق تلفی تو نہیں ہوگی۔''

شبنم نے خود کو بہلاتے ہوئے سوچا۔

ذلفی سے اس کی شادی کو چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ ذلفی کی پہلی بیوی زرقا، شادی کے سات سال بعد کینسر کی وجہ سے مر گئی تھی۔ درنایاب اس وقت پانچ سال کی تھی۔ ماں کی اچانک جدائی سے وہ بجھ کر رہ گئی۔ ذلفی نے درنایاب کو بہلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا پوری طرح خیال رکھا مگر ایک عورت کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ درنایاب کا زیادہ وقت زینب کے پاس گاؤں میں گزرتا یا زینب کا شہر میں ذلفی کے گھر۔ مگر ایسا کب تک چلتا۔

بالآخر سب کے سمجھانے پر ذلفی نے ایک سال بعد اپنی پسند سے دوسری شادی کر لی۔ شبنم ذلفی کے دوست کی سالی تھی۔ جس کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔

زینب، بھائی کی شادی شبنم سے کرنے پر راضی نہیں تھی مگر ذلفی شبنم کی اداؤں پر مر مٹا تھا۔

شادی کے بعد شبنم روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ زینب کی ایک جاننے والی، اسی محلے میں رہتی تھی جس سے زینب کو ذلفی کے گھر کی سب خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اسی سے زینب کو پتا چلا کہ شبنم کا سلوک برداشت کرتی رہی۔ درنایاب اپنے گھر تو کم ہی رہتی تھی۔ وہ اکثر ضد کر کے زینب کے پاس گاؤں آجاتی۔ جہاں اس سے شہزادی کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔ درنایاب کو گاؤں سے شہر جاتے ہوئے ہمیشہ دکھ ہوتا تھا۔

درنایاب کی اداسی اور شبنم کے برے سلوک کے بارے میں سن کر زینب نے اپنے شوہر محمود علی سے بات کی اور اس کی رضامندی کے بعد درنایاب کو لینے پہنچ گئی۔ زینب گاؤں میں رہتی تھی جبکہ ذلفی قریبی شہر میں رہتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح کے ناشتے کے بعد زینب شہر سے گاؤں جانے کے لیے نکلی تو حیدر کے علاوہ، درنایاب بھی اس کے ساتھ تھی۔ ذلفی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اداس تھا مگر ذلفی کو یقین تھا کہ کچھ دنوں کے بعد درنایاب کا دل خود ہی گاؤں کے ماحول سے بھر جائے گا، تب وہ اسے جا کر واپس لے آئے گا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی ہی تھی۔

درنایاب اس دن شہر سے گاؤں کا سفر کرتے ہوئے، بہت خوش تھی۔ یہ چھوٹا سا سفر اس کی زندگی بدلنے والا تھا۔

☆☆☆

''بے بے! آپ ہمیشہ درنایاب کی ناجائز طرف داری کرتی ہیں۔''

حیدر نے جب درنایاب کا رزلٹ کارڈ دیکھا تو غصے سے اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے پچھلے کچھ مہینوں میں، درنایاب پر بہت محنت کی تھی۔

اپنی پڑھائی کے مشکل شیڈول میں سے وقت نکال کر اسے پڑھاتا، اس کی مدد کرتا، مگر جب میٹرک کا نتیجہ آیا تو وہ حیدر کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔ حیدر، درنایاب پر غصہ ہونے لگا مگر ہمیشہ کی طرح زینب اس کی مدد کو آئی۔ اب زینب اسے سینے لگائے بیٹھی ہوئی تھی جبکہ حیدر صحن میں ادھر سے اُدھر چکر

لگاتا ہوا مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

"حیدر! اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟ درنایاب نے پڑھ لکھ کر آخر کرنا بھی کیا ہے؟ یہ بھی تمہاری ضد تھی کہ درنایاب کم از کم میٹرک تو ضرور کرے، ورنہ میں نے تو درنایاب کو سرے سے اسکول بھیجنا ہی نہیں تھا۔" زینب نے درنایاب کو اور زور سے بھینچ لیا تھا۔

"بے بے! زمانے کو دیکھیں۔ آپ گاؤں کے اس چھوٹے سے گھر میں بیٹھ کر سمجھتی ہیں کہ یہ ہی دنیا ہے۔ بے بے دنیا کی نظروں میں ہم کنویں کے مینڈک ہیں۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔" حیدر جھنجلا کر بولا۔

"آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

درنایاب کافی دیر سے تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ایک دم سے بے بے کی گود سے نکلی اور دونوں بازوؤں کی آستین چڑھاتے ہوئے حیدر کی طرف بڑھی۔ حیدر نے ناگواری سے اس کے انداز کو دیکھا تھا۔

"میں کب سے سن رہی ہوں۔ بے بے یہ، بے بے وہ..... بھئی میری مرضی ہے پڑھوں یا نہیں۔ تم کون ہوتے ہو مجھے یہ سب بتانے والے۔"

درنایاب نے ہمیشہ کی طرح تنک کر کہا تو حیدر نے ماں کی طرف جتاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ زینب ہمیشہ کی طرح کمی کمی کرتے ہوئے درنایاب کو شہ دینے لگی۔

"جب دیکھو، شہر میں یہ ہوتا ہے، شہر کے لوگ ایسے، شہر کے لوگ ویسے۔ میں شہر کے لوگوں کو کیا سمجھتی ہوں؟ میں تو خود شہر چھوڑ کر گاؤں آ کر رہ رہی ہوں۔ مت بھولو کہ میرا باپ بھی اسی شہر میں رہتا ہے۔"

درنایاب نے فخر سے اپنی نازک گردن اٹھا کر کہا تو زینب نے بے اختیار لاڈلی بھتیجی کی بلائیں لی تھیں۔

"درنایاب بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میری شہزادی جیسا کوئی ہے بھلا۔ تم اپنے شہر اور تعلیم کا رعب ہم پہ مت جھاڑا کرو۔" زینب نے فوراً کہا

درنایاب نے فاتحانہ انداز میں حیدر کی طرف دیکھا۔ حیدر نے صحن کے وسط میں کھڑی درنایاب کو دیکھا اور پھر اس کے پیچھے پیپل کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھی اپنی ماں کو۔ جس کی ساری ممتا، ساری محبت، صرف درنایاب کے لیے تھی۔

"درنایاب! ایک وقت آئے گا، جب تم میری بات کو تسلیم کرو گی مگر افسوس تمہارا تسلیم کرنا، تمہارے نقصان کو کم نہیں کر سکے گا۔"

حیدر نے سخت لہجے میں کہا تو درنایاب اونچی آواز میں روتے ہوئے زینب کی طرف پلٹی۔

"بے بے دیکھا آپ نے۔ کس طرح مجھے کوس رہا ہے۔ بد دعائیں دے رہا ہے آپ کی درنایاب کو۔"

درنایاب کہتے ہوئے زینب کی گود میں چھپ گئی۔ حیدر کے لیے مزید یہ ڈراما برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ غصے میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پہ چلا گیا۔ جب تک نیچے رہتا، بے بے اور درنایاب نے کوئی نہ کوئی تماشا لگائے رکھنا تھا۔

حیدر چھت پر رکھی چارپائی پر لیٹ کر آسمان کو گھورنے لگا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ درنایاب کے برے رویے اور ہر بدتمیزی پر حیدر کو رہ رہ کر وہ دن یاد آتا تھا، جب بے بے اپنی محبت سے مجبور ہو کر سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے درنایاب کو اپنے ساتھ گاؤں لے آئی تھیں۔

"بے بے! کاش آپ جانتیں کہ درنایاب کو گھر لا کر آپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی ہے۔" حیدر نے دل گرفتی سے سوچا۔

زینب، درنایاب کو اپنے پاس لا کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ درنایاب کی پرورش ناز و نخرے سے کرنے لگی۔ درنایاب جو بچپن سے تیز اور چالاک تھی۔ وہ زینب کی محبت کو حق سمجھ کر وصول کرنے لگی۔ محمود علی بھی درنایاب کو بیٹی کی طرح سمجھتا تھا۔ صرف حیدر تھا جسے درنایاب کا گاؤں آنا پسند نہیں آیا تھا۔

درنایاب کی وجہ سے حیدر نہیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔ درنایاب کو گاؤں میں موجود لڑکیوں کے واحد اسکول میں داخل کروا دیا گیا مگر اس کی توجہ پڑھائی سے زیادہ کھیل کود میں لگی تھی۔

جب بھی پڑھائی کا زور ہوتا، درنایاب بہانے سے بیمار پڑ جاتی یا اسے باپ کی یاد آ جاتی اور وہ کچھ دن شہر رہنے چلی جاتی۔ وہاں جا کر شبنم سے بھی اس کی نہیں بنتی تھی۔ اس لیے درنایاب گاؤں واپس لوٹ آتی۔

حیدر نے میٹرک کے بعد شہر کے کالج میں داخلہ لیا اور ہوسٹل میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ جب حیدر نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس نے پارٹ ٹائم ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھی جس سے وہ اپنے اخراجات آسانی سے پورے کر لیتا تھا۔

حیدر نے تھک کر گہری سانس لی اور چارپائی پر دوسری طرف کروٹ لے کر منڈیر پر رکھے پانی اور دانے کے خالی برتنوں کو دیکھنے لگا۔ حیدر کا نرم دل، پرندوں کی بھوک اور پیاس کا خیال کر کے تڑپ اٹھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پھر دونوں برتن بھر کر مطمئن ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد بھرے ہوئے برتنوں پر پرندے اڑ کر آنے لگے۔ حیدر کچھ دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"اگر روحانی طور پر سکون اور خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنا ڈالا ہوا دانہ یا پانی چرند پرند کو کھاتے ہوئے دیکھیں۔ اس لمحے آپ طمانیت کے اس مقام پر کھڑے ہوتے ہیں، جو عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔"

حیدر کو اس چھوٹے سے لمحے میں ادراک ہوا۔ اس کے ذہن پر چھایا کئی دنوں کا بوجھ جیسے ایک دم سرک گیا تھا۔

مگر حیدر کا یہ اطمینان اگلے دن ایک دھماکے سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ بالکل اس کے خوابوں کی طرح۔

☆☆☆

حیدر پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس ماں کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔ زینب نے صحن کے ساتھ ملحق باڑے میں بندھی بھینس کو چارہ ڈالتے ہوئے ایک حیران و پریشان نظر بیٹے پر ڈالی۔

"حیدر! اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ یہ سب تو بچپن سے طے تھا۔" زینب نے اطمینان سے کہا۔

"کس نے طے کیا اور کیوں؟ میں آپ کے باڑے میں بندھا کوئی بے زبان جانور نہیں ہوں بے بے! ـــــ ایک جیتا، جاگتا انسان ہوں۔ جس کے کچھ خواب ہیں، کچھ امیدیں ہیں۔ میں کیسے ایک جاہل، ان پڑھ لڑکی سے شادی کر لوں؟"

حیدر کی آواز غصے میں بلند ہو گئی۔ زینب نے حیرانی سے جوان بیٹے کی طرف دیکھا۔ جو بے چینی سے اٹھ کر صحن کے چکر کاٹنے لگا تھا۔ جیسے اس کے پاؤں بے چینی کے بھنور میں پھنس گئے ہوں۔

"حیدر! آج سے پہلے تم نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔"

زینب نے پاس آ کر مدھم لہجے میں کہا۔ حیدر نے چونک کر ماں کے غمگین چہرے اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں کی طرف دیکھا۔

"بے بے!" اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے تڑپ کر ماں کے کھردرے اور مشقت زدہ ہاتھوں کو تھاما تھا۔ وہ ماں کو تھام کر قریبی پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"بے بے! آپ نے بھی آج سے پہلے اتنی دل دکھانے والی بات نہیں کی تھی۔" حیدر نے بے بسی سے کہا۔

"حیدر! میں جانتی ہوں کہ درنایاب کے لیے میری محبت، تمہیں کبھی کبھی بہت تکلیف دیتی ہے۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

زینب نے سسکتے ہوئے کہا تو حیدر نے ماں کا سر سینے سے لگا لیا۔ اسے ماں کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ اس سے تو اپنی ماں کا رونا تب بھی

برداشت نہیں ہوتا تھا جب وہ ابا کے ہم میں روتی تھی۔ اب تو بات ہی دوسری تھی۔

"حیدر! درنایاب کو اپنے پاس لاتے ہوئے میں نے اپنے بھائی سے ایک وعدہ کیا تھا کہ میں اسے اپنی بہو بناؤں گی۔ تمہارے جنت مکین باپ کو بھی میرے فیصلے پر کبھی اعتراض نہیں ہوا بلکہ انھوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ زندگی نے انھیں مہلت ہی نہیں دی ورنہ وہ اس وعدے کو خود پورا کرتے۔ ذلفی کچھ دنوں تک درنایاب کو واپس لے جانے کے لیے آ رہا ہے۔ حیدر! میں درنایاب کے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں اور بغیر کسی رشتے کے درنایاب اب ہمارے پاس نہیں رہ سکتی ہے۔"

زینب کہتے ہوئے بلک بلک کر رو پڑی۔ حیدر کو بھی اپنے مرحوم باپ کی یاد شدت سے آ رہی تھی جو پانچ سال پہلے دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے تھے۔ کچھ دیر زینب روتی رہی۔ پھر آنسو پونچھتی حیدر سے تھوڑی دور ہٹی۔

"حیدر! درنایاب کو بہو بنانے کی خواہش اگر صرف میری ہوتی تو شاید میں اپنے دل کو سمجھا لیتی مگر تمہارے مرحوم باپ کی بھی یہ خواہش تھی مگر ہوگا وہی جو تم چاہو گے۔ میرا کیا ہے۔ چند سال اور جی لوں گی۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہارے سب خوابوں کو پورا کرے۔"

زینب نے دل سے بیٹے کو دعا دی اور دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتی، باقی رہ جانے والے کام نمٹانے لگی۔ حیدر کچھ دیر تک ماں کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے اٹھ کر گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو سامنے سے آتی درنایاب سے ٹکراتے ہوئے بچا۔

"کیا اندھی ہو؟" حیدر نے غصے سے کہا۔

درنایاب نے اسے گھورا۔ جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"یہ سوال میرا بھی ہے۔ راستے سے ہٹو۔"

درنایاب نے ایک ادا سے اپنا ہاتھ اٹھا کر، بارعب انداز میں کہا تو حیدر نے غصے میں اس کی کلائی پکڑ لی۔

"حیدر! درنایاب تنگ ہو رہی ہے۔"

"دوبارہ مجھ سے اس انداز میں بات کی تو....."

حیدر نے غصے میں اس کا ہاتھ جھٹکا اور اسے ایک طرف کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ درنایاب نے حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اونچی آواز میں روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

"بے بے!"

درنایاب نے اپنی ہمدرد کو پکارا اور ہمیشہ کی طرح ان کی گود میں سر چھپا کر، حیدر کی شکایت لگانے لگی۔ اپنی دھن میں بولتی درنایاب کو احساس ہی نہیں ہوا کہ آج بے بے بہت خاموش اور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

☆☆☆

الجھے ہوئے ذہن اور بکھرے وجود کے ساتھ، گاؤں میں ادھر اُدھر پھرتا حیدر تھک ہار کر نہر کنارے آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت نہر میں نہانے والے بچوں اور لڑکوں کا رش لگا ہوا تھا۔ گرمی میں نہر میں نہانا، گاؤں کے لوگوں کا من پسند مشغلہ تھا۔ حیدر کچھ دور موجود گھنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔ بچوں کو پانی کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر نجانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اسے اپنا باپ شدت سے یاد آیا تھا۔ پانی میں اٹھنے والے ہر شور، ہر آواز میں اس کا بیتا ماضی بستا تھا۔ کبھی وہ بھی اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر نہر کنارے آتا اور اسی طرح اٹکھیلیاں کرتا، باپ کے ساتھ ہنستا تھا۔ حیدر کا باپ، پانی سے کھیلتے حیدر کا دھیان اس طرح رکھتا کہ جیسے وہ کاغذ کی نازک کشتی ہو جو زیادہ پانی یا بے دھیانی میں ڈوب جائے گی۔

"باپ کے بغیر، زندگی کے سمندر میں، ہمارا وجود کاغذ کی کشتی بن کر تو رہ جاتا ہے۔ باپ سر پر نہ ہو تو گہرے پانی میں ڈوبنے کا خطرہ قدم قدم پر رہتا ہے۔" حیدر نے اداسی سے سوچا۔

پھر اس کے ذہن کے پردے پہ اپنی ماں کا چہرہ

ٹھہرایا تھا۔ وہ تصور کی آنکھ سے ماں کو درنایاب کے لاڈ اٹھاتے، ہنستے دیکھ رہا تھا۔ تصور میں ایک بچہ بھی کسی کونے میں موجود تھا جو اپنے پیار کو کسی اور پہ نچھاور ہوتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ حیدر نے گہری سانس لی اور آس پاس دیکھا۔ شام ہوتے ہی رش کم ہونے لگا تھا اور اب نہر کے کنارے خاموشی چھا گئی تھی۔ حیدر غائب دماغی سے پتھر اٹھا کر پانی میں پھینکنے لگا۔ کافی دیر ایسے ہی گزر گئی۔

"بے بے! ہر انسان کی ایک کمزوری ہوتی ہے اور میری کمزوری آپ ہیں۔" حیدر نے تھک ہار کر اعتراف کیا تھا۔

ماں کی خوشی کا سوچتے ہی اس کا دماغ کافی حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ سورج کے غروب ہونے تک حیدر وہیں بیٹھا، پانی میں گھل جانے والے سونے کو دیکھتا رہا۔

سورج نے ڈوبتے وقت، جس طرح پانی کو اپنے رنگ سے رنگا تھا، ایک امید، ایک خیال نے اسے بھی راستہ دکھا دیا تھا۔

حیدر وہاں سے اٹھا تو ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"بے بے!"

درنایاب درخت کے نیچے رکھی چارپائی پر، زینب کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ زینب بہت پیار سے درنایاب کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ درنایاب درخت پر پھدکتی چڑیوں کو دیکھتے ہوئے بے بے کی آواز میں لوک گیت سنتے ہوئے کسی اور جہاں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بے بے جب رکی تو درنایاب نے کھوئے ہوئے لہجے میں پکارا تھا۔

"بول بے بے کی جان!" زینب نے جھک کر اس کی کشادہ پیشانی کو چوما۔ آج صبح سے بے بے کا موڈ بہت اچھا تھا۔ انہوں نے آج خاص طور پر گڑ والے چاول بنا کر بچوں میں بانٹے تھے۔

"بے بے! حیدر سچ میں مان گیا؟" درنایاب نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ہاں! صبح فجر کے وقت میرے پاس آیا تھا۔ میرے پاؤں چوم کر کہا کہ بے بے جیسا آپ کا حکم۔" زینب نے فخریہ انداز میں کہا۔

"بے بے۔" درنایاب جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مگر کل تو وہ بہت غصے میں تھا۔" وہ درزن کے پاس اپنا نیا سوٹ سلوانے گئی تھی جب واپسی پہ حیدر سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"ہاں! پہلے تو بہت غصہ کیا مگر پھر....." بے بے نے گہری سانس لی۔ درنایاب حیرانی سے ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"درنایاب! میرا بیٹا، رشتوں اور عہد کو نبھانے والا ہے۔ کہتا ہے کہ میں بھی اپنے باپ کی طرح ہوں بے بے! آپ کو دکھ نہیں دے سکتا۔"

بے بے کہتے ہوئے ایک دم رو پڑی۔ درنایاب نے فوراً انھیں گلے سے لگا کر دلاسا دیا۔

"میرا حیدر اپنے باپ کی طرح ہے۔ اس کے باپ نے بھی کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیے تھے، میری ہر خواہش پر ہنس کر عمل کرتا تھا۔ درنایاب! حیدر بھی اسی باپ کا خون ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ ایسا ہیرا تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔"

زینب نے خود کو سنبھالتے ہوئے، پیچھے ہٹ کر درنایاب سے کہا تو درنایاب اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"پرسوں تیرا ابا تجھے لینے آ رہا ہے۔ اب شادی تک تو اپنے باپ کے پاس رہے گی۔ بہت جلد میں چاند کی کوئی تاریخ رکھ کر تجھے اپنے حیدر کی دلہن بنا کر ہمیشہ کے لیے لے آؤں گی۔" زینب نے پیار سے کہا تو درنایاب نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

"تم نے ساری زندگی اپنی بہن کی مانی ہے۔"

دوپٹہ سر پر باندھے، کمر پر ہاتھ رکھے، بکھرے حلیے کے ساتھ شبنم صحن کے وسط میں کھڑی ہاتھ نچا نچا

ہی تھا۔ شبنم نے پھینکنے والے انداز میں شوہر کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھی اور اب غصے میں بولتی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ ذلفی کی ساری توجہ موٹی اور کچی پکی روٹی اور بدذائقہ سالن کی طرف تھی۔

''پتا نہیں شبنم کو ٹھیک سے روٹی بنانا کب آئے گی۔''

ذلفی نے بے دلی سے سوچا اور کھانے کی ٹرے پیچھے کر دی۔ اس کے ذہن کے پردے پر اکثر درنایاب کی ماں کے ساتھ گزرا وقت لہرانے لگتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ درنایاب کی ماں نے بیوی ہونے کا جو سکھ اسے دیا، وہ شبنم اتنے سال گزر جانے کے باوجود نہیں دے سکی تھی۔ کھانے کے بعد ذلفی نے درنایاب کی شادی کی بات چھیڑی تو شبنم حسب معمول جاہلوں کی طرح بولتی، اس سے لڑنے لگی۔ درنایاب اس کے چار بچوں کے ساتھ چھت پر تھی۔ اس لیے شبنم بے فکر ہو کر زہر اگل رہی تھی۔

''بہن کی بات مانی یا تمہاری بات رکھی؟'' ذلفی نے طنزیہ انداز میں کہا تو شبنم غصے سے اسے گھورنے لگی۔

''اپنا ہی فائدہ سوچا تھا۔'' شبنم نے طنزیہ انداز میں کہا تو ذلفی اداسی بھری گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''سوچا تو بہت کچھ تھا مگر شبنم! تم میری سوچ کے مطابق نہیں نکلیں۔''

ذلفی نے سر جھکا کر کہا۔ ذلفی کی بات سن کر شبنم کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

''دھوکا تو میرے ساتھ ہوا۔ شادی شدہ، ایک بچی کا باپ مجھے ملا۔ ساری زندگی غربت میں گزار دی۔ اپنی جوانی تمہارے گھر اور چار بچوں کو دے دی مگر بدلے میں کیا ملا؟''

شبنم چیخنے چلانے لگی۔ ذلفی خاموش رہا۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے شبنم کے جاہلانہ طرز عمل کے سامنے چپ کی چادر تان لیتا۔ شبنم خود ہی بول کر کے کاموں میں اتنی ہی پھوہڑ اور ہڈحرام واقع ہوئی تھی۔

اپنے چاروں بچوں کی حالت زار دیکھ کر ذلفی دل میں شکر ادا کرتا کہ زینب، درنایاب کو اپنے ساتھ لے گئی تھی ورنہ شاید درنایاب کی حالت قابل رحم ہوتی۔

شبنم نے بچوں کی پرورش میں کبھی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس کے بچے گلی محلے میں پل کر بڑے ہو رہے تھے۔ ان کی عادتیں، باتیں، جاہلوں جیسی تھیں۔ دونوں بڑے بیٹے اسکول گندے حلیے میں جاتے، بات بات پہ جھوٹ، چوری، لڑنا، جھگڑنا ان کی عادت بن گیا تھا۔ ذلفی جو پہلے پہل دو بیٹوں کے ہونے پہ خوش ہوتا، اب ان کی حرکتیں دیکھ کر دل مسوس کے رہ جاتا۔ بڑے دو بیٹوں کے بعد، دو بیٹیاں تھیں۔ جو ابھی چھوٹی تھیں۔ بچوں کی عمریں بالترتیب گیارہ سال سے سات سال کے درمیان تھیں۔

''میں صاف کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے اب گھر کے کام نہیں ہوتے۔ درنایاب کو کچھ عرصہ گھر میں بٹھاؤ تاکہ مجھے بھی کچھ سکھ ملے۔''

شبنم نے حکم صادر کیا اور پھر غصے سے پیر پٹختی کمرے میں چلی گئی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی درنایاب کے کانوں میں شبنم کے لفظ اترے تو وہ زہر خند انداز میں مسکرا دی۔

''سکھ اور مجھ سے۔ بڑی دور کی سوچی اماں جان!''

اس نے دل ہی دل میں ایک عہد کیا اور مسکرا کر گم صم بیٹھے باپ کی طرف بڑھ گئی۔

''ابا! آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔''

اس نے محبت سے باپ سے کہا اور پھر جواب سنے بغیر باپ کے پیر دبانے لگی۔ ذلفی خاموشی سے بیٹی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ درنایاب بالکل اپنی ماں جیسی تھی۔ خوش شکل اور چہرے پر معصومیت۔

درنایاب ٹانگیں دباتے ہوئے باپ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا دھیان بٹا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ذلفی، شبنم سے ہوئی بحث بھول کر درنایاب سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے کئی بار شبنم نے جلے دل سے یہ نظارہ دیکھا تھا۔

☆☆☆

''حیدر! تم کچھ بول کیوں نہیں رہے؟'' زینب نے جھنجھلا کر بیٹے سے کہا جو ماں کے ہاتھ کی بنی کھیر مزے سے کھاتے ہوئے اردگرد سے بے نیاز تھا

''بے بے! کیا بولوں؟ آپ جانیں اور آپ کا بھائی۔''

حیدر نے لاپروائی سے کہا۔ درنایاب کو باپ کے گھر گئے ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ زینب نے اس دوران بری تیار کر لی تھی۔ اب وہ ذلفی سے شادی کی تاریخ لینا چاہ رہی تھی مگر ذلفی ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ یہ بات زینب کو پریشان کر رہی تھی۔ اس لیے جب حیدر شہر سے گاؤں چھٹی پر آیا تو زینب نے اسے ساری بات بتائی۔ حیدر جوان پانچ مہینوں میں درنایاب کے گھر سے جانے پہ خوش تھا اور ماں کی توجہ اور پیار کو اکیلے سمیٹ رہا تھا۔ اسے فی الحال درنایاب کے واپس آنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''ذلفی تو بیوی کا غلام ہے۔ جو شبنم کہے گی، وہ ہی کرے گا۔'' زینب نے منہ بنا کر کہا تو حیدر مسکرا دیا۔

''سوچیں! اگر آپ کا حیدر بھی بیوی کا غلام بن جائے تو؟'' حیدر نے شرارت سے کہا۔

''خدا نہ کرے۔ میرا حیدر ایسا نہیں۔'' زینب نے دہل کر کہا۔ حیدر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''بے بے! بیٹا ایسا نہیں مگر بہو ویسی ضرور ہو سکتی ہے۔'' حیدر مسلسل ماں کو تنگ کر رہا تھا۔

''میری درنایاب ایسی نہیں۔ وہ سمجھ۔ ج.....ج.....'' زینب کہتے ہوئے ہچکچائی۔

''بے بے! وہ سمجھ دار نہیں ہے۔ دیکھا آپ بھی جانتی ہیں۔'' حیدر نے نرمی سے کہا۔

''اف حیدر! تم مجھے کن باتوں میں الجھا رہے ہو۔ تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔'' زینب نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو حیدر کندھے اچکا کر کھیر کی پیالی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شکر ہے درنایاب یہاں نہیں ورنہ کھیر اور آپ کی محبت اس سے بانٹنی پڑتی۔'' حیدر نے کھیر کی پیالی کو دیکھتے ہوئے کہا تو زینب بے ساختہ مسکرانے لگی۔

''ندیدے ہو تم!'' زینب نے پیار سے بیٹے کے سر پر چپت لگائی۔

''بے بے! صرف آپ کی محبت کا!'' حیدر نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا تو زینب دل سے مسکرا کر محبت بھری نگاہوں سے اپنے سعادت مند بیٹے کو دیکھنے لگی۔

''جیتے رہو۔'' زینب نے حیدر کی کشادہ پیشانی پہ پیار کیا اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

''اسد! چلو جلدی سے کوک لے کر آؤ۔'' درنایاب نے لال نوٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ابھی لایا۔'' اسد اور عبداللہ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بھاگے تھے۔ درنایاب کافی دیر سے کچن میں گھسی ہوئی تھی۔ جب وہ باہر نکلی تو چاروں بچوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ درنایاب نے سبزی کی ٹوکری میں رکھے سارے آلوؤں کو کاٹ کر فنگر چپس بنا لیے تھے۔ جو چاروں بچوں کو بہت پسند تھے مگر شبنم ہر معاملے میں کنجوسی سے کام لیتی۔ بھلے آلو گل سڑ جائیں، وہ بچوں کو کچھ نہیں بنا کر دیتی۔

پانچ منٹ میں دونوں بھائی گلی کے کونے میں موجود دکان سے کوک کی ڈیڑھ لیٹر کی بوتل لے آئے تھے۔ شبنم آج دوپہر سے محلے کے راؤنڈ پر نکلی ہوئی تھی۔ اس لیے درنایاب اور بچے گھر میں آزادی سے ہنس بول رہے تھے۔ وہ چاروں صحن میں دسترخوان بچھا کر بیٹھ گئے۔ چپس کی ڈش درمیان میں رکھی۔

کھاتے ہوئے وہ ہنس بول رہے تھے۔

جس وقت شبنم نے گھر میں قدم رکھا، تھوڑے سے چپس ڈش میں باقی بچے تھے۔ شبنم نے ان پر نظر ڈالی تو اسے سکتہ ہی ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔ کچن کی حالت دیکھتے ہی اسے چکر آ گیا۔ شبنم کام چور اور بدحرام ضرور تھی مگر اس وقت جو حالت باورچی خانے کی ہو رہی تھی، اس کا شبنم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آلوؤں کے چھلکے پھوہڑ پن سے کاٹ کر ادھر اُدھر پھینکے ہوئے تھے۔ تیل کی پوری تھیلی، تلنے والی کڑاہی میں ڈالی ہوئی تھی۔ تیل ہر جگہ گرا ہوا تھا۔ شبنم پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ صرف آلو کے چپس تلنے میں، باورچی خانے کے آدھے برتن جھوٹے ہو چکے تھے۔ باورچی خانے کا حال ایسا تھا جیسے کسی بڑی دعوت کے بعد ہوتا ہے۔ بکھرا ہوا اور برتنوں کا ڈھیر۔

شبنم غصے سے واپس آئی اور درنایاب کے سر پر کھڑے ہو کر چیخنے لگی۔

"بدتمیز، جاہل، گنوار لڑکی! تمہیں کس نے کہا تھا میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کو؟ کس کی اجازت سے تم نے چپس تلے؟ غضب خدا کا، مہینے بھر کا بجٹ خراب کر دیا۔"

درنایاب مطمئن بیٹھی رہی۔ شبنم کا جب کچھ بس نہ چلا تو اپنے بچوں کو بری طرح مارنے لگی۔ وہ ڈر کر رونے لگے۔ صحن میں عجیب سا شور پیدا ہو گیا تھا۔ درنایاب سے بچوں کا رونا برداشت نہیں ہوا تو وہ شبنم کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شبنم لال چہرہ اور غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"جو کہنا ہے مجھے کہیں۔ بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔" درنایاب سے سنجیدگی سے کہا۔

"تو سمجھتی کیا ہے خود کو؟ لگتا ہے بچپن کی مار بھول گئی ہے۔"

"شبنم! خبردار جو میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا۔ کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔"

ذلفی جو اتنے سالوں سے برداشت کر رہا تھا۔ ایک دم پھٹ پڑا۔ شبنم ساکت رہ گئی۔ اتنی بڑی بات ذلفی نے آج تک نہیں کہی تھی۔ ذلفی اس وقت کام سے واپس آیا تھا کھلے ہوئے بیرونی دروازے سے اندر کا منظر دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا۔ درنایاب باپ کی جھلک دروازے پر دیکھ چکی تھی۔ اس لیے وہ شبنم کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی۔ شبنم نے پیلے پڑتے چہرے، اور ساکت وجود کے ساتھ، درنایاب کو زیر لب مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ذلفی کے قریب آتے ہی درنایاب نے چہرے پر مظلومیت طاری کر لی اور فوراً اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

"ابا! دیکھا آپ نے۔ اماں مجھے آج بھی سوتیلا سمجھتی ہیں۔ پچھلے چھ مہینوں سے اماں میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کر رہی ہیں۔ میں نے اپنی مرضی سے بچوں کے لیے چپس کیا بنائے کہ اماں نے میری اتنی بے عزتی کر دی۔ ابا! کیا اس لیے آپ مجھے گاؤں سے شہر لائے تھے۔"

درنایاب نے روتے ہوئے کہا تو ذلفی نے بیٹی کا سر تھپکتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔

"میری پیاری بیٹی! چپ ہو جاؤ۔ تمہیں رونے اور تکلیف سے بچانے کے لیے تو میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا اور تمہیں اپنی بہن کے پاس گاؤں بھیج دیا تھا۔"

"تو تمہاری بہن نے کون سے اچھا کیا اس لڑکی کے ساتھ۔ فتنہ بنا دیا ہے اسے۔ جھوٹی اور مکار۔ پڑھنے میں بھی نکمی اور حرکتوں میں بھی مکار اور سازشی۔ دیکھنا میری بددعا لگے گی اس لڑکی کو۔ کبھی دل کی سچی خوشی نصیب نہیں ہوگی۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگائی ہے۔"

کے لیے آگے بڑھی، جب ذلفی کی تیز اور سخت آواز اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ درنایاب

کھاتے ہوئے وہ ہنس بول رہے تھے۔

جس وقت شبنم نے گھر میں قدم رکھا، تھوڑے سے چپس ڈش میں باقی بچے تھے۔ شبنم نے ان پر نظر ڈالی تو اسے سکتہ ہی ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔ کچن کی حالت دیکھتے ہی اسے چکر آ گیا۔ شبنم کام چور اور بدحرام ضرور تھی مگر اس وقت جو حالت باورچی خانے کی ہو رہی تھی، اس کا شبنم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آلوؤں کے چھلکے پھوہڑ پن سے کاٹ کر ادھر اُدھر پھینکے ہوئے تھے۔ تیل کی پوری تھیلی، تلنے والی کڑاہی میں ڈالی ہوئی تھی۔ تیل ہر جگہ گرا ہوا تھا۔ شبنم پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ صرف آلو کے چپس تلنے میں، باورچی خانے کے آدھے برتن جھوٹے ہو چکے تھے۔ باورچی خانے کا حال ایسا تھا جیسے کسی بڑی دعوت کے بعد ہوتا ہے۔ بکھرا ہوا اور برتنوں کا ڈھیر۔

شبنم غصے سے واپس آئی اور درنایاب کے سر پر کھڑے ہو کر چیخنے لگی۔

"بدتمیز، جاہل، گنوار لڑکی! تمہیں کس نے کہا تھا میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کو؟ کس کی اجازت سے تم نے چپس تلے؟ غضب خدا کا، مہینے بھر کا بجٹ خراب کر دیا۔"

درنایاب مطمئن بیٹھی رہی۔ شبنم کا جب کچھ بس نہ چلا تو اپنے بچوں کو بری طرح مارنے لگی۔ وہ ڈر کر رونے لگے۔ صحن میں عجیب سا شور پیدا ہو گیا تھا۔ درنایاب سے بچوں کا رونا برداشت نہیں ہوا تو وہ شبنم کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شبنم لال چہرہ اور غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"جو کہنا ہے مجھے کہیں۔ بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔" درنایاب سے سنجیدگی سے کہا۔

"تو سمجھتی کیا ہے خود کو؟ لگتا ہے بچپن کی مار بھول گئی ہے۔"

شبنم غصے سے کہتے ہوئے درنایاب کو مارنے کے لیے آگے بڑھی، جب ذلفی کی تیز اور سخت آواز

"شبنم! خبردار جو میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا۔ کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔"

ذلفی جو اتنے سالوں سے برداشت کر رہا تھا۔ ایک دم پھٹ پڑا۔ شبنم ساکت رہ گئی۔ اتنی بڑی بات ذلفی نے آج تک نہیں کہی تھی۔ ذلفی اس وقت کام سے واپس آیا تھا کھلے ہوئے بیرونی دروازے سے اندر کا منظر دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا۔ درنایاب باپ کی جھلک دروازے پر دیکھ چکی تھی۔ اس لیے وہ شبنم کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی۔ شبنم نے پیلے پڑتے چہرے، اور ساکت وجود کے ساتھ، درنایاب کو زیرلب مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ذلفی کے قریب آتے ہی درنایاب نے چہرے پر مظلومیت طاری کر لی اور فوراً اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

"ابا! دیکھا آپ نے۔ اماں مجھے آج بھی سوتیلا سمجھتی ہیں۔ پچھلے چھ مہینوں سے اماں میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کر رہی ہیں۔ میں نے اپنی مرضی سے بچوں کے لیے چپس کیا بنائے کہ اماں نے میری اتنی بے عزتی کر دی۔ ابا! کیا اس لیے آپ مجھے گاؤں سے شہر لائے تھے۔"

درنایاب نے روتے ہوئے کہا تو ذلفی نے بیٹی کا سر تھپکتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔

"میری پیاری بیٹی! چپ ہو جاؤ۔ تمہیں رونے اور تکلیف سے بچانے کے لیے تو میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا اور تمہیں اپنی بہن کے پاس گاؤں بھیج دیا تھا۔"

"تو تمہاری بہن نے کون سے اچھا کیا اس لڑکی کے ساتھ۔ فتنہ بنا دیا ہے اسے۔ جھوٹی اور مکار۔ پڑھنے میں بھی نکمی اور حرکتوں میں بھی مکار اور سازشی۔ دیکھنا میری بددعا لگے گی اس لڑکی کو۔ کبھی دل کی سچی خوشی نصیب نہیں ہوگی۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگائی ہے۔"

شبنم غصے سے پھٹ پڑی اور پھر روتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ درنایاب

اس کی بددعا پر ساکت رہ گئی۔

یہ درست تھا کہ اس نے آج کا سارا ڈرامہ جان بوجھ کر اور شبنم کو ذلیل کروانے کے لیے کیا تھا۔ درنایاب کو گاؤں سے آئے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ اس دوران، زینب کے بار بار زور دینے پر بھی ذلفی نے شادی کی تاریخ نہیں دی تھی۔

درنایاب کے ساتھ شبنم کا رویہ روکھا ضرور تھا مگر وہ درنایاب کو ڈانٹتی نہیں تھی۔ شبنم درنایاب کو کوئی کام کرنے کا کہتی تو درنایاب جان بوجھ کر خراب کر دیتی۔ جس پر شبنم غصے سے بل کھا کر رہ جاتی۔ درنایاب کی حرکتیں اور سازشیں دیکھ کر، اب شبنم کو افسوس ہوتا کہ بلاوجہ ہی درنایاب کی رخصتی میں دیر کی۔

شبنم کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ ذلفی کو کہے گی کہ درنایاب کی شادی کی تاریخ طے کر کے رخصت کر دو کیونکہ یہ لڑکی، اس کی مدد کروانے کے بجائے، بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ الٹا شبنم کو اسے پکا کر کھلانا پڑتا۔ شبنم تو اپنے بچوں کا کام روپیٹ کر کرتی، وہ کہاں سے سوتن کی بیٹی کی خدمت کرتی۔

شبنم سوچتی ہی رہ گئی تھی اور درنایاب نے چالاکی سے اپنا راستہ صاف کر لیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد درنایاب نے ذلفی کو زینب کو فون کرتے دیکھا۔ ذلفی درنایاب کی شادی کی تاریخ طے کرنا چاہ رہا تھا۔ درنایاب خوشی سے کھل اٹھی جبکہ دوسری طرف کئی مہینوں سے انتظار کی سولی پر لٹکی، زینب کو سکھ کا سانس نصیب ہوا تھا۔

☆☆☆

"حیدر!"

زینب نے محبت سے بیٹے کو پکارا جو تاروں بھری رات میں، چھوٹی سجاوٹی لائٹوں سے سجے صحن میں گم صم کھڑا، سر اٹھائے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ آج حیدر کی مہندی تھی۔ جس میں سب قریبی رشتے دار اور گاؤں کے لوگ شامل ہوئے۔ خوب ہلا گلا کیا گیا۔ کچھ دیر پہلے ہی سب مہمان گئے تھے۔ کاموں سے فارغ ہو کر حیدر چائے کا کپ بنا کر لان میں آ گیا۔ موسم میں ٹھنڈک تھی۔ اس لیے رات بہت پرسکون تھی۔

آنے والے وقت کا سوچ کر اس کا دل پریشان سا تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا، جب زینب نے پاس آ کر اسے پکارا۔ حیدر نے رخ موڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا ہی رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" زینب نے محبت سے سوال کیا۔ حیدر نے نرمی سے ماں کا جھریوں زدہ، محنت کی چکی میں پسا، سخت ہاتھ تھام لیا تھا۔

"بے بے! آپ مجھ سے خوش تو ہیں نا؟"

حیدر نے سوال کیا تو زینب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔ کل کا چھوٹا سا حیدر، آج زینب کے قد سے اونچا تھا۔ وہ جھک کر ماں کے سینے سے لگ کر کھڑا رہا۔

"میں تجھ سے راضی ہوں میرے بیٹے!"

زینب نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ حیدر گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ماں کو چپ کروانے لگا۔ ماں کو روتا دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی ماں کی محبت میں کتنا کمزور ہے۔

"بے بے! مجھ سے کیا خطا ہوئی، جو آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو آئے ہیں؟"

اس نے ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے سوال کیا۔ زینب نے اپنے دوپٹے سے بھیگا ہوا منہ صاف کیا۔ وہ ماں کا ہاتھ تھام کر پاس رکھے ہوئے موڑھے پہ بیٹھ گیا۔

"حیدر! تجھ سے کوئی خطا نہیں ہوئی۔ مجھے تو اپنی کوتاہی، اپنی زیادتی کا احساس رلا گیا۔ میں نے بھتیجی کی اندھی محبت میں ہمیشہ تیرے ساتھ زیادتی کی۔ حالانکہ تو میرے کوکھ کا جنا تھا مگر درنایاب کی محبت نے مجھے سب بھلا دیا۔ آج مجھے اس بات کا احساس شدت سے ہو رہا ہے کہ تو اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تیری آنکھوں میں خوشی کا، کوئی دیپ

روکن نہیں ہے۔ یہ احساس مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے۔ میرا بیٹا اتنا اچھا ہے اور میں کتنی خود غرض۔'' زینب نے اپنے رونے کی وجہ بتائی تو حیدر نے نفی میں سر ہلایا۔

''بے بے! ایسا مت سوچیں۔ اس خوشی میں آپ کی خوشی شامل ہے۔ اس خوشی میں میرے مرحوم باپ کا وہ وعدہ شامل ہے جو انھوں نے مجھ سے لیا تھا کہ میں اپنی ماں کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔ انھیں کبھی دکھ نہیں دوں گا۔ بے بے! اگر آپ راضی، تو ابا راضی، ابا راضی تو میرا رب بھی راضی ہے۔ کیا یہ سودا گھاٹے کا ہے؟'' حیدر نے ہلکی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا تو زینب ساکت بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

''حیدر! میں اپنے سوہنے رب کا شکر کیسے ادا کروں؟ ایک عام سی عورت ہوتے ہوئے بھی شوہر اور بیٹے کی انمول محبت کی حق دار ٹھہری۔ مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا؟'' زینب کے لب ہلے۔ حیدر نے ماں کا ہاتھ چوم لیا۔

''میرے لیے آپ کی خوشی، آپ کے سکون سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہے۔''

حیدر نے کہا تو زینب نے فخریہ انداز میں بیٹے کی طرف دیکھا۔ حیدر بھی ماں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس رات کے بعد آنے والی زندگی، بالکل بدلنے والی تھی۔ درنایاب جسے وہ بچپن سے ساتھی، دوست، کزن کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا، اب وہ اس کی جیون ساتھی بن کر اس گھر میں قدم رکھنے والی تھی۔

حیدر آنے والے وقت کے بارے میں زیادہ خوش گمان نہیں تھا۔ فی الحال کے لیے، اس کا اطمینان صرف یہ تھا کہ اس کے والدین اس سے راضی ہیں۔ آگے کا معاملہ وہ قسمت پہ چھوڑ چکا تھا۔

☆☆☆

روایتی انداز میں دلہن بنی درنایاب سرخ جوڑے میں اٹھلاتی، مسکراتی حیدر کی زندگی میں داخل ہوگئی۔ حیدر نے اس کا استقبال ایسے ہی کیا جیسے اس کا حق تھا۔ ویسے سے اگلے دن درنایاب منہ بسور کر کمرے میں داخل ہوئی تو حیدر چونک گیا۔

''کیا ہوا؟ بے بے نے کچھ کہہ دیا؟''

حیدر نے جلدی سے سوال کیا تو درنایاب نفی میں سر ہلاتی، اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ حیدر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کام والے جوڑے میں ملبوس، ہاتھوں میں کانچ کی ڈھیر ساری چوڑیاں پہنے، کانوں میں چھوٹے سے جھمکے، بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنائے، وہ سیدھا حیدر کے دل پہ دستک دے رہی تھی۔

''اگر میری ماں زندہ ہوتی تو وہ میری شادی کی سب رسمیں نبھاتی، جو اماں نے ابا کو نہیں کرنے دیں۔''

درنایاب نے اداسی سے کہا تو حیدر چونک گیا۔ آج ان کا مسئلا دا تھا مگر شبنم نے خراب طبیعت کا بہانا کر کے درنایاب کو ساتھ لے جانے سے منع کر دیا تھا۔ ذلفی بے بی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ شبنم کو منع کر کے تماشا نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ درنایاب سے لڑائی کے بعد شبنم کا رویہ بہت جارحانہ ہو چکا تھا۔ شبنم نے شادی کی تیاریوں میں بے دلی سے حصہ لیا تھا۔ درنایاب کی ہر چیز دیکھ کر وہ حسد کا شکار ہوتی رہی تھی حالانکہ درنایاب کی شادی سادگی سے ہوئی تھی۔

''تمہیں اپنی ماں یاد آتی ہے؟'' حیدر نے مدھم لہجے میں سوال کیا تو درنایاب اداسی سے مسکرا دی۔

''حیدر! ماں کسے یاد نہیں آتی؟ مجھے بھی اپنی ماں کے دھندلے دھندلے نقش یاد ہیں۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ وقت ۔ پیچھے چلا جائے۔ ایک بار ہی سہی! میں اپنی ماں کے گلے لگ سکوں! انھیں بتا سکوں کہ ماں کے بعد اولاد کیسے رویوں کی دھوپ میں جلتی ہے۔ میں خوش نصیب تھی کہ بے بے کا پیار ملا مگر حیدر! وہ صرف پیار تھا۔ اس پیار میں ماں والا رعب، ماں والا مان، ماں والی ڈانٹ، ماں والا غصہ نہیں تھا۔ جیسے بے بے تم پہ غصہ کرتی ہے، بچپن میں تمہیں مار بھی لیتی تھی مجھے تو ہمیشہ نازک چیز سمجھ کر بس پیار ہی کیا ہے۔''

درنایاب کہتے ہوئے رو پڑی۔ حیدر کو پہلی بار احساس ہوا کہ درنایاب بھی اپنے دل میں بچپن کی محرومی کے ساتھ لڑ رہی تھی۔

''درنایاب!'' بے بے کسی کام سے درنایاب کو آواز دیتی ہوئی کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اسے روتا دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔

''کیا ہوا میری بچی؟''

زینب نے تڑپ کر کہا تو درنایاب تیزی سے اٹھی اور بے بے کے گلے لگ کر آنسو بہانے لگی۔ حیدر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب بے بے اور درنایاب کی محبت کا ایک لمبا سین چلنا تھا۔

''آج پھر ماں کی یاد آ گئی۔''

زینب نے دکھی انداز میں کہا اور درنایاب کو سینے سے لگائے وہاں سے لے گئی۔ حیدر درنایاب کی محرومی کے بارے میں سوچتا ہوا، اداسی محسوس کر رہا تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ درنایاب کے بہتے آنسوؤں میں اسے کسی اور کے آنسو بھی نظر آئے تھے۔

بالکل ایسے ہی کچھ دن پہلے وہ اپنی ماں کو روتے دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔ حیدر کو ایسا لگا کہ جیسے وہ ساری زندگی ان آنسوؤں کی بارش میں قید رہے گا۔ اسے زینب کے آنسوؤں نے بھی اتنی ہی تکلیف پہنچائی تھی جتنی درنایاب کے آنسوؤں نے۔

اپنے دل کا حال سمجھتے ہوئے، حیدر آج پہلی بار دل سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

''تمہاری ساس نے منع نہیں کیا؟'' درنایاب پچھلے ایک ہفتے سے رہنے کے لیے باپ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ حیدر دوسرے شہر میں نوکری کرتا تھا جو یہاں سے ایک گھنٹے کی دوری پہ تھا۔ شبنم نے مزے سے جامن کھاتی درنایاب سے سوال کیا تو وہ چونک گئی۔

''ساس؟ وہ میری بے بے ہے۔ وہ مجھے کیوں روک ٹوک کرے گی۔'' درنایاب نے کندھے اچکا کر کہا۔

''بے بے، پھوپھو! یہ سب شادی سے پہلے کے رشتے ہوتے ہیں۔ اب وہ تمہاری ساس ہے اور دیکھ لینا بہت جلد تمہیں سمجھ آ جائے گی۔''

شبنم نے پیشینگ کرنے والے انداز میں کہا تو درنایاب سوچ میں پڑ گئی۔ وہ جب بھی میکے آتی، شبنم اس کے ذہن میں ایسی باتیں ہی ڈالتی تھی۔

شبنم اب درنایاب سے نرمی سے بات کر لیتی مگر اس کی ہر بات منفی پیرائے میں ہوتی۔ وہ منفی سوچ کا زہر درنایاب کے کانوں میں انڈیلتی تھی۔ کیونکہ درنایاب بہت بے وقوف، ناسمجھ اور منہ پھٹ تھی۔ شبنم اس کی کمزوری جان گئی تھی۔ شبنم اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے درنایاب کو غلط سمت میں بھٹکا رہی تھی۔

☆☆☆

''بے بے! اپنی لاڈلی بہو سے کہیں! میرا ناشتہ بنا دے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

حیدر نے نروٹھے پن سے کہا۔ وہ صبح کے آٹھ بجے تیار ہو کر صحن میں کھڑا تھا۔ جبکہ درنایاب بے فکری سے سو رہی تھی۔ صحن میں کام کرتی بے بے ایک دم چونکی اور پھر ہنس پڑی۔

''آج پھر لڑے ہو تم دونوں۔۔۔!'' بے بے نے سب کام چھوڑے اور حیدر کا ناشتہ بنانے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ کی لاڈلی بہو کو سوائے لڑنے جھگڑنے، سونے، آرام کرنے کے اور آتا ہی کیا ہے؟''

حیدر نے چڑ کر کہا۔ وہ صحن میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے باورچی خانے کا دروازہ تھا۔ جہاں سے وہ بے بے کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا

''سب سیکھ جائے گی! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔'' بے بے نے پیار سے کہا تو حیدر تلملا کر رہ گیا۔

''بے بے! ہماری شادی کو آٹھ مہینے گزر گئے ہیں مگر ان آٹھ مہینوں میں اس کا بچکانہ پن ہی ختم نہیں ہوا ہے۔ حد ہے۔ میں ہر ہفتے شہر سے بھاگا چلا

آتا ہوں کہ آپ لوگوں کے ساتھ وقت گزاروں مگر یہاں کسی کو پروا نہیں ہے۔" حیدر نے جھنجھلا کر کہا۔

"اچھا! خالی پیٹ غصہ مت کر! جلدی سے ناشتہ کرلے۔ تجھے کہیں جانا بھی ہے۔"

بے بے نے ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھی۔ دودھ پتی کے ساتھ دیسی گھی میں بنا بلوں والا پراٹھا اور ساتھ آملیٹ اور اچار دیکھ کر حیدر کا غصہ کچھ کم ہوا اور وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کر کے حیدر گھر سے باہر چلا گیا تو زینب بڑبڑاتی ہوئی، ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"درنایاب! دن چڑھ گیا ہے۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ جب حیدر گھر پہ ہو تو وقت پہ اٹھ جایا کر۔"

زینب نے اونچی آواز میں کہا تو درنایاب مندی آنکھوں سے بے بے کی طرف دیکھنے لگی۔

"بے بے! حیدر تو ہر ہفتے چھٹی پہ آتا ہے۔ اب اپنی نیند کیوں خراب کروں؟" درنایاب نے بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنانے لگی۔

"میرا حیدر جم جم آئے! یہ کیا بات کردی۔"

بے بے نے ناگواری سے کہا تو درنایاب ٹھٹکی۔ آج بے بے کے تیور بہت بدلے ہوئے تھے یا درنایاب کو ایسا محسوس ہوا۔

"بے بے! آج تو بہت غصے میں ہے؟" درنایاب نے فکرمندی سے سوال کیا تو اس کے چہرے پر پھیلے ڈر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے زینب کا دل موم ہوا مگر وہ مضبوط بنی کھڑی رہی کیونکہ اس کی نرمی درنایاب کو پہلے ہی بہت بگاڑ چکی تھی۔

"غصہ تو آئے گا! جب میرا لاڈلا بیٹا گھر آئے اور کوئی اس کا خیال رکھنے والا نہ ہو۔ درنایاب تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ شوہر کا خیال رکھا کر۔

نہ تو حیدر کے کپڑے دھوتی ہے نہ استری کرتی ہے۔ نہ اس کے جوتے کا دھیان رکھتی ہے۔ چلو ان سب باتوں کو بھی چھوڑ۔ تجھے اتنی خبر نہیں کہ تیرے شوہر نے ناشتہ کیا یا نہیں؟ دوپہر کو کیا کھائے گا، رات کی روٹی کھائی یا نہیں؟ میں کب تک حیدر کا دھیان رکھوں گی؟ جو کام بیوی کے کرنے والے ہیں، تو کم از کم وہ تو کیا کر۔ باقی گھر کی کوئی ذمہ داری میں نے تجھ پر نہیں ڈالی ہے۔"

زینب نے سخت لہجے میں کہا تو درنایاب حیرت سے منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔

"بے بے! میں حیدر کی نوکرانی نہیں ہوں جو اس کے سارے کام کروں۔ مجھ سے اتنے نخرے نہیں اٹھائے جاتے۔"

درنایاب نے بیزاری سے کہا۔

"درنایاب! اس میں نوکرانی بننے والی کیا بات ہے؟ بیوی تو یہ سب محبت میں، خیال میں کرتی ہے۔ جیسے شوہر اس کا خیال رکھتا ہے۔"

زینب نے حیرانی سے کہا۔

"بے بے! اماں سوتیلی ہی سہی مگر کہا انھوں نے ٹھیک ہی ہے کہ شادی کے بعد پھوپھو، ساس ہی بن جاتی ہے۔"

درنایاب نے منہ بنا کر کہا اور پھر تیزی سے بستر سے نیچے اتر کر کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ زینب ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ بے دم ہو کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

"یہ سب میری تربیت ہے۔ میرے لاڈ پیار کا نتیجہ! اکلوتے بیٹے کو ساری زندگی سوتیلی ماں جیسا پیار دیا اور لاڈلی بھتیجی کو سوتیلی ماں کے ظلم سے بچا کر، سگی ماں سے زیادہ پیار کیا مگر آج طعنہ کیا ملا کہ میں ساس بن گئی ہوں۔" زینب نے افسردگی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

"درنایاب! میں مزید بدتمیزی برداشت نہیں کروں گا۔ میرے صبر کا امتحان مت لو۔"

کمرے کے بند دروازے سے حیدر کی غصے سے بھری آواز، رات کی خاموشی میں باہر آرہی تھی۔ زینب جو تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھی تھی۔ ان کے کمرے سے باہر آتی آوازیں سن کر ٹھٹک کر رک

ن۔

"میں اگر بدتمیز ہوں تو تم کیا ہو؟ جاہل مرد!" درنایاب نے چیخ کر کہا۔ زینب تیزی سے آگے بڑھی اور دروازے پہ زور کی دستک دی۔ کچھ لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ حیدر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا جیسے وہ بہت ضبط کر رہا تھا جبکہ درنایاب کمرے کے وسط میں تن کر کھڑی تھی۔

"رات کے اس پہر تماشا کیوں لگایا ہوا ہے؟" زینب نے سخت لہجے میں کہا۔

"اپنی لاڈلی سے پوچھ لیں! جسے کسی سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔" حیدر نے ناگواری سے کہا اور پھر غصے سے کمرے سے باہر نکل کر چھت پہ چلا گیا۔ زینب نے درنایاب کو دیکھا۔

"اب آپ مجھے ہی سمجھانا شروع ہو جائیں۔ اکلوتا بیٹا تو ٹھیک ہی لگے گا نا!" درنایاب نے بدتمیزی سے کہا۔

"درنایاب! اپنے لہجے کو دیکھو۔" زینب نے سخت انداز میں کہا تو درنایاب کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

"میں نے حیدر سے صرف اتنا ہی کہا کہ مجھے شہر گھومنے پھرنے جانا ہے۔ آپ کے بیٹے کا تو میٹر ہی گھوم گیا۔ شادی اتنی سادگی سے کی۔ نہ کوئی خرچا، نہ کوئی بری۔ مفت میں خوب صورت لڑکی مل گئی۔ شادیاں اس طرح ہوتی ہیں؟ میرے تو ارمان ہی پورے نہیں ہوئے۔ ہائے! میری تو قسمت ہی خراب نکلی۔"

درنایاب نے سر پکڑ کر رونا دھونا شروع کر دیا۔ زینب غصے میں آگے بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا۔ درنایاب رونا بھول کر حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"خبردار جو رات کے اس پہر رونا دھونا ڈالا۔ ساری دنیا کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں۔" زینب نے سخت لہجے میں کہا اور مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہاں بھئی! اپنی عزت کی تو فکر ہوتی ناں! دنیا کو بھی تو پتا چلے کہ اکلوتی بہو کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔"

درنایاب نے ناگواری سے خود کلامی کی۔ جو زینب نے سن تو لی مگر وہ اسے نظر انداز کرتی، چھت پہ جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

دونوں ماں بیٹا رات کے آخری پہر، چارپائی پر بیٹھے، ستاروں سے سجا آسمان دیکھ رہے تھے۔ فجر کی اذان ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔

"حیدر!" زینب نے بیٹے کے کندھے پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"بے بے! آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔" حیدر نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو زینب ہلکی روشنی میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تمہیں شکوہ کرنا چاہیے۔" زینب کے لب ہلے تو حیدر ہنس پڑا۔

"آپ ماں ہیں اور مائیں کبھی اپنی اولاد کے لیے برا نہیں سوچتیں۔ یہ سب تو قسمت کا کھیل ہے۔"

حیدر نے پورے یقین سے کہا تو زینب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ مان، یہ یقین اسے، ان کی سگی اولاد نے دیا تھا جبکہ درنایاب ایک لمحے میں اس سے بدگمان ہو جاتی تھی۔ شاید اپنی کوکھ سے پیدا کیے گئے بچے، اور کسی دوسرے بچے کو پیار کرنے میں یہ ہی فرق ہوتا ہے۔

"تم درنایاب کو شہر لے جاؤ۔" زینب نے نرمی سے کہا تو حیدر تلخی سے ہنس پڑا۔

"بے بے! پہلے بھی کئی بار لے کر گیا ہوں مگر وہ کبھی خوش نہیں ہوتی۔ اب تو بات ہی دوسری ہے۔" حیدر کہتے ہوئے چپ کر گیا۔

"دوسری بات؟" زینب چونک گئی۔

"آں۔ بے بے دراصل وہاں رہائش کا مسئلہ ہے ناں! میں نے ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا ہے مگر

حیدر نے فوراً بات بدلی تو زینب سر ہلانے لگی۔

''سب میری غلطی ہے۔ درنایاب کو اتنا لاڈ پیار دیا، نہ گھریلو کاموں میں طاق کیا اور نہ پڑھائی لکھائی میں۔ اچھا ہوا کہ تم میرے پلو سے جلد باہر نکل گئے۔ شہر میں پڑھے لکھے، نوکری بھی کر لی۔ شکر ہے کہ تم نے اپنی زندگی تو بنا لی۔'' زینب نے گہری سانس لے کر کہا تو حیدر سر جھٹک کر آسمان پر نظر آتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔

''بے بے! اب میں ہر ہفتے گاؤں نہیں آیا کروں گا۔'' حیدر نے مدھم آواز میں کہا تو زینب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں؟''

زینب نے بے ساختہ پوچھا تو حیدر نے گردن گھما کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ حیدر کے چہرے کی تھکن اور آنکھوں کی پریشانی زینب کو سب سمجھا گئی تھی۔

''بے بے! میں گاؤں آپ دونوں کے لیے آتا ہوں کہ شاید میرے آنے سے گھر میں خوشی پھیل جائے مگر پچھلے کچھ عرصے سے میرے آتے ہی شکوے، لڑائی، جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ درنایاب کو آپ نے نازوں سے پالا ہے مگر بے بے! میری اتنی برداشت نہیں کہ میں اس کی ہر بدتمیزی کو سہہ جاؤں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں غصے میں اپنی حد نہ بھول جاؤں۔۔!''

حیدر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا تو زینب چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''درنایاب آپ کا انتخاب ہے۔ آپ کی محبت۔ آپ اس کے ساتھ خوش رہیں۔ مجھے میری زندگی جینے دیں۔''

حیدر نے کہا۔ اسی وقت فجر کی اذان ہونے لگی تو حیدر وضو کرنے کے لیے اٹھ کر نیچے چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تھکے قدموں سے سیڑھیاں اترتی

''انسان اپنے خسارے ہمیشہ خود چنتا ہے۔''

آج زینب کو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

''تم ابھی تک یہاں ہی ہو؟ شہر کب جاؤ گی۔''

آج ذلفی اور شبنم بچوں کے ساتھ شہر سے گاؤں آئے تھے۔ ذلفی بیٹی سے ملنے اور اسے کچھ تحفے تحائف دینے آیا تھا۔ جب سے درنایاب کی شادی ہوئی تھی، ذلفی اکثر کچھ نہ کچھ بیٹی کے لیے ضرور بھیجتا یا خود لے کر آ جاتا۔ زینب اسے منع کرتی مگر ذلفی ہنس کے کہتا کہ یہ میرے دل کی خوشی ہے۔ درنایاب کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا۔ اس دوران اس کے تعلقات شبنم سے بہتر ہو گئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ذلفی اور زینب صحن میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

بچے کھیل کود میں لگ گئے تو شبنم موقع ملتے ہی درنایاب کے کمرے میں چلی آئی۔ درنایاب کسی کام سے اندر آئی۔ شبنم کو کمرے میں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی اور بستر پر بٹھا کر خود بھی سامنے بیٹھ گئی۔ شبنم نے گہری نگاہوں سے اس کے سجے سجائے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ پہلے یہ کمرہ حیدر کے استعمال میں تھا۔ اس لیے کمرے کی سجاوٹ، جدید انداز میں کی گئی تھی۔ حیدر نے ہر چیز اپنی مرضی اور پسند سے لی تھی۔ درنایاب کو تو شادی سے پہلے بھی حیدر کا کمرہ بہت پسند تھا اب تو یہ اس کی ملکیت بن گیا تھا۔

''شہر۔۔! اونہہ۔۔'' درنایاب نے منہ بنا کر کہا۔

''کیوں؟ تم نے حیدر سے بات نہیں کی؟'' شبنم نے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

''بات؟ میری تو کئی لڑائیاں حیدر سے ہو چکی ہیں۔ مگر وہ اپنی ماں کو اکیلا چھوڑنے پہ راضی ہی نہیں۔'' درنایاب نے منہ بنا کر کہا تو شبنم کے جلتے دل میں سکون پھیل گیا۔

ٹھیک ہے، محبت پیار اپنی جگہ مگر شادی کے بعد یہ سب کون دیکھتا ہے۔ شوہر کے ساتھ رہنا تمہارا حق ہے۔"

شبنم نے ہمیشہ کی طرح درنایاب کے ذہن میں زہر انڈیلا تھا۔ درنایاب کے شادی کے بعد والے منفی رویے اور سوچ کے پیچھے شبنم کا زہر ہی تھا جو وہ ہر ملاقات میں اس کے کان میں انڈیل دیتی تھی۔ سدا کی کم عقل اور بے وقوف درنایاب اس کی باتوں میں آ کر، اپنے پرسکون گھر میں مسئلے پیدا کرنے لگتی تھی۔

"پھوپھو کے پلو کو تو کب کا چھوڑ چکی ہوں۔ حیدر کو اپنی ماں سے بہت محبت ہے۔ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں۔" درنایاب نے بے بسی سے کہا۔

"میں نے تو سنا ہے کہ حیدر تم سے شادی کرنے پہ بھی راضی نہیں تھا۔ بھلا کیسے ہوتا۔ کہاں وہ شہر کا پڑھا لکھا، اونچا لمبا، سوہنا منڈا، اور کہاں تم گاؤں کی ان پڑھ گنوارسی لڑکی۔۔ مگر پھر بھی اس نے تم سے شادی کی۔ اپنی بے بے کے کہنے پہ..... تو اب تم بھی اسی کمزوری کا استعمال کرو۔"

شبنم نے نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کئی باتیں لگا دی تھیں۔ درنایاب جو اس کی کہی باتوں پہ منہ بنانے ہی والی تھی۔ آخری بات سن کر چونک گئی۔

"بے بے مان جائیں گی؟" درنایاب نے جلدی سے سوال کیا۔

"یہ تم پر ہے۔ چاہو تو پیار سے سمجھاؤ یا لڑ جھگڑ کے۔"

شبنم نے اطمینان سے کہا تو درنایاب سر ہلانے لگی۔ شام کو وہ لوگ واپس چلے گئے مگر درنایاب کو ایک نئی راہ اور طریقہ ضرور سمجھا گئے تھے۔

☆☆☆

"حیدر! لنچ بریک ہو گئی ہے۔ باقی کام بعد میں۔"

صدف نے لیپ ٹاپ پہ تیزی سے انگلیاں چونک کر پہلے سامنے کھڑی نرم مسکراہٹ اور ڈیسنٹ شخصیت کی مالک صدف کو دیکھا اور پھر گردن گھما کر گھڑی کی طرف۔ لنچ بریک ہوئے بیس منٹ گزر چکے تھے۔

"اوہ! کام میں دھیان ہی نہیں رہا۔" حیدر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تو صدف مسکراتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہمیشہ کی طرح۔ ویسے تم خود سے اتنے لاپرواہ کیوں ہو؟ یہ عادت ابھی پڑی ہے یا ہمیشہ سے ایسے ہو۔"

صدف نے اپنے ساتھ لایا ہوا لنچ باکس کھولتے ہوئے معروف انداز میں کہا۔ حیدر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"آج بھی تم غلطی سے زیادہ کھانا لے آئی ہو گی؟" حیدر نے شرارت سے کہا تو صدف ہنس پڑی۔

"جی نہیں! میں خوشی سے تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔" صدف نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ حیدر سنجیدہ ہو گیا۔

"صدف! کبھی کبھار کی بات اور ہے مگر ہر روز تمہارا کھانا شیئر کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

حیدر نے کہا۔ اسی وقت آفس بوائے، گرم روٹی اور پانی کی ٹھنڈی بوتل لے کر اندر داخل ہوا۔

"دس منٹ کے بعد چائے لے آنا۔" صدف نے دونوں چیزیں پکڑتے ہوئے کہا تو آفس بوائے واپس چلا گیا۔

"حیدر! تم نے جس طرح اس دن میری اور میرے بیٹے کی مدد کی تھی۔ میں اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں اتار سکتی —— پلیز کھانا شروع کرو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

صدف نے مدھم لہجے میں کہا تو حیدر گہری سانس لے کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سبزی کے ساتھ شامی کباب بھی تھے۔ حیدر سمجھ گیا کہ شامی

نہیں تھا کہ حیدر یہ سبزی کھاتا ہے یا نہیں۔

''یہ کون سی سبزی ہے؟'' حیدر نے سوال کیا۔

''شلجم گوشت۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں یہ سبزی پسند ہے یا نہیں۔ اس لیے شامی کباب بھی فرائی کر لیے تھے۔'' صدف نے کہا تو حیدر اپنے درست اندازے پہ مسکرا دیا۔

''سچ کہوں! تو یہ بہت مزے کے بنے ہوئے ہیں۔ بے بے شلجم اس طریقے سے نہیں بناتی ہیں۔ وہ شوربے والے بناتی ہیں۔ جبکہ یہ خشک ہیں۔'' حیدر نے مزے سے کھانا کھاتے ہوئے کہا تو صدف کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''میری امی شلجم گوشت اسی طرح بناتی تھیں۔ اس کے ساتھ تڑکے والے چاول بھی بنتے تھے مگر میں چاول بہت کم کھاتی ہوں۔ اس لیے نہیں بنائے۔ کیا تمہیں چاول پسند ہیں؟''

صدف نے پوچھا تو حیدر اثبات میں سر ہلاتا اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں بتانے لگا۔ صدف بہت غور سے سن رہی تھی۔ کھانا ختم کر کے وہ دونوں چائے پی رہے تھے، جب حیدر سنجیدگی سے صدف سے مخاطب ہوا۔

''صدف! اس دن میں نے تمہاری مدد، انسانیت اور کولیگ ہونے کے ناتے کی تھی۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم اس احسان کے نیچے دب کر، میرے کھانے پینے کا خیال رکھو۔ ہم پچھلے چار سال سے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ہماری دوستی کو کسی فارمیلیٹی کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔'' حیدر نے نرم لہجے میں کہا۔

''حیدر! ولید کے بعد اگر مجھے کسی مرد پہ اعتبار ہے تو وہ تم ہو۔''

صدف نے سنجیدگی سے کہا اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ حیدر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھلے صدف، اپنے معصوم بیٹے کی انگلی

لیے صدف کو کچھ دیر رکنا پڑا۔ صدف کے ساتھ حسن بھی خوار ہوتا تھا۔ صدف نے بیرونی گیٹ کا تالا، اپنے پاس موجود چابی سے کھولا اور پورچ میں قدم رکھا۔ دس مرلے کا یہ دو منزلہ گھر اس کے والدین کی ملکیت تھا۔ جوان کی وفات کے بعد دونوں بہنوں کے حصے میں آیا تھا۔ نیچے والا پورشن اس کی بڑی بہن غزالہ کے پاس تھا۔ جہاں وہ اپنے تین بچوں اور شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ جبکہ صدف، ولید کے ساتھ اوپر والے پورشن میں رہتی تھی۔

ولید کے والدین تو حیات نہیں تھے، اس کے بڑے بہن بھائی شادی شدہ اور اپنی اپنی زندگی میں سیٹ تھے۔ ولید شادی سے پہلے اپنے بڑے بھائی کے گھر میں رہتا تھا۔ جب اس نے صدف سے پسند کی شادی کا فیصلہ کیا تو اس کے بھائی، بھابھی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی ذمہ داری مزید نہیں اٹھائیں گے۔ ولید نے صدف سے بات کی تو صدف نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ اس کے پاس گھر ہے۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ صدف رخصت ہو کر کچھ دن سسرال رہی۔ پھر وہ اور ولید صدف کے گھر شفٹ ہو گئے۔

صدف اور ولید کی زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی۔ ولید زندگی میں آگے بڑھنے پر یقین رکھتا تھا اور اس کے لیے بہت محنت بھی کر رہا تھا مگر حادثاتی موت نے اس کے سب خوابوں کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

صدف اپنے پورشن کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی اس نے نیچے والے پورشن سے کسی کی آوازیں سنیں۔ صدف گہری سانس لے کر رہ گئی۔ غزالہ کی سسرال کافی بڑی تھی اور وہ لوگ اکثر آئے ہوتے تھے۔ غزالہ کا سارا وقت ان کی مہمان نوازی کرتے گزر جاتا تھا۔ کیونکہ اس کے شوہر رضوان کا حکم تھا کہ میرے گھر والوں کی طرف سے کوئی شکایت نہ ملے۔

رضوان کے والدین کا اپنا ذاتی گھر تھا۔ جہاں اس کے دو بھائی رہ رہے تھے۔ رضوان کا کمرہ بھی

موجود تھا مگر رضوان، غزالہ کے خالی گھر کو دیکھ کر، بد نیت ہو کر یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ رضوان کو صدف کے اوپر رہنے پہ بہت اعتراض تھا۔ وہ اکثر غزالہ کو کہتا کہ صدف سے کہو کہ نیچے والے پورشن میں ایک کمرہ لے کر رہائش اختیار کر لے۔ اوپر والا پورشن کرائے پر چڑھا دیتے ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ مدد ہو جائے گی۔ غزالہ نے بہن سے یہ بات کرنے سے انکار کر دیا تو رضوان خود صدف سے بات کرنے چلا گیا مگر صدف نے اسے دوٹوک انداز میں منع کر دیا۔

صدف جانتی تھی کہ نیچے دو ماسٹر بیڈ روم ہیں۔ ایک کمرہ چھوٹا سا ہے جو وہ بچوں کے اسٹڈی روم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

صدف کو وہی کمرہ ہی دینے کی بات ہو رہی تھی۔ صدف ذہین اور سمجھ دار تھی۔ وہ رضوان کے لالچ کو بخوبی سمجھ چکی تھی۔ اس لیے وہ رو کھے انداز میں رضوان سے ملتی۔ صدف کا روکھا انداز، سخت لہجہ، بہت سے لوگوں کو خائف کر دیتا تھا۔ جن میں سے ایک رضوان بھی تھا۔

صدف نے اوپر آ کر سب سے پہلے حسن کو کمرے میں سونے کے لیے لٹایا۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا۔ حسن کے سونے کے بعد صدف، صبح کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی اور پھر چائے بنا کر اپنے ٹیرس پہ لٹکے جھولے میں آ کر بیٹھ گئی۔ ٹیرس پر اس نے بہت سے گملے رکھے ہوئے تھے۔ گملوں میں مختلف پودوں، پھولوں کے بیج لگانا اور ان کا خیال رکھنا، ولید اور صدف کا مشترکہ شوق تھا۔ صدف خاموشی سے سفید کھلے ہوئے موتیا کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ ولید کو موتیا بہت پسند تھا۔ وہ اکثر موتیا کے گجرے، صدف کے لیے لے کر آتا تھا۔ ولید کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دھیان حیدر کی طرف چلا گیا اور اس کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

حیدر کو وہ کافی عرصے سے جانتی تھی مگر پہلے کبھی اس طرح اس کے بارے میں سوچ کر نہیں مسکرائی

ی۔ یہ سب اس دن کے بعد سے ہوا تھا جب حیدر نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صدف اور حسن کو آوارہ لڑکوں سے بچایا تھا۔

ہوا یوں کہ دو ہفتے پہلے، چھٹی کے وقت، حیدر آفس سے نکلا۔ جب اس نے، آفس کی ذیلی سڑک پر، چند اوباش لڑکوں کے گھیرے میں صدف اور اس کے تین سالہ بیٹے کو دیکھا۔ وہ لڑکے صدف سے بیگ چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے، اس کے ساتھ بدتمیزی بھی کرنے لگے۔ حیدر نے دور سے انھیں للکارا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ان کی طرف بھاگتے ہوئے، سڑک پہ پڑی اینٹ اٹھا کر پھینکی۔ وہ چار لڑکے دو بائیکس پر تھے۔ حیدر کا نشانہ خطا ہوا مگر ان میں سے کسی لڑکے نے فائرنگ کر دی۔ خوش قسمتی سے حیدر بچ گیا۔

اس دوران قریبی عمارتوں کے باہر کھڑے چند گارڈز بھی آ گئے۔ وہ لڑکے فوراً رفو چکر ہو گئے۔ صدف بہت ڈر گئی تھی۔ حسن بھی بری طرح رو رہا تھا۔ حسن، آفس کے ڈے کیئر سینٹر میں سارا دن گزارتا تھا۔

صدف کے شوہر ولید کا ایک سال پہلے، ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ ولید بھی اسی آفس میں کام کرتا تھا مگر وہ حیدر سے سینئر تھا۔ حیدر کی اس سے سلام دعا تھی۔ حیدر کو اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا۔

"آئیں! میں آپ کو گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

حیدر نے سنجیدگی سے کہا اور پھر پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ گاڑی اس نے کچھ مہینے پہلے ہی لی تھی۔ سارا راستہ صدف روتی رہی۔ اسے آج ولید کی یاد بہت شدت سے آئی تھی۔ حیدر اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا مگر وہ اسے کیا تسلی دیتا۔ جوانی میں بیوگی کا دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک معصوم سے بچے کے ساتھ۔

حسن! آئس کریم کھاؤ گے؟"

حیدر نے ایک جگہ گاڑی روکتے ہوئے کہا تو ماں کی گود میں بیٹھے، سینے سے سر لگائے حسن نے فوراً سر اٹھا کر پہلے حیدر اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے معصوم چہرے پہ عجیب سا ڈر اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ صدف نے اثبات میں سر ہلایا تو حسن نے بھی فوراً ہاں کہا۔ حیدر کو اس لمحے، اپنا باپ اور اپنا بچپن بہت یاد آئے تھے۔

"میرے ساتھ آؤ۔" حیدر نے نرمی سے کہا اور حسن کو گود میں اٹھا کر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ آئس کریم کا آرڈر دے کر وہ حسن کو ایک کھلونوں والی دکان میں لے گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے باہر نکلے تو حسن کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں اپنا من پسند کھلونا اور دوسرے ہاتھ میں آئس کریم کون پکڑے، وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ حسن کو خوش دیکھ کر صدف کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔

حسن واپس آیا تو ماں کو اپنا کھلونا دکھانے لگا۔ حیدر نے صدف اور اپنی آئس کریم کون بھی لی تھی۔ آئس کریم کھاتے ہوئے، وہ باتیں کرتے رہے۔ جب کچھ دیر کے بعد صدف اور حسن نارمل ہو گئے تو حیدر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور انھیں گھر ڈراپ کر دیا۔

اس دن کے بعد سے صدف کا رویہ، حیدر کے ساتھ بہت بدل گیا تھا۔ بلکہ اس کا دل نئے انداز میں حیدر کے لیے دھڑکنے لگا تھا۔ حیدر کی نرم مزاجی اور رحم دلی وہ دیکھ چکی تھی۔ صدف، جسے ولید کی اچانک موت نے توڑ کر رکھ دیا تھا اپنے بیٹے کی خاطر وہ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی گزار رہی تھی۔ مگر بہت جلد اسے احساس ہو گیا تھا کہ جوان اور بیوہ عورت کا اکیلے زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس کے آگے پیچھے بھائی یا باپ کی صورت میں کوئی تحفظ نہ موجود ہو۔ وہ کب تک اکیلے رضوان کی سازشوں کا سامنا کرتی یا کب تک اکیلے معاشرے کے آوارہ اور بیمار ذہن رکھنے والوں سے بچتی۔ کب تک اس کا معصوم بچہ، عدم تحفظ کے احساس سے لرزتا، کانپتا رہتا۔

صدف، خود سے زیادہ اپنے بیٹے کے لیے سوچ رہی تھی۔ جس کی متوازن شخصیت کے لیے، ایک مرد، ایک باپ کا سر پر موجود ہونا بہت ضروری تھا۔ حسن کے باپ کے روپ میں اسے حیدر کے علاوہ کوئی اور نہیں جچ رہا تھا مگر یہ صرف صدف کی سوچ تھی۔ حیدر کیا سوچتا ہے اور کیا نہیں۔ یہ صدف کو نہیں پتا تھا۔

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حیدر شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی اور ماں گاؤں میں رہتے ہیں۔

☆☆☆

"بے بے! ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ حیدر گاؤں کیوں نہیں آیا؟"

زینب کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی۔ اس لیے وہ دھیرے دھیرے گھر کے کام کر رہی تھی کیونکہ درنایاب کو سونے، کھانے اور محلے کے گھروں میں آنے جانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ زینب باقی کاموں سے فارغ ہو کر، اپنے چند کپڑے دھونے کے لیے ابھی بیٹھی ہی تھی، جب محلے کا چکر لگا کر واپس آئی درنایاب نے روکھے انداز میں سوال کیا۔

"پہلے تو تم ادب کے ساتھ شوہر کا نام لینا سیکھو۔"

زینب نے ناگواری سے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ ہاتھ چلاتے ہوئے کپڑے دھو رہی تھی۔ درنایاب طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" درنایاب نے پھر سوال کیا تو زینب نے ایک نظر اس پر ڈالی جو کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی۔

"اسے کوئی کام ہوگا۔ میری بات نہیں ہوئی۔" زینب نے لاپروائی سے کہا۔

"ایسے ہی بات نہیں ہوئی؟ حیدر نے موبائل فون آپ کو تو لے کر دیا ہوا ہے۔ دونوں ماں بیٹا خود

باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو حیدر نے موبائل فون لے کر دیا ہی نہیں حالانکہ کتنی بار کہا تھا کہ۔۔!"

حسب معمول درنایاب کا شکوہ شروع ہو گیا۔ زینب نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنے کپڑے دھو کر اب اچھی طرح نچوڑ رہی تھی۔ زینب ہاتھ میں کپڑے کپڑے، تار پر پھیلانے کے لیے اٹھ کر صحن کے کونے کی طرف بڑھی جب درنایاب کی آواز پر اس کے قدم رکے تھے۔

"بہت چالاک بنتا ہے۔ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ گاؤں نہیں آئے گا تو کیا میں اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹ جاؤں گی۔"

درنایاب زہر خند لہجے میں بولی۔

"کون سا مطالبہ؟" تار پر جھٹک کر دوپٹہ پھیلاتی زینب نے حیرانی سے سوال کیا۔

"سب جانتی ہیں آپ۔ اس لیے تو بیٹے کی طرف داری کر رہی ہیں۔ میں نے حیدر کو صاف کہہ دیا تھا کہ میں اب گاؤں میں ہرگز نہیں رہوں گی۔ مجھے اس کے ساتھ شہر رہنا ہے مگر وہ آپ کی وجہ سے نہیں مان رہا۔ میں شہر جا کر کیوں نہ رہوں؟ گاؤں میں کیا رکھا ہوا ہے۔ جو شہر میں مزے ہیں۔ وہ گاؤں میں کہاں؟ آپ دونوں نے ہمیشہ میرے ساتھ غلط کیا۔ پہلے آپ مجھے شہر سے گاؤں لے آئیں۔ میں تعلیم حاصل نہیں کر سکی، شہر میں ہوتی تو شاید کچھ پڑھ جاتی۔ اب آپ کا بیٹا مجھے شہر سے دور رکھ رہا ہے۔ مگر میری بھی ضد ہے کہ....."

درنایاب کی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ زینب تیورا کر صحن میں گری۔ اس کے سر پر چوٹ لگی اور خون بہنے لگا۔ درنایاب حواس باختہ ہو کر چیخنے لگی۔

"ماسی ثریا! جلدی سے آئیں۔ بے بے گر گئی۔"

درنایاب نے ساتھ والی پڑوسن کو آواز دی تھی۔ کچھ دیر میں ہی سارا محلہ وہاں اکٹھا ہو گیا۔ کوئی بھاگ کر ڈسپنسری پہ موجود ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔ حیدر کے بچپن کے دوست نے ساری صورتحال دیکھتے ہوئے اسے شہر فون کر دیا اور جلد از جلد گاؤں پہنچنے کی تلقین کی۔ حیدر یہ سن کر حواس باختہ شہر سے گاؤں کے لیے نکلا تھا۔

☆☆☆

"حیدر! میں اب ٹھیک ہوں بیٹا! جا کر سو جاؤ۔" زینب کتنی دیر سے پاؤں دباتے حیدر کو وہاں سے اٹھنے کا کہہ رہی تھی مگر حیدر ماں کے پاؤں کے پاس سے اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔

"بے بے! میری فکر مت کریں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر دی تھی۔ حیدر رات گئے گاؤں پہنچا تھا۔ زینب حیدر کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور حیدر ماں کے سر پر بندھی پٹی دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"ڈاکٹر نے بتایا کہ بے بے کا بی پی ہائی تھا۔ اس لیے چکرا کر گری اور سر پر چوٹ لگوا بیٹھی۔"

درنایاب نے حیدر کو چائے پیش کرتے ہوئے بتایا تو حیدر سر ہلا کر رہ گیا۔ درنایاب، زینب کی بیماری اور تکلیف بھول کر حیدر کو دیکھ کر خوشی سے سرشار چہکنے لگی مگر حیدر اسے نظر انداز کر کے بے بے کے سرہانے بیٹھا رہا۔ ماں کے کمرے میں ہی سو گیا۔ وہ بے بے کا خیال ایسے رکھ رہا تھا جیسے بے بے کہیں چلی جائیں گی۔ دوسری طرف درنایاب انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔

"ماں کے علاوہ تو اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے۔" درنایاب نے غصے سے خود کلامی کی تھی۔ آج صبح سے حیدر ماں کے کمرے میں موجود تھا کبھی ماں کو سیب کاٹ کر کھلا رہا تھا، کبھی فریش جوس بنا کر پلا رہا تھا۔

"حیدر! میں اب ٹھیک ہوں۔ تم جا کر آرام کرو۔ سفر کر کے تھکے ہوئے آئے ہو۔" زینب نے نرمی سے کہا۔

"ہاں! میں نہا کر کپڑے بدل لوں۔ آپ کی چوٹ دیکھ کر تو سب کچھ بھول گیا تھا۔"

حیدر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا اور کمرے

سے باہر نکل گیا۔ زینب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح درنایاب کی باتیں لگنے لگی تھیں۔

''حیدر میرے بیٹے! تم نے ہمیشہ میری خوشی، میرے آرام کا سوچا۔ میں کتنی انجان، نا سمجھ رہی۔''

زینب نے سسکی لیتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔ زینب کو درنایاب کے رویے نے توڑ کر رکھ دیا تھا مگر وہ یہ بات حیدر سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ درنایاب ان کا اپنا انتخاب تھی، جسے انہیں آخری سانس تک بھگتنا تھا۔

☆☆☆

''میرے کپڑے استری کر دیے؟'' حیدر معروف انداز میں کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھی درنایاب سے سوال کیا۔

''آ گیا میرا خیال؟'' درنایاب ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر حیدر کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ حیدر نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا مطلب؟'' حیدر نے ناگواری سے سوال کیا۔

''تمہیں گاؤں آئے دوسرا دن ہونے والا ہے اور تم ماں کی پٹی سے لگ کر بیٹھے ہوئے ہو۔ بیوی کی کوئی فکر ہی نہیں۔ میں کیا تمہاری نوکرانی ہوں جو کھانے، پینے، کپڑوں کا دھیان رکھوں۔'' درنایاب نے جاہل عورتوں کی طرح چیختے ہوئے کہا تو حیدر اپنے غصے کو ضبط کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ہیں! اس نے آگے سے کچھ کہا ہی نہیں۔'' درنایاب نے حیرانی سے سوچا اور پھر حیدر کے پیچھے گئی تو دیکھا کہ حیدر زینب کے کمرے میں، فرش پر چادر بچھائے اپنے کپڑے استری کر رہا ہے۔ درنایاب کو آگ لگ گئی۔

''تم اپنی ماں کو یہ دکھانا چاہتے ہو کہ میں تمہارا خیال نہیں رکھتی؟ تم تو آرام سے کچھ دن گزار کر چلے جاؤ گے مگر تمہاری بوڑھی ماں کو تو مجھے ہی دیکھنا پڑے گا اور۔۔۔!'' درنایاب دروازے کے بیچ میں کھڑی ہو کر چیخنے لگی۔

''درنایاب! اب ایک لفظ نہیں۔ ورنہ.....''

حیدر نے انگلی اٹھا کر سختی سے کہا تو اس کے غصے سے خائف ہو کر درنایاب نے زینب کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار تھے۔ درنایاب پاؤں مارتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ حیدر سر جھٹک کر اپنے کپڑے استری کرنے لگا۔ زینب کا دل کٹ کر رہ گیا۔ تھکے ہارے، رات کے جاگے بیٹے کو ایک لمحے کا سکون نہیں ملا تھا۔

''حیدر!'' زینب نے پکارا تو حیدر چونک کر ماں کو دیکھنے لگا۔

''بے بے! کچھ چاہیے؟'' حیدر نے فکرمندی سے سوال کیا تو بے بے نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''مجھے معاف کر دے بیٹا! میں نے تیرے ساتھ زیادتی کی۔'' زینب پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو حیدر بجلی کی تیزی سے ماں کے پاس گیا اور اس کے ہاتھ تھام کر کھول دیے۔

''بے بے! کیوں مجھے گناہ گار کر رہی ہیں؟ درنایاب کے کسی فعل یا عمل کے لیے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ وہ باشعور لڑکی ہے۔ اچھے برے کی سمجھ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے۔ آپ فکر مت کریں۔'' حیدر نے ماں کو تسلی دی تھی۔

''وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے تو اسے لے جا، میں اکیلی رہ لوں گی۔'' زینب نے آہستہ آواز میں کہا تو حیدر ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

''مگر میں آپ کو اکیلا نہیں دیکھ سکتا۔ دوسری بات درنایاب بہت ضدی اور ہٹ دھرم لڑکی ہے۔ میں شہر میں اس کے تماشے افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس لیے جیسا چل رہا ہے، چلنے دیں۔''

حیدر نے قطعی انداز میں کہا تو زینب چپ کر گئی۔ حیدر ایک ہفتے گاؤں رہا۔ جب تک زینب ٹھیک نہیں ہو گئی۔ وہ ماں کا پوری طرح خیال رکھتا رہا۔ ماں کے کمرے میں سوتا تھا۔ درنایاب کو اس

نے نہیں بلایا اور نہ درنایاب نے حیدر کو منانے کی کوشش کی۔

حیدر اپنے ہاتھوں سے کچا پکا سالن، انڈا کچھ بھی بنا کر کھا لیتا، یا ساتھ والی ماسی ثریا سے کہہ دیتا روٹی تندور سے لے آتا۔ زینب یہ سب دیکھ کر کڑھتی رہی جبکہ درنایاب اپنی اکڑ میں رہی۔ ایک صبح درنایاب سو کر اٹھی تو حیدر شہر کے لیے نکل چکا تھا۔ درنایاب غصے سے سلگ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''تمہاری بے بے اب کیسی ہیں؟''

حیدر ایک ہفتے کی چھٹی کے بعد جب آفس پہنچا تو تھکے ہوئے لہجے میں صدف نے سوال کیا۔ حیدر چونک گیا۔ صدف کے چہرے پہ تھکاوٹ اور آنکھوں میں سرخی تھی جیسے کئی راتوں سے سوئی نہیں۔

''شکر ہے مگر تمہیں کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟'' حیدر نے سوال کیا تو صدف کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''کیا ہوا صدف؟'' حیدر کا نرم دل تڑپ اٹھا۔

''حسن پچھلے تین دن سے ہسپتال میں داخل ہے۔ ڈائیریا ہوا ہے۔ اس لیے پریشان ہوں۔ آج بھی بہت مشکل سے آفس آئی ہوں۔ مزید چند دن کی چھٹی لینے کے لیے۔''

صدف نے اداسی سے کہا تو حیدر اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر صدف کی چھٹی کے لیے ساری کوشش حیدر نے کی۔ صدف کو مزید ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی۔ صدف جانے لگی تو حیدر نے بھی حسن کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ صدف سر ہلا کر رہ گئی۔

حیدر کے ساتھ، جب صدف ہسپتال پہنچی تو وہاں حسن کے پاس غزالہ اور اس کا شوہر رضوان موجود تھے۔ رضوان کا منہ بنا ہوا تھا۔

''اتنی دیر لگا دی۔ پتا بھی ہے کہ بچوں کے اسکول سے واپس آنے کا وقت ہو رہا ہے۔'' رضوان نے منہ بنا کر کہا پھر حیدر کو دیکھ کر چونک گیا۔

''آپ کی تعریف؟'' رضوان نے عجیب نگاہوں سے سر سے لے کر پیر تک حیدر کو گھورا تھا۔ غزالہ فکرمندی سے دیکھنے لگی جبکہ صدف فوراً حسن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''ہم ایک آفس میں کام کرتے ہیں۔'' حیدر نے سنجیدگی سے کہا اور پھر رضوان کو نظر انداز کر کے حسن کی طرف بڑھ گیا۔ رضوان نے طنزیہ انداز میں اس کی پشت کو گھورا اور پھر غزالہ کو دیکھ کر یہاں سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

''تمہاری بہن کسی نئے چکر میں لگ رہی ہے۔'' رضوان نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا تو غزالہ خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

صدف کی بے رنگ اور بے رونق زندگی دیکھ کر اس کا دل دکھتا تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ صدف دوسری شادی کر لے۔

''یہ لڑکا اچھا لگ رہا ہے۔ کاش صدف کی اس سے شادی ہو جائے۔'' واپسی کے سفر میں غزالہ نے دل میں دعا کی تھی۔

☆☆☆

''حیدر! تم گھر چلے جاؤ۔ رات ہو گئی ہے۔'' صدف نے کہا تو حیدر نے چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ بچوں کے وارڈ کے باہر موجود راہداری میں موجود تھے۔ جہاں اور بھی بہت سے مرد اور عورتیں موجود تھیں۔

''مگر تم اکیلی کیسے رہو گی؟'' حیدر نے فکرمندی سے سوال کیا۔

''قسمت نے جب اکیلا چھوڑ دیا ہے تو کیا کر سکتی ہوں۔'' صدف نے تھکے ہوئے انداز میں بینچ سے ٹیک لگائی تھی۔ وہ بہت اداس اور مضمحل لگ رہی تھی۔

''میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ تمہارے لیے کھانا لے آؤں گا۔'' حیدر نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا تو صدف اسے روکتی رہ گئی مگر حیدر چلا گیا۔ حیدر کے جانے کے بعد حسن کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے فوراً ایک انجکشن لکھ کر دیا۔

"حیدر! میرے بچے کو انجکشن کی ضرورت ہے۔ میں کس کے سہارے پہ بیٹھ کر انتظار کرتی۔ تم بھی تو ایک اجنبی مہربان ہو۔"

صدف نے کہا تو حیدر ساکت رہ گیا۔ صدف مڑ کر جانے لگی تو حیدر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"صدف! تم حسن کے پاس جاؤ۔ میں انجکشن لے کر آتا ہوں۔" حیدر نے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے گم صم کھڑی صدف کے ہاتھ سے پرچہ پکڑا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جب تک صدف اندر نہیں چلی گئی حیدر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"ذلفی! تمہیں بھی میں غلط لگ رہی ہوں؟"

زینب نے دکھی انداز میں اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا تھا۔ ذلفی اور شبنم بچوں کے ساتھ صبح گاؤں پہنچے تھے کیونکہ زینب نے حیدر کے جانے کے بعد انھیں فون کیا۔ ذلفی، بہن کا پریشان لہجہ سن کر ساری رات بے چین رہا۔ صبح پہلی گاڑی سے گاؤں کے لیے نکلا۔ جب زینب نے اکیلے میں اس سے درنایاب کے رویے کی شکایت کی تو ذلفی عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"درنایاب ایسی نہیں ہے۔" ذلفی نے دوٹوک انداز میں کہا تو زینب نے دل گرفتی سے اس کی طرف دیکھا۔

"زینب باجی! درنایاب کو مجھ سے زیادہ، آپ جانتی ہیں۔ وہ لاڈلی ہے، تھوڑی ضدی بھی مگر درنایاب کا دل بہت اچھا ہے۔ ابھی اس کا بچپنا نہیں گیا۔ وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔" ذلفی نے اطمینان سے کہا۔

"ذلفی! تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔ درنایاب کی شادی کو دو سال ہونے والے ہیں۔ آخر کب تک وہ بچی بنی رہے گی؟"

زینب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"زینب باجی! آپ کتنی پھوپھو ہو کر، اتنی جلدی بہو سے اکتا گئی ہیں۔ شبنم نے مجھے پہلے بھی

صدف دوڑی ہوئی ڈسپنسری کی طرف وہاں وہ انجکشن نہیں تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

"آپ کو باہر کی کسی ڈسپنسری سے یہ انجکشن مل جائے گا۔ ہمارے پاس اسٹاک آج ہی ختم ہوا ہے۔" ڈسپنسری پہ موجود لڑکے نے کہا تو صدف حواس باختہ ہسپتال سے باہر نکلی تو باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ صدف نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وارڈ میں اس کا بیمار بچہ ماں کے لیے رو رہا تھا۔ مگر وہ اسے چھوڑ کر آ گئی تھی کیونکہ اس کی دوائی لانا بھی ضروری تھا۔ صدف نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کسی رکشے یا ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ بے چینی سے بار بار پلٹ کر ہسپتال کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت ایک گاڑی اس کے پاس رکی۔

"میڈم! لفٹ چاہیے؟"

دو اوباش ٹائپ لڑکوں نے اسے سر سے لے کر پیر تک گھورتے ہوئے خباثت سے پوچھا تو صدف نے غصے سے ان کو گھورا۔

"دفع ہو جاؤ!" صدف نے ناگواری سے کہا تو ان لڑکوں کو غصہ آ گیا۔

"ابھی بتاتے ہیں۔" ایک لڑکا گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگا جب حیدر کی گاڑی ان کے پیچھے رکتی دیکھ کر صدف تیزی سے اس کی طرف بھاگی۔ حیدر گاڑی سائیڈ پہ روک کر نیچے اترا۔ لڑکوں نے ایک اجنبی مرد کو دیکھا تو فوراً رفو چکر ہو گئے۔ صدف، حیدر کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا صدف؟ کون لوگ تھے یہ؟" حیدر نے فکرمندی سے پوچھا مگر صدف روئے جا رہی تھی۔ حیدر اس کی حالت سمجھ گیا۔

"تم ہسپتال سے باہر کیوں نکلی ہو؟ میں نے کہا تو تھا کہ کچھ دیر میں واپس آ جاؤں گا۔ پتا بھی ہے کہ آج کل کیا حالات ہیں اور....."

حیدر غصے میں کہنے لگا۔ صدف نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

تھا کہ آپ کا رویہ درنایاب کی شادی کے بعد ساسوں والا ہو چکا ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔'' ذلفی نے کہا تو زینب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''درنایاب کا مطالبہ بھی غلط نہیں ہے۔ آپ حیدر کو سمجھائیں کہ اسے شہر لے جائے۔ آپ کو یہاں کیا مسئلہ ہے۔ آس پاس سب جاننے والے لوگ ہیں۔ ویسے بھی ان دونوں کی عمر ہے۔ خوشی سے گھر بسانے دیں۔''

ذلفی نے دوٹوک انداز میں کہا تو زینب سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بھیگی آنکھیں، ذلفی دیکھے۔ اس وقت درنایاب کمرے کے دروازے پہ آئی۔

''ابا! کھانا کھالیں۔''

درنایاب نے زینب کو مکمل طور پر نظر انداز کیا اور باپ کو کہہ کر چلی گئی۔ ذلفی بہن کے جھکے سر کو دیکھ کر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

زینب خاموشی سے آنسو بہاتی بستر پر لیٹ گئی۔ آج ذلفی کو اپنی بیٹی کی فکر ہو رہی تھی مگر جب زینب اسے اپنے ساتھ لائی تھی تو ذلفی نے کبھی پلٹ کر درنایاب کو پوچھا تک نہیں تھا۔ اس کا خرچا نہیں اٹھایا۔ کبھی کبھار جب وہ گاؤں آتا تو درنایاب سے مل لیتا تھا مگر اس میں وہ والہانہ پن نہیں ہوتا تھا جو اس رشتے کا تقاضا ہے۔

''اپنی بیٹی کی خوش گوار زندگی کی تمنا دل میں پالتے ہوئے، بیوہ بہن کی تنہائی اور بڑھاپے کو بھول گئے۔''

زینب نے دل گرفتی سے سوچا تھا۔ اس کی صحت دن بہ دن تنزلی کی طرف جا رہی تھی۔

دراصل زینب کو درنایاب کے رویے نے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ درنایاب، اس کے لیے وہ میٹھا زہر ثابت ہوئی، جو ایک مدت سے اس کے بدن کے کسی حصے میں موجود تھا اور آہستہ آہستہ کر کے سارے جسم میں پھیل گیا۔

اب کو زینب کا دل بھی نیلا پڑنے لگا تھا۔ وہ حیدر کے سامنے اس تکلیف کا اظہار نہیں کرتی تھی کہ مبادا وہ درنایاب سے متنفر ہو کر اسے چھوڑ کر چلا جائے۔

صحن سے ہنسنے، بولنے، برتنوں کے مسلسل کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی نے زینب کو کھانے میں شامل ہونے کا نہیں کہا۔ درنایاب تو زینب کو سیدھے منہ بلاتی ہی نہیں تھی۔

زینب اپنی ہانڈی روٹی خود کرتی۔ درنایاب اپنی مرضی سے زینب کا پکایا سالن تو لے لیتی تھی مگر زینب کو کچھ پکا کر نہیں دیتی تھی۔ شام ڈھلے ذلفی اور اس کے بیوی بچے واپس چلے گئے۔ گھر میں پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔

زینب کو وقت نے بہت تلخ سبق سکھا دیا تھا۔ اس نے جس پر تکیہ کیا، وہی پتے ہوا دینے لگے تھے۔

☆☆☆

''حسن کی طبیعت اب بہتر ہے۔ چائے کے ساتھ یہ سینڈوچ لایا ہوں۔ مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

حیدر نے مطمئن انداز میں بینچ پہ خاموش بیٹھی صدف کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دونوں اس وقت ہسپتال کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں فاصلے پر کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ اس وقت ڈاکٹرز راؤنڈ پہ تھے۔ اس لیے سب اٹینڈنٹ باہر نکال دیے گئے تھے۔ صدف نے بے دلی سے چائے اور سینڈوچ پکڑ لیا۔

''پلیز صدف!'' حیدر نے اسے گم صم بیٹھے دیکھا تو ہاتھ میں پکڑے سینڈوچ کی طرف اشارہ کیا۔

صدف نے سر ہلاتے ہوئے، سینڈوچ کھانا شروع کیا۔

''اور کھاؤ گی؟'' حیدر نے اپنا آدھا سینڈوچ صدف کی طرف بڑھایا تو صدف نے بے تکلفی سے

پڑ گیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے بہت بھوک لگی ہے؟"

صدف اب نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔

"تمہیں کھاتا دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ کافی بھوکی ہو۔" حیدر نے شرارت سے کہا تو صدف اسے گھورتے ہوئے مسکرا دی۔

"شکر ہے! تم نارمل تو ہوئیں۔" حیدر نے سکھ کی سانس لی۔

"حیدر! میں بہت بہادر عورت ہوں مگر حسن کی بیماری اور اکیلے پن نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایک تنہا جوان عورت، رات کے وقت اپنے بیمار بچے کی دوائی لینے نہیں جا سکتی کیونکہ ایک مرد کے بغیر وہ محفوظ نہیں ہے۔ عورت کے لیے مرد وہ ڈھال ہوتا ہے، جس کے پیچھے وہ محفوظ ہوتی ہے۔" صدف نے تھکے ہوئے انداز میں کہا اور بینچ سے ٹیک لگا لی۔

"صدف! تم دوسری شادی کر لو۔ یہ تمہارے اور حسن کے لیے بہت بہتر ہے۔" حیدر نے مشورہ دیا۔

"دوسری شادی؟" صدف نے چونک کر حیدر کی طرف دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہاں! تمہاری کون سی اتنی عمر ہے۔ ستائیس سے اٹھائیس سال کے درمیان ہو۔ خوب صورت، نیک اور شریف ہو۔ اپنا کماتی ہو۔ گھر بھی ہے۔ شادی کے لیے اور کیا چاہیے۔" حیدر نے جلدی سے کہا۔

"بیوہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہوں۔" صدف نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"بہت سے مردوں کو ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔" حیدر نے کندھے اچکا کر کہا تو صدف نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں فرق پڑتا ہے؟" اچانک صدف نے کہا تو حیدر چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟" حیدر نے الجھے انداز کے ساتھ سوال کیا۔

"حیدر! اگر تمہیں ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تو کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟" صدف نے اطمینان سے کہا تو حیدر ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا

"میں.....؟ مگر میں شادی شدہ ہوں۔" حیدر نے ہکلا کر کہا تو صدف مسکرا دی۔

"دوسری شادی کرنا جرم نہیں ہے۔ تم اپنے گھر میں بات کر لو۔ مجھے تمہاری پہلی شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

صدف نے کہا تو حیدر چپ چاپ بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

"آرام سے سوچ کر جواب دینا۔ جلدی نہیں ہے۔ مگر میں حسن کے معاملے میں صرف تم پہ یقین کر سکتی ہوں۔ کوئی اور مرد اسے وہ پیار نہیں دے گا، جو میں نے تمہارے انداز اور نرمی میں دیکھا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اپنی پہلی شادی سے خوش نہیں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم دو ٹوٹے ہوئے، اداس لوگ جڑ کر ایک مکمل اور خوش حال فیملی بن سکیں۔"

صدف نے دھیمے لہجے میں کہا اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ حیدر کتنی دیر سوچوں کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ صدف ایک بہترین ہم سفر ثابت ہو گی۔ اتنا اسے بھی اندازہ تھا۔

"زندگی کی خوشیوں پہ میرا بھی حق ہے۔"

اسے دریاب کا آخری بار کہا رویہ یاد آیا تو وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

حیدر گہری نیند میں تھا۔ اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر سائیڈ میز پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔

ذلفی کی آواز سن کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ماموں! سب خیریت ہے؟" حیدر نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔

"ہاں بیٹا! سب ٹھیک ہے۔ تم کہاں ہو؟" ذلفی نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ حیدر ٹھٹک گیا۔

"اپنے گھر پر۔" حیدر نے نپے تلے انداز میں

لیا۔

"مگر میں تمہارے گھر آیا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ چھ مہینے پہلے تم یہ گھر چھوڑ کر جا چکے ہو۔" ذلفی نے حیرانی سے سوال کیا۔ حیدر پہلے ایک فیملی کے اوپر والے پورشن میں کرائے دار کے طور پر رہتا تھا۔

"ہاں! اب گھر تبدیل کر لیا ہے۔ آپ کو کوئی کام تھا۔" حیدر نے پریشانی سے سوال کیا۔

"ہاں! اپنے گھر کا پتا دو۔ میں ملنے آ رہا ہوں۔" ذلفی نے سنجیدگی سے کہا تو حیدر کے چہرے پر پریشانی کے آثار چھا گئے۔

"ایڈریس دے دیجیے۔" پاس بیٹھی صدف نے اطمینان سے کہا تو حیدر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ حیدر سر ہلاتے ہوئے پتا سمجھانے لگا۔ فون بند کر کے وہ صدف کی طرف متوجہ ہوا۔

"ذلفی ماموں کو آج میری یاد کیوں آ گئی۔"

"اپنے پیارے سے بھانجے کی محبت میں آئے ہوں گے۔ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ فریش ہو جائیں۔ میں حسن کو جگانے جا رہی ہوں۔ پھر زبردست سا ناشتہ کرتے ہیں۔"

صدف نے اپنے بال سمیٹتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اتوار والے دن وہ دیر سے سو کر اٹھتے تھے کیونکہ سوتے بھی فجر پڑھ کے تھے۔ حیدر نے صدف سے چھ مہینے پہلے سادگی سے نکاح کر لیا تھا۔ اس نے ایک اچھے ایریا میں پانچ مرلے کا گھر کرائے پہ لیا۔ صدف نے اپنا پورشن کرائے پہ چڑھا دیا اور حیدر کے گھر میں شفٹ ہو گئی۔ حیدر، صدف کے گھر جا کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کی خودداری پہ چوٹ پڑتی تھی۔

دوسرا وہ رضوان کی حرکتوں سے بھی واقف تھا۔ صدف کو حیدر کی خودداری بہت اچھی لگی تھی۔ رضوان کو صدف کی دوسری شادی اور اوپر والا پورشن کرائے پہ چڑھانے کا شدید صدمہ ہوا تھا مگر صدف اپنی مرضی

حیدر، صدف اور حسن کے ساتھ پرسکون اور خوش گوار زندگی گزار رہا تھا۔ حسن، حیدر کے بہت قریب آ چکا تھا۔ دونوں بہت سے گیمز کھیلتے، باتیں کرتے۔ صدف کو اپنے فیصلے کی درستی پہ خوشی ہوتی تھی۔ ویک اینڈ پہ وہ تینوں اچھی سی مووی دیکھتے۔ ہوٹلنگ کرتے، گیمز کھیلتے۔ اس میں رات گزر جاتی تھی۔

حیدر، ذلفی ماموں کے بارے میں سوچتا ہوا واش روم چلا گیا۔ فریش ہو کر اس نے اپنا من پسند قیمہ بھرے پراٹھوں کے ساتھ پودینے کے رائتہ کا ناشتہ کیا۔ جس وقت اس نے چائے کا کپ ختم کر کے میز پر رکھا۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" حیدر تیزی سے اٹھ کر باہر گیا۔ کچھ دیر کے بعد کسی کے خوشی سے اونچا بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک مردانہ اور ایک زنانہ آواز سن کر صدف تجسس کے مارے دروازے کے پاس آئی اور پھر ٹھٹک کر رک گئی۔ سامنے سے اندر آتے ہوئے افراد کی کیفیت بھی کچھ الگ نہیں تھی۔ درنایاب نے پہلے حیدر اور پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا تھا۔ ذلفی بھی ہکا بکا کھڑا تھا۔

"حیدر! یہ عورت کون ہے؟" درنایاب نے حیرانی سے دروازے میں کھڑی، خوب صورت اور اسٹائلش لڑکی کو کھڑے دیکھ کر ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ لوگ اندر چلیں۔ میں بتاتا ہوں۔" حیدر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ ذلفی ماموں، درنایاب کو لے کر اس کے گھر چلے آئیں گے۔

"اندر کیا چلیں۔ ابھی بتاؤ۔ اس لیے گاؤں نہیں آتے تھے؟ مجھے شہر لانے سے منع کر دیا۔ اس چڑیل کی وجہ سے نا۔" درنایاب چیخ چیخ کر بولنے لگی۔

صدف نے ناگواری سے خود کلامی کی اور اندر چلی گئی جبکہ اپنے لیے جاہل اور گنوار کا لقب سن کر درنایاب گلا پھاڑ کر رونے لگی۔

''ہائے ابا! میں لٹ گئی، برباد ہوگئی۔''

درنایاب باپ سے لپٹ گئی۔ ذلفی خود ہکا بکا کھڑا تھا جبکہ حیدر سر تھام کر رہ گیا۔

☆☆☆

زینب حیرت زدہ بیٹھی ہوئی تھی جبکہ اس کے سامنے دوسری چارپائی پہ درنایاب اور ذلفی کے ساتھ شبنم بیٹھی ہوئی تھیں۔ شبنم کے بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔

درنایاب اور ذلفی حیدر کے گھر سے اسی وقت نکلے اور پہلے اپنے گھر پہنچے۔ وہاں سے شبنم اور بچوں کو لے کر گاؤں کے لیے نکلے۔ گاؤں پہنچ کر انھوں نے جب حیدر کی دوسری شادی کی خبر زینب کو سنائی تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔

دو دن پہلے ذلفی، درنایاب کو اپنے ساتھ شہر لے گیا تھا مگر زینب کو یہ بتائے بغیر کہ وہ درنایاب کو حیدر کے پاس چھوڑنے جا رہا ہے۔ زینب کو بیٹے کی دوسری شادی کا دکھ تھا مگر اپنے بھائی اور بھتیجی کی چالاکی اور بے حسی پہ افسوس بھی۔

''ذلفی! درنایاب تو بے وقوف اور ناسمجھ ہے مگر مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ تم نے کہا تھا کہ درنایاب تمہارے گھر کچھ دن رہنے جا رہی ہے اور تم حیدر کے پاس پہنچ گئے۔'' زینب نے حیرت سے کہا۔

''ابا! دیکھا بے بے کو۔ ابھی بھی اپنے لاڈلے بیٹے کی فکر ہے۔ میری نہیں۔'' درنایاب نے روتے ہوئے اپنے باپ سے کہا تو ذلفی اسے تسلی دینے لگا جبکہ شبنم اس صورتحال پہ بہت خوش تھی۔

''بے بے یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے حیدر کو مجھ سے دور کیا۔ مجھے شہر نہیں جانے دیا۔ اس نے چالاکی سے شادی کر لی۔ آپ ضرور اس سب میں شامل ہیں۔'' درنایاب نے بدتمیزی سے کہا تو زینب نے سخت نگاہ اس پر ڈالی۔

''یہ سب تمہاری اپنی وجہ سے ہوا ہے۔ کتنی بار سمجھایا تھا کہ شوہر کا خیال رکھو۔ اس کی فکر کرو۔ اس کی چیزوں کا دھیان رکھا کرو۔ اس سے نرمی اور محبت سے بات کرو۔ مگر تم کیا کرتی تھیں؟ جب بھی وہ آتا لڑنا شروع کر دیتیں۔ نہ اسے ناشتہ بنا کر دیتی اور نہ کھانے کا دھیان رکھتیں۔ وہ بھلا تمہیں کتنی دیر اور کب تک برداشت کرتا۔'' زینب نے تلخ لہجے میں کہا تو درنایاب رونا دھونا بھول کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''دیکھ لیا ذوالفقار صاحب! مجھے طعنے دیتے تھے، بیٹی مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی ہے۔'' شبنم نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک کہا شبنم بیگم تم نے۔ میری بے وقوفی جو اسے تمہارے رنگ سے بچانے کے لیے اپنے پاس لے آئی مگر گئی یہ تم پہ ہی ہے۔ عادتوں اور مزاج میں۔'' زینب نے سخت انداز میں کہا تو شبنم کا چہرہ لال ہوگیا۔

''زینب باجی! آپ حیدر کو سمجھائیں کہ اس لڑکی کو طلاق دے دے ورنہ.....'' ذلفی کہتے ہوئے چپ کر گیا۔

''ورنہ کیا ذلفی! کیا تم درنایاب کو ساری زندگی اپنے گھر بٹھا کر کھلا سکتے ہو؟'' زینب نے اطمینان سے سوال کیا تو ذلفی اور شبنم کا رنگ ایک ساتھ اڑا تھا۔

''نہ بھئی! میرے اپنے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہی بہت ہے۔ میں درنایاب کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی ہو۔ چلو ذلفی! ان کے مسئلے ہیں یہ خود حل کرتے پھریں گے۔ چلو بھی.....''

شبنم نے غصے سے شوہر کو کہنی ماری اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ذلفی نے شرمندگی سے درنایاب کے سر پہ ہاتھ رکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ عصر کے وقت صحن میں کوئی چڑیوں کا شور بڑھ گیا تھا مگر وہاں بیٹھے دو نفوس اپنی اپنی جگہ بت بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ درنایاب کو اس کا سگا باپ بیچ منجدھار چھوڑ گیا تھا۔

ہی باقی تھا۔

☆☆☆

"صدف! میں گاؤں جارہا ہوں۔ بے بے کا فون آیا تھا۔"

حیدر نے رات کی خاموشی میں صدف سے کہا۔ وہ کل سے حیدر کو بہت پریشان دیکھ رہی تھی۔ آج شام میں اس کی ماں کا فون آیا تو حیدر نے صدف کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا۔ صدف سر ہلانے لگی۔

"ٹھیک ہے! میں تیاری کرتی ہوں۔ ہمیں وہاں کتنے دن رہنا ہوگا۔" صدف نے مصروف انداز میں کہا تو حیدر چونک گیا۔

"کیا مطلب؟ میں اکیلا جارہا ہوں۔"

اس نے جھنجھلا کر کہا تو صدف نے اس کے بازو پہ ٹیک لگالی۔ حیدر کا ذہنی دباؤ ایک دم کم ہوا تھا۔

"حیدر! تم بے بے کو ہماری دوسری شادی کے بارے میں بتانے اور منانے جارہے ہو۔ میرا ساتھ جانا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے مجھ سے مل کر وہ بھی تمہاری طرح مجھ سے محبت کرنے لگیں۔" صدف نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

"صدف! وہاں کے حالات میرے بس میں نہیں ہوں گے۔ تم اتنی سختی برداشت کرلو گی؟" حیدر نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"تم ساتھ ہو تو سب منظور۔ اب بتاؤ کتنے دن کی چھٹی لیں۔"

صدف نے جلدی سے پوچھا تو حیدر سر ہلاتے ہوئے آگے کا پروگرام سیٹ کرنے لگا۔

☆☆☆

دن ڈھل رہا تھا۔ صبح کے ہنگاموں، شور، چہل پہل کی نسبت، اس وقت ایک خاموشی سی چاروں طرف پھیلنے لگتی تھی۔ صحن میں لگے گھنے، سایہ دار درخت کی بھی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ یا وہ بہت سی یہ برسوں پرانا درخت بھی کئی زمانے، کئی سال دیکھ چکا تھا۔ زمانے وہ جو کسی انسان پہ ایک لمحے میں گزر جاتے تھے اور سال وہ جو جسم کے ساتھ زینہ بہ زینہ دنوں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پورا ہوتا تھا۔

زینب چارپائی پہ سیدھی لیٹی، پیپل کے درخت پہ پھدکتی، اچھلتی، چہچہاتی چڑیوں کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کی صحت دن بہ دن تنزلی کی جانب گامزن تھی۔

جس دن سے ذلفی اور شبنم یہاں سے گئے تھے، زینب کی طبیعت مزید خراب ہوگئی تھی۔ جبکہ درنایاب ہمیشہ کی طرح اپنی ضد اور انا میں زینب سے ناراض اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔

بیرونی دروازے پہ دستک دے کر کوئی لمبے لمبے قدم اٹھاتا، اس کی طرف بڑھا تھا۔ زینب نے چونک کر گردن موڑی اور حیدر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی، اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے روشن ہوا مگر پھر اس کے پیچھے کھڑی خوب صورت لڑکی اور بچے کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ حیدر تیزی سے ماں کو سہارا دینے لگا۔ حیدر کو زینب کو اس حال میں دیکھ کر صدمہ ہوا تھا۔

"بے بے! یہ اپنی کیا حالت بنالی ہے؟ اپنا خیال نہیں رکھتی ہیں۔" حیدر نے ماں کے کمزور ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگایا تھا۔ زینب پھیکی سی مسکراہٹ سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔

"جب جوان اولاد، بوڑھی ماں کا خیال نہ رکھے، تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" زینب نے سنجیدگی سے کہا۔ صدف گلا کھنکھار کر آگے بڑھی اور ادب سے سلام کیا۔ زینب نے ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی اور جواب دے کر منہ موڑ لیا۔ حیدر نے اشارہ کیا تو صدف اور حسن پاس رکھے موڑھے پہ بیٹھ گئے مگر حسن کی ساری توجہ صحن کے کونے میں دانہ چگتی مرغی اور اس کے چوزوں پر مرکوز تھی۔

"بے بے! یہ صدف ہے۔ میری بیوی

دیکھتی رہ گئی۔

"یہاں کیوں لائے ہو؟" زینب کا لہجہ سرد تھا۔

"آپ سے ملوانے۔" حیدر نے جلدی سے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ میں ملوں یا نہیں۔ تم تو خوش ہوناں۔"

زینب نے عجیب سے انداز میں سوال کیا۔ اس وقت صحن سے باتوں کی آوازیں سن کر درنایاب تیزی سے کمرے سے باہر نکلی اور سامنے کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

"بے بے! یہ کیا ہو رہا ہے؟" درنایاب تیزی سے چلتی صحن میں آئی۔ اسے دیکھ کر صدف کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔ جبکہ حیدر کا چہرہ تن گیا تھا۔

"بے بے! آپ نے اسے اندر کیوں آنے دیا؟ اچھا اسی لیے میں کہوں کہ آپ دروازے کی کنڈی کیوں نہیں لگاتی تھیں۔ ضرور بیٹے سے گٹ مٹ کی ہوگی ناں۔ ہائے میں لٹ گئی، برباد ہوگئی۔ میری سوتن لے آیا۔" درنایاب ہاتھ پھیلا کر، اپنا ماتھا اور سینہ پیٹ کر بین ڈالنے لگی۔

"چپ کر جاؤ۔" حیدر نے غصے سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ورنہ کیا کرو گے؟ مارو گے مجھے؟ اس ڈائن کی خاطر....." درنایاب نے اکڑ کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں! ماموں کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ اب چپ۔" حیدر نے سختی سے کہتے ہوئے انگلی اپنے ہونٹوں پہ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"ت.....تم مجھے اس طرح ڈرا کر گھر سے نہیں نکال سکتے۔ یہ میرا گھر ہے۔ کیوں بے بے؟" درنایاب گھبرا کر زینب کی طرف بڑھی اور اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔

"حیدر! مہمانوں کو اوپر والے کمرے میں لے جاؤ۔ آرام کر لیں۔ میں کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

درنایاب حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ حیدر نے صدف کو اشارہ کیا تو وہ حسن کا ہاتھ پکڑ کر اس کے پیچھے چلی گئی۔

"بے بے! آپ نے اسے گھر سے نکالا کیوں نہیں؟" درنایاب نے غصے سے کہا۔

"درنایاب! غصہ بات کو بگاڑ دے گا۔ میرے گھر سے نکال دینے سے، حیدر اسے اپنی زندگی، اپنے دل سے نہیں نکالے گا۔ بلکہ وہ مجھے غلط سمجھ کر، اس کے ساتھ مزید ہمدردی کرے گا۔ سمجھا کر۔ جو بات نرمی سے سمجھائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے غصہ کیوں کریں۔"

زینب نے نرمی سے کہا اور پھر اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

صحن میں بچھے دسترخوان پر وہ سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ درنایاب غصے سے اپنے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ مرغی کے سالن کے ساتھ، میٹھے میں گڑ والی سویاں تھیں۔ صدف بہت رغبت سے کھانا کھا رہی تھی۔

"بے بے! آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ ایک مدت کے بعد اتنا لذیذ، ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھایا ہے۔" صدف نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"تمہاری ماں بھی ایسا ہی کھانا بناتی ہوں گی۔" زینب نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"بناتی تھیں کبھی.....اب تو بس یادیں ہی رہ گئی ہیں۔" صدف نے اداسی سے کہا تو زینب چونک کر اس کے ملول چہرے کو دیکھنے لگی۔

"تمہارا بچہ بہت پیارا ہے۔" زینب نے بات پلٹی تھی تو صدف نے مسکرا کر حسن کی طرف دیکھا جو بہت شوق سے گڑ والی سویاں کھا رہا تھا۔

"ہاں پیارا تو ہے مگر بدقسمت! جس نے بچپن میں ہی اپنے باپ کو کھو دیا۔"

صدف کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ حیدر اور زینب ایک ساتھ ٹھٹکے اور اسے دیکھنے لگے تو صدف سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ کھانے کے بعد، زینب نے دودھ پتی بنائی۔

"بے بے! آپ کام مت کریں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" حیدر نے فکرمندی سے کہا تو صدف غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی جس پہ پیلاہٹ واضح تھی اور وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔

"دوائی لے رہی ہوں۔ میری فکر مت کرو۔" زینب نے لاپروائی سے کہا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حیدر بھی ماں کے پیچھے اٹھ کر چلا گیا۔ صدف، حسن کو لے کر اوپر والے کمرے میں چلی گئی۔

تب درنایاب کمرے سے باہر نکلی اور اس نے باورچی خانے میں جا کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد، اس نے دبے قدموں چلتے ہوئے، بے بے کے کمرے میں جھانکا۔ حیدر ماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ زینب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، وہ رو رہی تھی۔ درنایاب، اپنے کمرے میں واپس چلی گئی مگر وہ غصے اور حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔

☆☆☆

"دادو!" زینب مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی جب ایک معصوم اور مدھم آواز پر چونکی اور پلٹ کر دیکھا۔ نیکر اور شرٹ میں ملبوس، حسن کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"دادو؟" زینب نے دہرایا تو حسن نے سر ہلایا۔

"مما نے بتایا، آپ دادو ہیں۔" حسن نے معصومیت سے کہا اور پھر گردن آگے کی طرف کر کے زینب کے پیچھے دانہ چگتی مرغی کو دیکھنے لگا۔

"دادو! میں اس کے ساتھ کھیل لوں؟" حسن نے جلدی سے سوال کیا تو زینب نے سر ہلا دیا۔ حسن تیزی سے مرغی کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر مرغی ڈر کر دوسری طرف بھاگ گئی۔ حسن مرغی کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ مرغی ڈر کے ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔

"رکو ہین! ہم دوست ہیں ناں۔۔!" حسن معصومیت سے کہتا ہوا، پیچھے بھاگ رہا تھا۔ زینب یہ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

کچھ دور چارپائی پر بیٹھے حیدر اور صدف نے مسکرا کر انھیں اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ بچے اور بوڑھے بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی ان دونوں کے ساتھ ہوا تھا۔

"حسن بیٹا! ہین کو پیار سے بلاتے ہیں۔ دیکھو ایسے....."

زینب ہاتھ میں دانہ پکڑ کر منہ سے آواز نکالتی، مرغی کو متوجہ کرنے لگی۔ حسن حیرانی سے دیکھنے لگا۔ زینب نے پیار سے ایک چوزے کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو حسن بھی ایسا ہی کرنے لگا۔ حسن کو چوزے کے پاس دیکھ کر، مرغی گولی کی رفتار سے اس کی طرف بڑھی اور کڑ کڑ کرتی اپنے چوزوں کو گھیر کر دوسری طرف لے جانے لگی۔

حسن ڈر کر زینب سے لگ گیا۔ زینب نے پیار سے اسے تھپکا۔ اب زینب اسے باڑے میں موجود جانوروں کے پاس لے گئی۔ حسن بہت خوش اور پرجوش تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی درنایاب کو محبت کے ان مناظر پہ شدید غصہ آرہا تھا، مگر وہ حیدر کے غصے اور دھمکی کا سوچ کر چپ کر جاتی تھی۔

شبنم جس طرح، اس دن صاف منع کر گئی تھی۔ درنایاب کو اندازہ تھا کہ اس کی پہلی اور آخری جائے پناہ یہ گھر ہی ہے۔

☆☆☆

حیدر اور صدف کو گاؤں آئے دس دن ہو چکے تھے۔ ان دس دنوں میں حیدر نے صدف کو اپنا گاؤں دکھایا۔ اسے کھیتوں، کھلیان، ٹیوب ویل، ندی کنارے لے کر گیا۔ صدف کے لیے یہ سب دیکھنا دلچسپ تھا۔ صدف کے اصرار پر حیدر ماں کو قریبی شہر کے اچھے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے گیا تھا۔ اس کی دوائی سے زینب کی طبیعت کافی بہتر ہوگئی تھی۔ زینب دل سے صدف کی ہمدردی اور رحم دلی سے متاثر ہوگئی۔

صدف کو احساس تھا کہ زینب سے زیادہ کام نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے صدف اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتی مگر زینب کام میں بہت طاق اور پھرتیلی تھی۔ وہ اکیلے کام کرنے کی عادی تھی۔ جبکہ درنایاب زینب کے ساتھ تو بدتمیزی سے بات کرتی ہی تھی مگر وہ صدف کے ساتھ لڑنے کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی مگر وہ یہ کام حیدر کی غیر موجودگی میں کرتی تھی۔

صدف اس کی چالاکی کو سمجھ گئی تھی۔ حیدر سے شکایت لگانے کے بجائے خاموشی سے وقت گزار رہی تھی۔ کیونکہ کچھ دن تک وہ واپس جا رہے تھے۔

اس دن حیدر کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ زینب، آج فریم لگائے، ایک قمیص کے گلے پہ کڑھائی کر رہی تھی۔ صدف اس سے سیکھنے کی کوشش میں تھی۔ جبکہ حسن مرغی اور چوزوں کے پیچھے ہلکان ہو رہا تھا۔ مرغی اور چوزے اب حسن سے مانوس ہو گئے تھے۔ حسن کا زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ حسن کی وجہ سے زینب کا دل بھی لگ گیا تھا۔ اسے بار بار حیدر کے بچے کا خیال آتا۔ مگر اب تک اس خوشی سے محروم رہی تھی۔

اچانک غصے سے بھری درنایاب کمرے سے باہر نکلی۔ اس نے ایک زہریلی نگاہ، ان دونوں پر ڈالی جن کی ساری توجہ کڑھائی کے ڈیزائن پہ تھی۔ درنایاب آگے بڑھی اور صحن میں کھیلتے حسن کے ہاتھ کو زور سے پکڑا کہ وہ ڈر کر اونچی آواز میں رونے لگا۔ درنایاب نے حسن کے بازو کو دو جھٹکے دیے اور غصے سے بولی۔

''تم نے کیا شور مچایا ہوا ہے۔ میں سو بھی نہیں سکتی۔ شور مچانے کا اتنا شوق ہے تو اپنے باپ کے پاس دفع ہو جاؤ۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔''

درنایاب نے نفرت سے کہتے ہوئے زور کا جھٹکا حسن کو دیا۔ وہ زمین پر گر گیا۔ صدف تیزی سے آگے بڑھی۔ زمین پہ گرے حسن کو گود میں اٹھا کر صدف نے ایک سرد نگاہ درنایاب پر ڈالی۔ درنایاب ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔ جیسے اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو۔

''تم ایک سنگدل اور بے حس عورت ہو درنایاب!'' صدف نے ناگواری سے کہا۔

''او اچھا! اور تم کیا ہو؟ چالاک اور مکار عورت۔ دوسرے کے مردوں کو پھنسانے والی۔ اب تک کتنے مرد پھنسا چکی ہو یا.....''

درنایاب کی بات منہ میں ہی رہ گئی جب ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ درنایاب نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر پھٹی نگاہوں سے دیکھا تو غصے سے بھری زینب سامنے کھڑی تھی۔

''خبردار! جو آئندہ کسی عورت کے کردار پہ بات کی۔ درنایاب! میری تربیت ایسی تو نہیں تھی۔ پھر تم ایسی کیوں ہو۔''

زینب نے دکھی انداز میں کہا۔ حیدر جو گھر کے اندر داخل ہوا ہی تھا۔ صحن میں لگے تماشے کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ درنایاب روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا ہوا ہے بے؟'' حیدر نے پاس آ کر فکرمندی سے سوال کیا اور پھر روتے ہوئے حسن اور پریشان چہرے والی صدف کو دیکھا تو وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

''درنایاب نے پھر کچھ کیا ہے؟'' حیدر نے گہری سانس لے کر کہا۔

''حیدر! تم واپس چلے جاؤ۔''

زینب نے سختی سے کہا اور پھر مڑ کر وہاں سے جانے لگی حسن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے رکی۔ اس کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیرا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اگلی صبح حیدر اور صدف، زینب سے مل کر شہر کے لیے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی درنایاب بھی اپنا سامان باندھ کر، دن ڈھلے ڈفلی کے وہاں آتے ہی، اس کے گھر رہنے چلی گئی۔ پیچھے زینب اکیلی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''بے بے! آپ واپس کیوں جانا چاہتی ہیں؟''

حیدر نے ماں کے خوش چہرے اور مطمئن مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔ وہ بستر پر ولی اور عروہ کو لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں جڑواں بہن بھائی تقریباً

تین مہینے کے ہو گئے تھے۔ حسن اب چار سال کا ہو گیا تھا اور وہ اسکول جانے لگا تھا۔ حسن کو بھی اپنے بہن بھائی سے بہت محبت تھی۔ اسکول سے واپس آ کر اس کا سارا دن ان کے پاس ہی گزرتا تھا۔ حیدر اور صدف کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ دونوں ایک مطمئن اور خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔

صدف نے بچوں کی ذمہ داری کی وجہ سے جاب چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ دونوں بچوں کو اس کی پوری توجہ کی ضرورت تھی۔ حیدر کے باپ بننے کی خبر سن کر زینب کو ایسا لگا تھا کہ جیسے اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہے۔ وہ گاؤں سے اکثر شہر چلی آتی۔ حیدر کے بچوں میں اس کی جان تھی۔ حیدر ماں کی محبت سے واقف تھا۔ اس لیے وہ ماں کو گاؤں جانے سے روکتا مگر زینب مسکرا کر منع کر دیتی۔

"حیدر! میری ساری زندگی اسی گھر میں گزری۔ اس گھر میں تمہارے باپ کی یادیں ہیں، تمہارا بچپن، لڑکپن، جوانی سب کچھ تو اس گھر میں ہے۔ میں بھلا کیسے اس گھر کو چھوڑ کر یہاں آ جاؤں۔" زینب نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ حیدر مسکرا کر ماں کو دیکھنے لگا۔

"بے بے! صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ وہاں آپ کی لاڈلی چڑیل جیسی بیجی جو رہتی ہے جس کے کالے جادو نے آپ کو میرے بچپن سے باندھا ہوا ہے۔" حیدر نے شرارت سے کہا تو زینب ہنس پڑی۔

"ہاں درنایاب بھی میری ذمہ داری ہے۔ سچ کہوں حیدر! درنایاب سے تمہاری شادی کر کے میں ہمیشہ پچھتاوے کا شکار رہی تھی مگر جب تم نے اپنی خوشیوں کے لیے الگ راہ چن لی تو میرے دل کو ایک اطمینان ضرور ہوا کہ میرے بچے کو اس کے حصے کی خوشیاں مل گئی ہیں۔"

زینب نے سنجیدگی سے اعتراف کیا تو حیدر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"بے بے! میں آپ کے فیصلے پہ دل سے راضی تھا مگر درنایاب نے میرے دل کی قدر نہیں کی۔" حیدر نے اداسی سے کہا۔

"مگر میں خوش ہوں کہ تم درنایاب کی ہر نادانی، ہر بدتمیزی کو بھلا کر، آج بھی اس مجبوری کے رشتے کو خلوص دل سے نبھا رہے ہو۔ ورنہ اگر تم اسے چھوڑنا چاہتے، تو کیا مشکل تھی۔" زینب نے آہستگی سے کہا تو حیدر نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا بے بے! آپ نہیں سمجھیں گی۔" حیدر نے نفی میں سر ہلایا۔ جب اس کے موبائل پر درنایاب کی کال آنے لگی۔

"کتنی لمبی عمر ہے میری درنایاب کی۔" حیدر نے فون کان سے لگا کر درنایاب کہا تو زینب نے زیر لب کہا۔ حیدر مسکرا کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے! میں کل آفس سے واپسی پہ تمہیں پک کرنے آؤں گا۔ جو دل چاہے شاپنگ کر لینا۔ ہاں ٹھیک ہے کھانا بھی باہر کھائیں گے اور آئس کریم بھی۔" وہ درنایاب سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے وہ چھوٹی بچی ہے جسے وہ اس کی من پسند چیزیں دلا کر خوش کرنا چاہ رہا تھا۔

"رپورٹس جب آئیں گی، میں تمہیں بتا دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

اس نے نرمی سے کہا۔

جب سے حیدر کے جڑواں بچے ہوئے تھے، درنایاب نے علاج مزید تیز کر دیا تھا۔ وہ پہلے بھی گاؤں میں موجود حکیم اور لیڈی ڈاکٹر سے علاج کروا رہی تھی۔ اس نے بہت سے تعویذ، دم بھی کروائے مگر اسے کامیابی نہیں ملی تب شبنم کے سمجھانے پہ درنایاب نے حیدر سے ضد کی کہ وہ بھی شہر کی اچھی اور بڑی ڈاکٹر سے علاج کروائے گی۔

حیدر نے اس کی بات مان لی تھی۔ درنایاب اور زینب اکثر شہر چلے آتے۔ وہ ماموں کے گھر سے آ کر ماں کو لے جاتا تھا۔ زینب تو حیدر کے گھر رہتی مگر درنایاب اپنے باپ کے گھر رہنا پسند کرتی تھی۔ اس نے دل پہ پتھر رکھ کر حیدر کی دوسری شادی پہ سمجھوتا تو کر لیا تھا مگر وہ صدف سے چڑ ہی رکھتی تھی۔

دوسری طرف صدف بھی درنایاب کو مار جن دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتی تھیں مگر حیدر دونوں میں توازن رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔

وہ درنایاب کی دل آزاری کے خوف سے اس کی ہر خواہش مان لیتا۔ اس سے کسی بات پہ جھگڑتا نہیں تھا۔ ہر ہفتے چھٹی لے کر گاؤں چلا جاتا اور درنایاب کے ساتھ دن گزارتا۔ اگر درنایاب کی مرضی ہوتی تو وہ اپنے باپ کے گھر آجاتی۔ حیدر اسے شہر بھر میں گھماتا تھا۔ وہ درنایاب کے سب گلوں شکووں کو دور کرنا چاہتا تھا۔ درنایاب اس صورتحال سے خوش تھی مگر وہ صدف کے خلاف محاذ بنائے رکھنے کی عادی تھی۔

زینب کے ساتھ اس کے تعلقات سرد ہو چکے تھے مگر درنایاب جانتی تھی کہ زینب کی وجہ سے ہی حیدر اس کے قابو میں تھا۔ زینب درنایاب کی وجہ سے ہی گاؤں سے شہر بیٹے کے پاس شفٹ نہیں ہوئی تھی حالانکہ حیدر کے بچوں کو دیکھ کر اب یہ خواہش سر اٹھانے لگی تھی مگر وہ اپنی اس خواہش کا تاوان ابھی بھی بھر رہی تھی جو درنایاب کو گود لے کر اس نے کی تھی۔

اب زینب اکثر سوچتی کہ بچے کے لیے اس کے والدین سے زیادہ پیارا اور سگا کوئی نہیں ہوتا ہے، اسی طرح والدین لاکھ اپنے بچے سے خفا ہوں، لاپروا رہے ہوں مگر ان کا حق اور مان کسی بھی دوسرے رشتے سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ زینب نے دوسری عورتوں سے سنی سنائی باتوں میں آکر درنایاب کی پرورش کا ذمہ لیا مگر وہ اس کی پرورش کا وہ حق نہیں ادا کر سکی جو شاید ایک باپ ادا کر دیتا یا ایک سوتیلی ماں ادا کرتی۔

زینب نے درنایاب کو حد سے زیادہ لاڈ دیا، کبھی روکا ٹوکا نہیں کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دے کہ پھوپھو بوجھ بن گئی ہوں۔ زینب کی یہ کمزوری درنایاب کی منفی عادتوں کو پختہ کرتی گئی۔ حالانکہ درنایاب بری فطرت کی مالک نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ٹوٹی شخصیت، کمزور اور محدود ذہن کی مالک لڑکی تھی جو روایتی ماحول اور باتوں میں پلی بڑھی اور کسی کی بھی باتوں میں آسانی سے آجاتی تھی۔

دو دن کے بعد زینب اور درنایاب واپس گاؤں جا رہے تھے۔

درنایاب کی ضد تھی کہ حیدر انھیں اپنی گاڑی پہ گاؤں چھوڑ کر آئے۔ تھوڑی بحث کے بعد حیدر مان گیا تھا۔ درنایاب خوش تھی کہ وہ گاؤں میں اپنی سہیلیوں اور سب لوگوں کو دکھائے گی کہ حیدر کے پاس گاڑی ہے اور وہ مالکن بن کر آگے بیٹھ کر آئی ہے۔

حیدر کی دوسری شادی کا سن کر سب نے درنایاب کو بہت باتیں کی تھیں۔ درنایاب ان سب کو دکھانا چاہتی تھی کہ حیدر آج بھی اس پہ مرتا ہے۔

☆☆☆

درنایاب نے بیزاری سے بستر پہ بیمار پڑی زینب کی طرف دیکھا۔ اس کا حیدر کی گاڑی میں گاؤں جانے کا خواب، خواب بن کر رہی رہ گیا تھا۔ جس دن انھوں نے گاؤں کے لیے نکلنا تھا، اسی رات زینب واش روم کے چکنے فرش پہ سلپ ہو کر، کولہے کی ہڈی تڑوا بیٹھی۔ اچانک آنے والی پریشانی نے سب درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ زینب کے کولہے کا آپریشن فوری طور پر ہوا مگر آپریشن کے بعد سے زینب کی حالت مسلسل تنزلی کی طرف تھی۔ زینب، کے علاج میں حیدر کوئی کمی نہیں رکھ رہا تھا۔ زینب کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ایک عورت بھی رکھ لی تھی کیونکہ صدف تین بچوں کے ساتھ، زینب کی پوری طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی۔

زینب کی بیماری کی وجہ سے درنایاب کو مجبوراً اس کے پاس آکر رہنا پڑا۔ حیدر کے گھر میں رہتے ہوئے اسے دو مہینے ہو چکے تھے۔ زینب کی حالت میں تھوڑی بہتری تو تھی مگر وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ درنایاب، زینب کی پرواہ کرنے کے بجائے، حیدر اور صدف کے معاملات پہ نظر رکھتی تھی۔ حیدر کے بچوں کے ساتھ، اسے محبت تو تھی مگر سوتن کے بچوں کا خیال آتے ہی وہ انھیں خود سے دور کر دیتی تھی۔ صدف کا موڈ بھی درنایاب کی وجہ سے اکثر ہی خراب رہتا تھا۔ حیدر محبت

سے اسے منایا، سمجھایا۔ مگر صدف درنایاب کو اپنے گھر پہ رکھنے پہ راضی نہیں تھی۔ مگر زینب کا سوچ کر چپ کر جاتی کیونکہ درنایاب کے زینب کے پاس ہونے کی وجہ سے، صدف کو بے فکری رہتی تھی۔

''بے بے! دیکھا آپ نے اپنی چالاک بہو کو۔ کیسے حیدر کو مٹھی میں کیا ہوا ہے۔'' ایک دن درنایاب نے منہ بنا کر زینب سے کہا جو بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

زینب نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ درنایاب کے ظاہری حلیے میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔

''درنایاب! صدف اچھے مزاج کی ہے۔ اس کے ساتھ بنا کر رکھو۔'' زینب نے سنجیدگی سے کہا تو درنایاب نے کٹیلی نگاہ اس پر ڈالی۔

''ہاں! آپ تو ضرور یہ کہیں گی۔ آخر آپ کے پوتے اور پوتی کی ماں جو ہے۔'' درنایاب نے طنزیہ انداز میں کہا تو زینب دھیمے سے مسکرادی۔

''بے وقوف لڑکی! آج بھی میری محبت، میرے خلوص پہ شک کر رہی ہو۔ میں نے تو تمہارے لیے اپنی سگی اور اکلوتی اولاد کو خود سے دور کر دیا تھا۔ جس کا پچھتاوا مجھے آج بھی ہے۔'' زینب نے رندھے لہجے میں کہا۔

''دیکھا، مان لیا ناں کہ پچھتاوا ہے۔'' درنایاب نے فخریہ انداز میں کہا تو زینب نفی میں سر ہلانے لگی۔

''تمہارا کوئی کچھ نہیں کر سکتا درنایاب۔ تم منفی سوچنے کی عادی ہو چکی ہے۔ میں آج بھی تمہارا بھلا سوچ رہی ہوں۔'' زینب نے نرمی سے کہا۔

''اچھا! ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ میرا بھلا کیسے ہے؟''

درنایاب نے بیڈ کے پاس آ کر کھڑے انداز میں کہا تو زینب چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر مدھم لہجے میں کچھ کہا جسے سن کر درنایاب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

☆☆☆

درنایاب یادوں کی بارش میں بھیگتی، دوبارہ اسی خوب صورت نیرس پہ پہنچ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر کمرے کی طرف دیکھنا چاہا، جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔

آر یا پار..... اب تو زینب بھی نہیں رہی تھی جس کی بنیاد پر درنایاب اڑتی پھرتی، اکڑتی تھی۔ زینب ایک رات دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی تھی۔

زینب کو گزرے دو مہینے ہو گئے تھے۔ زینب کی موت نے جہاں حیدر کو توڑ کر رکھ دیا تھا، وہاں درنایاب کو بھی پہلی بار احساس ہوا کہ ماں کی محبت، ماں کا سایہ کیا ہوتا ہے۔ جب تک زینب زندہ رہی، درنایاب نے اس کی محبت کو حق سمجھ کر وصول کیا مگر وہ خود کو مظلوم بھی سمجھتی رہی کہ اس کی سگی ماں نہیں ہے۔ اس لیے سب کی محبت حاصل کرنا، اس کا حق ہے۔ مگر درنایاب یہ بھول گئی کہ محبت حق سے بھی وصول کی جائے تو اس کی کوئی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔

زینب کے مرنے کے بعد وہ جتنا سوچتی، اسے یاد آتا کہ زینب کس کس طرح، اس کی ہر بری عادت، ہر غلط حرکت پہ پردہ ڈالتی تھی۔ حتیٰ کہ حیدر کو بھی درنایاب کے لیے منانے والی، راستہ بنانے والی زینب ہی تھی۔ زینب کے مرنے کے بعد، درنایاب کی سمجھ میں آیا کہ اس کا وجود تو اس تنکے کی طرح ہے جو تیز بہاؤ میں بہہ کر کہیں بھی جا سکتا ہے۔

درنایاب کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہی۔ بارش رک چکی تھی۔ شام کی لالی، رات کے اندھیرے میں بدل گئی۔ جب حیدر اس کے پاس آیا۔ درنایاب خوف زدہ ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی جس پہ ہمیشہ کی طرح نرمی تھی۔

''درنایاب! کل ہم گاؤں جا رہے ہیں۔ بے بے کے لیے قرآن خوانی کروانی ہے۔ دیگ بانٹنی ہے۔''

حیدر نے مصروف انداز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

درنایاب رو پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ حیدر بہانے سے اسے ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑنے جا رہا ہے کیونکہ وہ صدف کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ صدف اس کے دو بچوں کی ماں تھی جبکہ درنایاب سے تو اس نے زبردستی کی شادی کی تھی۔

ساری رات درنایاب روتی اور زینب کو یاد کرتی

رہی۔ صبح سویرے وہ دونوں گاؤں کے لیے نکلے۔ درنایاب کی وہ ادھوری خواہش کہ وہ حیدر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کر گاؤں جا کر سب کے سامنے شو مارے گی، اب خوف کی نذر ہوگئی تھی۔ درنایاب سارا راستہ کسی سوچ میں گم، خوف سے کانپتی رہی۔

گاؤں کی چھوٹی اور ٹوٹی سڑک کا آغاز ہوا تو ایک جگہ گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ حیدر اتر کر گاڑی کے لیے پانی لینے تھوڑی دور گیا تو درنایاب تیزی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتری۔ وہ کسی کی نظر میں آنے سے پہلے، یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ گاؤں کے لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی جب حیدر سب کے سامنے اسے گاڑی سے نیچے اتار کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا۔

درنایاب کچے پکے راستے سے ہوتی ہوئی، ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ بدحواسی میں تیزی سے مڑتے ہوئے اس کا پاؤں مڑا اور وہ نیچے گر گئی۔ درنایاب پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کے آس پاس سرسبز لہراتی فصلیں تھیں اور درمیان میں بنجر کوہ، بنجر زمین جیسی وہ بیٹھی اپنی کم عقلی کا ماتم کر رہی تھی۔

''بھاگنے کا شوق پورا ہو گیا ہو تو اب گھر چلیں۔''

پھولی سانسوں کے ساتھ، اس کے پیچھے بھاگتے حیدر نے پاس آ کر گھورتے ہوئے سوال کیا درنایاب رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ حیدر بھی سرسبز فصلوں کے درمیان بیٹھی حیران چہرے والی، لڑکی کو دیکھنے لگا۔

''درنایاب!'' وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟'' اس نے نرمی سے سوال کیا تو درنایاب نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت درد ہے۔'' درنایاب کہتے ہوئے رونے لگی۔

''اچھا! تم روؤ مت۔ تھوڑی ہمت کرو۔ پاس ہی گھر ہے۔''

حیدر نے فکرمندی سے کہا اور سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ حیدر اسے تھام کر گاڑی تک لایا۔ یہ منظر کئی

آنکھوں نے حیرت اور تعجب سے دیکھا تھا۔ انہوں نے بند گھر کا تالا کھولا۔ گاؤں کے لوگ، ان کے پاس افسوس کرنے آ رہے تھے۔ سب زینب کی اچھی اور نیک فطرت کی گواہی دیتے ہوئے افسردہ تھے۔ حیدر گھر میں ماں کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے اداس بھی تھا اور لوگوں سے ماں کے لیے اچھے کلمات سن کر مطمئن بھی۔ اس کی ماں کی ساری عمر گاؤں میں گزری تھی۔ یہاں کے لوگوں کا بھی پورا حق تھا کہ وہ حیدر کے غم میں شامل ہوتے۔ اس کی ماں کے لیے دعائے خیر کرتے۔ دیگ بانٹ کر جب حیدر گھر واپس آیا تو درنایاب گھر کو صاف کر کے فارغ ہوئی تھی۔ گھر کو صاف دیکھ کر حیدر چونک گیا۔ زینب نے ساری زندگی گھر کو بہت سنوار کر رکھا تھا۔ اس لمحے حیدر کو احساس ہوا کہ زینب کی تربیت کا کوئی عکس تو درنایاب میں رہ گیا ہے۔

''درنایاب!'' چائے کا کپ رکھ کر جب درنایاب واپس جانے لگی تو حیدر نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر روکا تھا۔ وہ اس وقت صحن کے وسط میں کھڑا، سر پر چمکتے تاروں بھرے آسمان کو دیکھ رہا تھا گاؤں کی رات بہت پیاری اور پرسکون تھی۔ درنایاب نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نے میری اور صدف کی باتیں سن لی تھیں۔'' حیدر نے گردن موڑ کر اس کے حیران چہرے کی طرف دیکھا۔ درنایاب کل سے ضبط کر رہی تھی۔ اب ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے حیدر کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے چھوڑ دیں گے۔ صدف نے یہ ہی شرط رکھی ہے کہ مجھے زندگی سے نکال دیں کیونکہ اب بے بے بھی نہیں رہیں اور میں.....''

درنایاب کہتے ہوئے رکی۔ اسے زینب کی وہ بات یاد آئی جو اس نے درنایاب کو آخری بار سمجھائی تھی۔

''درنایاب! میں تمہارے بھلے کے لیے سمجھا رہی ہوں کہ صدف سے بنا کر رکھو کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہاری میڈیکل رپورٹس کے مطابق تم کبھی ماں نہیں بن سکتی ہو۔'' وہ اور شدت سے رونے لگی۔

دے گی۔ میں اچھی بیوی نہیں ہوں مگر آپ اچھے شوہر ضرور ہیں۔"

درنایاب نے روتے ہوئے کہا تو حیدر بے ساختہ مسکرا دیا اور پھر اس کا سر اٹھا کر نرمی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں تمہیں صرف اس وجہ سے چھوڑ دوں گا کہ تم اچھی بیوی نہیں بن سکیں؟ یا تمہاری میڈیکل رپورٹ ٹھیک نہیں آئی ہے"

حیدر نے سوال کیا تو درنایاب ناسمجھی سے اسے کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"درنایاب! اولاد، نصیب سے ملتی ہے۔ اللہ پہ پورا یقین رکھو۔ معجزے انسانوں کے لیے ہی ہوتے ہیں۔"

حیدر نے پریقین انداز میں کہا تو درنایاب حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تو کیا آپ مجھے چھوڑیں گے نہیں؟" درنایاب نے حیرانی سے سوال کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اپنی زندگی میں دو لوگوں کو ہمیشہ بہت مارجن دیا ہے۔ ان کی ہر غلط اور صحیح بات کو مانا ہے۔ ان کے غلط فیصلوں کی وجہ سے تکلیف بھی اٹھائی مگر پھر بھی میں ان کے ساتھ کھڑا رہا۔ ان دو لوگوں میں سے ایک میری ماں تھی اور دوسری تم ہو درنایاب۔"

اس نے اعتراف کیا تو درنایاب گنگ کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔ حیدر دل سے مسکرا رہا تھا۔ اس لیے اس کی روشن مسکراہٹ اندھیری رات میں چاند جیسی لگ رہی تھی۔

"مجھ میں اتنا حوصلہ اور ہمت ہے کہ میں ہر مشکل، ہر تکلیف میں تمہارا ساتھ دوں کیونکہ یہ میرا عہد تھا جو میں نے اپنی ماں سے، خود سے کیا تھا۔ میں اگر کسی غیر کے بچے کو اپنا سکتا ہوں، اسے باپ کی شفقت اور محبت دے سکتا ہوں تو پھر میں کسی اپنے کو غیر کیسے بنا سکتا ہوں۔ یہ ہی بات میں نے صدف کو کا کہا تھا۔ صدف میری بات سمجھ کر چپ کر گئی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دوبارہ کبھی اس بارے میں بات نہیں کرے گی۔ یہ ہم دونوں نے طے کیا تھا۔ ایک دوسرے کی رائے کا، ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں گے۔" حیدر نے نرمی سے کہا۔

"آپ نے صدف سے دوسری شادی کیوں کی تھی؟" درنایاب نے بے ساختہ شکوہ کیا۔

"صدف آج کے دور کی لڑکی ہے۔ سمجھ دار، پر اعتماد، زندگی کو زندگی بنانے والی عورت۔ صدف کی جو خوبیاں ہیں، وہ کسی کو بھی متاثر کر سکتی ہیں۔ صدف سے میں نے شادی دو وجوہات کی بنیاد پہ کی تھی۔ ایک یہ کہ میں لائف پارٹنر کے روپ میں صدف جیسا ساتھی چاہتا تھا، دوسرا میں حسن کے سر پر باپ بن کر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے صدف اور حسن کی بے بسی اور تکلیف کئی مقام پہ دیکھی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے یہ قدم اٹھالیا جس پہ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے مگر درنایاب۔۔۔!" حیدر نے درنایاب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تم ہو۔ تم سے شادی میں نے جیسے بھی حالات میں کی ہو مگر میں تمہارے ساتھ ہمیشہ مخلص رہا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار نہ ہوتا۔ تم سے میرا تعلق کسی وجہ کا محتاج نہیں ہے۔ آئندہ کوئی وہم مت پالنا۔"

حیدر نے محبت سے کہا تو درنایاب کو پہلی بار حیدر کی آنکھوں میں ان گنت کہکشائیں نظر آئی تھیں۔ پہلی بار اس کا دل ان کہکشاؤں کی کھوج میں نکلنے کے لیے تڑپا تھا۔ درنایاب آنسو بھری آنکھوں سے مسکراتی اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ حیدر نے اسے تسلی دی تھی مگر اس کی آنکھیں بھی بے ساختہ نم ہو چکی تھیں۔

حیدر جانتا تھا کہ آج زینب کی روح، ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن ہوگی۔

آج ان دونوں نے اپنے رشتے کی گہرائی کو جانا تھا۔ ایک دوسرے کی محبت کو پہلی بار محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

درنایاب نے چار سالہ بیٹے کو آواز دے کر بلایا جو گاؤں آ کر واپس جانا بھول جاتا تھا۔ ابراہیم کبھی، اس طرف بھاگ رہا تھا، کبھی اس طرف۔ صدف اور اس کے تینوں بچے بھی ساتھ تھے۔ چاروں بچوں کی معصوم شرارتیں اور ہنسی اس دونوں کے چہروں پہ بھی مسکراہٹ لے آئی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ صدف اور درنایاب کے درمیان تعلقات میں کافی بہتری آئی تھی۔ پانچ سال پہلے حیدر نے ایک فیصلہ کیا اور درنایاب کو شہر لے آیا۔ اس نے ایک گھر کے دو پورشن میں صدف اور نایاب کی الگ الگ جنت سیٹ کر دی تھی۔ دونوں کا ایک دوسرے کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ صدف حیدر سے شادی سے پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ نایاب کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔ صدف سے شادی کرتے ہوئے حیدر نے اپنی واحد شرط اسے یہ ہی بتائی تھی کہ وہ کبھی اس کے اور نایاب کے درمیان نہیں آئے گی۔

صدف نے زینب کے مرنے کے بعد کوشش کی تھی کہ حیدر درنایاب کو چھوڑ دے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ حیدر نایاب کی حرکتوں اور عادتوں کی وجہ سے اکتا چکا ہے مگر اس کا یہ اندازہ غلط نکلا تھا۔ حیدر اپنی ماں سے کیے عہد پہ قائم تھا۔

حیدر نے زینب کے مرنے کے بعد، درنایاب کو گاؤں میں اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے گاؤں والے گھر کا ایک حصہ، گاؤں کے بچوں کے لیے وقتی اسکول کے طور پہ استعمال کرنے کے لیے خالہ بلقیس کو دے دیا تھا۔ جو ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھیں اور ان کی ایک بیوہ بیٹی بھی دو بچوں کے ساتھ ان کے پاس رہتی تھی۔

دونوں ماں بیٹی کا کوئی اور سہارا نہیں تھا۔ وہ گاؤں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزارہ کر رہی تھیں۔ زینب سے بلقیس کی اچھی دوستی تھی۔ حیدر کے اس اقدام سے گاؤں کے بچوں کا تو بھلا ہوا ہی تھا، ساتھ ساتھ بلقیس اور اس کی بیٹی کو بھی آسانی کے ساتھ پڑھانے اور روزگار کمانے کا راستہ مل گیا تھا۔

کے بعد درنایاب کو ماں بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ماں بن کے درنایاب کی شخصیت میں بڑی تبدیلی آئی تھی۔ یہ تبدیلی ایک دم سے نہیں آئی تھی بلکہ تبدیلی کا یہ عمل تب شروع ہوا تھا، جب زینب کے جانے کے بعد، اس نے پہلی بار خود کو اکیلا اور کمزور پایا تھا۔ حیدر کے خلوص اور محبت نے اس کے دل پہ اثر کیا تو درنایاب نے خود کو بدلنے کی کوشش شروع کر دی۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہی تھی۔

درنایاب نے گردن گھما کر کچھ دور کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پہ صدف اور حیدر کو ہاتھ پکڑے چلتے ہوئے دیکھا۔ صدف کسی بات پہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ حیدر کے چہرے پہ بھی جاندار مسکراہٹ تھی۔ جبکہ ان کے تینوں بچے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔

درنایاب کو اس مکمل منظر نے کسی ادھورے پن سے نوازا مگر اس سے پہلے کہ اس کی منفی سوچ حاوی ہوتی، درنایاب سر جھٹک کر اپنے سامنے کھڑی زندہ سلامت نعمت کو دیکھ کر بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ابراہیم کو گود میں اٹھا لیا اور اس کو پیار کرنے لگی۔

زندگی میں حاصل نعمتوں، خلوص، رشتوں کو جب ہم اپنی حماقت، لاپروائی، خودغرضی سے گنواتے ہیں تو ان کی زندگی میں اپنا مقام برقرار رکھنے کے لیے، ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ درنایاب اور حیدر کے رشتے کی وہ بھاری قیمت صدف تھی۔ جسے درنایاب نے خود، اپنا نصیب اپنی حماقت اور بے وقوفی سے سونپا تھا۔

"درنایاب!" حیدر نے پلٹ کر اسے آواز دی۔ درنایاب نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ حیدر نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا گنا دکھایا۔ تو درنایاب نے اثبات میں سر ہلایا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کی طرف بڑھنے لگی۔

☆

مناہیہ یاسر

پتھر کا بت

وہ آج پھر رو رہی تھی بے تحاشا اور ٹوٹ کے رونا کسے کہتے ہیں کوئی بھی اس کو دیکھ کے اندازہ لگا سکتا تھا۔ کیا ہوا جو سعید مجھے اپنی ہی نظروں میں بے مول نہ کرتے، مجھے یوں بے مایہ نہ ہونے دیتے۔ کیا تھا اگر وہ میرا مان رکھ لیتے۔ مجھے یہ احساس دلا دیتے کہ میری بھی اہمیت ہے، میری بھی کوئی اوقات ہے۔ شکووں کی لمبی فہرست تھی جو اس کے دل میں بے اختیار مچل رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔

اس کی اپنی حالت بھی تو اس مچھلی کی سی تھی جسے بچوں نے کھیل تماشے کی خاطر پانی سے باہر نکال کے تڑپنے کے لیے چھوڑ رکھا ہو اور خود تماشائی بنے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ وہ بھی تو یوں ہی تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی۔ اس کا یہ تڑپنا، سسکنا تو سالوں پر محیط تھا گو کہ یہ سال صدیوں پر محیط نہ تھے، لیکن اسے لگتا کہ سعید سے بچھڑنے کے بعد دن بھی سال بن گیا ہو۔ ایک دن ایک سال، دو دن دو سال، دس دن دس سال اور اس سالوں کے سفر میں آبلہ پائی اس کا مقدر بن گئی ہے۔

نام تو اس کا بشریٰ تھا۔ کہنے کو تو وہ خوش خبری تھی، لیکن یہاں تو وہ کسی کے لیے بھی خوشی کی خبر نہ تھی۔ رو لینے سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو آنسو پونچھ کے کچن میں چلی آئی، جہاں بیمار ساس اور شوہر نامدار کے لیے چائے بنائی تھی۔ کہنے کو تو ساس نگینہ ایک عرصے سے بیمار تھیں، شاید تب سے جب اس کو بیاہ کے اس گھر میں لائی تھیں، لیکن عمل میں بیماری کا شائبہ نہ ہونے دیتی تھیں۔ بشریٰ نے ان سات سالوں میں حالات سے سمجھوتا تو کر لیا تھا، لیکن اب بھی کبھی کبھی دل اداس ہو کے پگھلنے لگتا۔

☆ ☆ ☆

اس کی شادی کا دسواں دن تھا۔ وہ کچن سمیٹ رہی تھی جب سعید اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"یار! بس کبھی کبھی کرو۔ کیا ہر وقت کاموں میں لگی رہتی ہو۔ کچھ ٹائم اس غریب کے لیے بھی نکال لیا کرو۔"

نئی شادی کا نیا نیا سرور تھا جو سعید پر چھایا ہوا تھا۔ اسی خمار کے زیر اثر وہ اس کے ہاتھ تھام کے کچن سے باہر چلا آیا اور یہ منظر نگینہ کی آنکھوں سے اوجھل نہ رہ سکا۔

اسی شام وہ بیٹے سے گلہ کرتے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ "تم تو شادی کے بعد بالکل ہی بدل گئے ہو بیٹا۔ بیوی آتے ہی ماں سے منہ موڑ لیا۔ ایسا کیا تعویذ گھول کے پلا دیا جو تمہاری آنکھوں میں میرے لیے اتنی غیریت آ گئی۔"

چائے لاتی بشریٰ نے اتنا ہی سنا تو اندر جانے کی ہمت جواب دے گئی۔ ٹرے تھامے ہاتھ کپکپانے لگے۔ اس کی تو پہلے دن سے یہی کوشش رہی تھی کہ ڈراموں، کہانیوں کا ماحول اپنے گھر میں نہ ہونے دے گی۔ ہر صورت ان ماں بیٹے کے درمیان نہ آئے گی۔ اس [illegible] کوشش بھی کرتی، لیکن اسے کیا [illegible] سرال جاتی ہے تو اسی [illegible] سوتن ماں کے درمیان [illegible] سر ابن جاتی ہے۔ [illegible] ان پر ہے کہ وہ اسے بیٹی بنا کے گھر

کانٹے کی صورت میں جو گلے میں پھنس جاتا ہے جسے جتنا نگلا جائے وہ اتنی ہی تکلیف دیتا ہے۔ نگینہ نے بھی اسے گلے کا کانٹا ہی گردانا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر آئے دن یہی ہونے لگا۔ وہ ذرا دیر کو شوہر کے پاس کیا بیٹھتی، نگینہ دوڑ کے بیٹے کے پاس جا پہنچتی یا اسے اپنے کمرے میں بلا لیتی۔ آنسو بہائے گلے کیے جاتے۔ جسے سعید سن کے منمناتا ضرور تھا، لیکن ماں کی بارعب آواز میں اس کی مری مری سی آواز کہیں دب سی جاتی۔ ایسے میں وہ سوچتی کہ کیا ہو جاتا اگر سعید اس کی صفائی میں کچھ بولتے، اپنی ماں کو سمجھاتے کہ وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی جاتی، خود اپنی صفائی کے لیے کچھ بھی کہنا فضول تھا، شوہر سے آس لگائی، لیکن وہ بھی ٹوٹ گئی۔ وہ پہروں

وقت بیتتا رہا۔ ایسے میں وہ دو بچوں کی ماں بن گئی، لیکن ساس کی شکایت دور ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ماں بیٹے کے پاس بیٹھتی تو ساس کو وہ کن سوئیاں لینے والی بہو لگتی جو دو منٹ بھی ماں بیٹے کو اکیلے بیٹھا نہ دیکھ سکتی ہو۔ اگر وہ ایسے کسی خدشے کے پیش نظر دونوں کو اکیلا چھوڑ کے بچوں میں مگن ہونے کی کوشش کرتی تو بھی قصوروار ٹھہرتی کہ حسد اور جلن کے مارے کمرے میں جا گھستی ہے۔

ایسے میں اسے اپنی عقل پر ماتم کرنے کا دل چاہتا۔

لڑکی ذات تو ہوتی ہی اس نازک آبگینے کی مانند ہے جس کی جتنی حفاظت کی جائے کم ہے۔ جس کو ذرا سی ٹھیس بھی لگے تو وہ بکھر جاتا ہے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی تو بکھر ہی گئی تھی۔ اندر سے ٹوٹ

چکی تھی۔ اسے کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ بس ایک خواہش تھی جو اس کے اندر پنپ رہی تھی کہ کبھی تو اس کا شریک حیات اس کی صفائی میں دو بول ہی بول دے۔ اس گناہ کی دلدل سے باہر نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھائے جو اس نے کیے ہی نہ تھے' لیکن ہر خواہش پوری تو نہیں ہوتی۔

☼ ☼ ☼

آج صبح جب اس کی نند اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آئی تو وہ حسب معمول کچن میں ان کی خاطر مدارت کے لیے انتظام سنبھالے ہوئی تھی جب نگینہ نے اپنا پسندیدہ موضوع داماد کے سامنے چھیڑا۔ وہ الفاظ تو نہ تھے جو اس کی ساس کے منہ سے نکل رہے تھے بلکہ وہ تو تلوار کے وار تھے جو اسے بہیمانہ چھلنی کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اس نے بڑی آس سے کچن کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کی۔ سعید ماں کی چارپائی پر بیٹھے خاموشی سے سنتے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی پتھر کا بت خاموش ہوتا ہے۔

اسے اس پل وہ پتھر کا بت ہی لگا' وہ بے جان' احساس سے عاری' لڑکھڑا کے کرسی سے ٹکرائی۔ کچھ ہوش نہ رہا۔ بس ہر صورت کام کرنا تھا سو کام کرتی چلی گئی۔ ہنڈیا چڑھائی' چنے کا پلاؤ بنایا' مچھلی' سلاد' رائتہ' چٹنی۔ سب کرتی گئی بلکہ سب ہوتا چلا گیا' بھیگی اور نم آنکھیں یوں خشک اور ویران تھیں گویا برسوں سے پانی کی بوند نہ دیکھی ہو۔ اس کا کام ختم ہوا تو مہمانوں نے اپنا کام نپٹایا اور گھر کو سدھارے۔ اس نے پھر سے روبوٹ کی مانند کچن سنبھالا' بچوں کو کھلایا' سلایا اور خود بھی چت لیٹ گئی۔ آنکھیں جیسے صحرا کی پیاسی' ریتیلی زمین ہوں۔ اس نے بنجر زمین کو بازو سے ڈھانپ لیا۔

"کیا بات ہے بڑی چپ چپ ہو۔" پتھر کا بت حرکت میں آیا' اس سے پوچھا گیا۔ اور اس پر نظریں ٹکا کے اس کے جواب کا منتظر بیٹھا تھا۔

پیاسی بنجر زمین مدمقابل تھی۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت' بس اک نظر ڈالی اور آنکھیں موند لیں' لیکن نجانے اس نظر میں ایسا کیا تھا جو سعید کو ہلا گیا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور ماں کے قدموں میں جا بیٹھا۔

"اماں میں آپ کا بیٹا ہوں اور آپ میری ماں' یہ رشتہ ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا' کوئی بھی نہیں لیکن بشریٰ میری بیوی ہے اور اس کے بارے میں جیسا آپ سوچتی ہیں ویسا کچھ بھی نہیں۔ آپ لوگوں کے سامنے آئندہ ایسا کچھ بھی نہیں کہیں گی۔ وہ آپ کی بڑی عزت کرتی ہے۔"

پتھر کا بت حرکت کر رہا تھا۔ بشریٰ کو اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیے اور آواز سنائی دی۔ آنسو بنجر زمین کو سیراب کرنے لگے۔

"دیکھا' کردی نا بیوی نے ماں کی شکایت تب ہی تو ماں سے پوچھ گچھ کے لیے دوڑے چلے آئے۔" اسے پھر سے نئے خوف نے جکڑ لیا۔

"اماں ایسی بات نہیں ہے۔ یہ سب مجھے اچھا نہیں لگا آج۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ آپ کو میری خاطر اسے دل سے قبول کرنا ہوگا۔ اسے بھی اپنی بیٹی بنانا ہوگا۔ بولیں کریں گی ناں آپ میری خاطر۔" وہ ماں کی ٹانگیں دباتا جا رہا تھا جسے نگینہ نے پرے کیا۔

"بس بس رہنے دے بیوی کی طرف داری۔ چل جا کے سو جا۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" وہ خود میں سمٹ گئیں تو سعید بھی اپنے کمرے میں چلا آیا۔

بظاہر وہ سوتی بنی ہوئی تھی' لیکن دل ان ہونی خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ جس کی خاطر سب پرانے رشتے چھوڑ کے نئے رشتے بنانے آئی اس نے پہلی بار اس کی خاطر' اس کی صفائی میں کچھ کہا۔ اسے یقین نہ آیا۔ خوشی کے مارے آنسو تکیہ بھگونے لگے۔

ابھی راستہ دشوار ضرور ہے ساس کا دل جیتنے کا' لیکن اب پتھر کے بت میں ہلچل مچ چکی تھی۔ اس لیے یہ دشوار رستہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنی منزل تک پہنچ ہی جائے گا۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے سعید کو دیکھا جو نیند کی وادی میں محو سفر تھا اور آنکھیں موند لیں۔

☼

اکثر ایسا ہوتا کہ دیوان ہاؤس کی دہلیز پار کرنے سے قبل وہ اس آہنی گیٹ کے روبرو ٹھہر سی جاتی تو اس اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی وہاں دو گھڑی دم لینے کی غرض سے رکتی تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ اس گھڑی اس کے ہاتھ میں ایک نادیدہ کتبہ ہوتا تھا جس پر اس کے باپ اور دادا کا نام کندہ تھا تب وہ ایک گہرا، بوجھل سانس لیتے ہوئے سوچتی، کاش میں یہ کتبہ یہاں نصب کر سکتی سو آج بھی اس نے اس پر شکوہ عمارت کو نم آنکھوں کے ساتھ دیکھا پھر بے بس سی ہو کر اپنا دایاں ہاتھ پہلو میں گرا دیا۔ ان شاء اللہ وہ دن بھی آئے گا جب وہ یہ کتبہ کسی ایسے ہی عالی شان گھر کی پیشانی پر نصب کر رہی ہوگی، وہ اپنی زمین بوس شناخت سے یہ عہد کرتی ہوئی جب مضبوط قدموں کے ساتھ وہ گیٹ عبور کر رہی ہوتی تو اس کی دونوں ابروؤں کے بیچ الف کی صورت ابھرنے والی موٹی سلوٹ بہت دور سے بھی نظر آ رہی ہوتی تھی۔

فرزانہ کھرل

میرے دو کیسری پھول

اس کی بھابھی نے اس کے کمرے کا دروازہ جس قدر آہستگی سے کھولا تھا تو چند لمحے بیڈ پر آڑھی ترچھی پڑی اس لڑکی کو گھورنے کے بعد اسی آہستگی سے بند بھی کر دیا تو جھوٹ موٹ کی نیند میں ڈوبی ورشہ تیمور نے پوری آنکھیں کھول کر وال کلاک پر نگاہ ڈالی جہاں صبح کے نو بج رہے تھے۔

وہ رات کو جلدی سونے کی عادی تو نہیں تھی، اس کے علم میں ہوگا کہ نصف شب کو گھر میں ڈاکٹر کیوں آیا تھا۔

جیسے اس کے کمرے میں دروازہ بھیڑنے سے قبل اس کی پیاری بھابھی نے یہ سوال کسی نہایت وزنی شے سے باندھ کر اس کے بستر پر اچھالا تھا جو اس کے

مکمل ناول

کھولتے دماغ پر ٹھنڈ سے لگا تو ورشہ جو پچھلے دو گھنٹوں سے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی ایک دم تلملا کے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں رات گئے جاگتی ہوں اور اگر میں یہ سونے کا ڈراما کر رہی تھی تو صاف ظاہر ہے کہ میں اپنی بیمار دادی کی تیمارداری نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

اس نے عجب طرح کے بیزار موڈ کے ساتھ بستر چھوڑتے ہوئے سامنے آئینے پر نگاہ ڈالی تو آنکھوں کی لالی کے ساتھ ہلکورے لیتی اک باادب سی خوشبو نے اسے یاد دلایا۔

جب تمہیں سب پتا ہے تو تمہارے علم میں یہ بھی ہوگا کہ رات کو اس گھر میں ڈاکٹر کے ساتھ کوئی اور بھی آیا تھا اور وہ نصف شب کا مہمان معاشرتی حیثیت سے اس قدر اعلا تھا کہ اس کی خوشبو بھی مقابل کے دل پر اثر کرتی تھی۔

ورشہ نے منہ بسورتے ہوئے اپنی پلکوں کو پر زور انداز میں جھپکایا یہ ادب زدہ مہک ضرور بھابھی کے دروازہ کھولنے پر میرے کمرے میں گھس آئی ہے۔

وہ اس پروٹوکول مانگتی خوشبو کو بری طرح نظر انداز کرتی آئینے کے سامنے سے ہٹی پھر جب فریش ہونے کے بعد وہ باہر آئی تو ادھر ادھر دیکھے بنا ناک کی سیدھ میں کچن کی جانب آئی۔ بھابھی وہیں موجود تھیں۔

"پلیز جلدی سے مجھے ناشتہ دے دیں ورنہ میشا بی بی یہاں آ گئی تو اس کی مہمان نوازی میں آپ کا ہی وقت ضائع ہوگا۔"

وہ روانی سے ڈائننگ ٹیبل کی جانب بڑھی جھکے سر کے ساتھ بھی وہ خود پر گڑی بھابھی کی نگاہوں کو محسوس کر رہی تھی۔

"تمہاری دادی کئی بار تمہارا پوچھ چکی ہیں پہلے انہیں دیکھ آؤ پھر جو مرضی میں آئے کرنا۔" اس نے یہ ساری بات سکون سے سنی کہ دادی کے معاملے میں بھابھی کا یہ روکھا لہجہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"مجھے ان کا حال نہیں پوچھنا۔" اس نے کرسی پیچھے گھسیٹتے ہوئے اپنے سامنے موجود کی چیز کو درشتی سے گھورا۔

عین اسی وقت کچن کی جانب بڑھتے قسام مالک نے اس لڑکی کے لبوں سے ادا ہوتا وہ مختصر جملہ اپنے مثل اعصاب کے ساتھ سنا۔ وہ جانتا تھا کہ ورشہ اپنی دادی سے ہمیشہ ایک فاصلے پر رہتی تھی۔ لیکن آج دادی کی حالت کے پیش نظر اس لڑکی کی سنگ دلی نے قسام کو منجمد کر دیا۔

"حال پوچھنے کا کون کہہ رہا ہے، تم بس ان کے کمرے میں چلی جاؤ۔ انہیں ایک نظر دیکھ لو تو وہ خوش ہو جائیں گی۔"

اس لمحہ بھابھی کے دبے لہجے میں ایسی لجاجت تھی کہ باہر کھڑے قسام کو ورشہ پر بے انتہا غصہ آیا۔ جبکہ ورشہ نے بھابھی کو تیکھے پن سے دیکھا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے آپ کی ساس کی خوشی سے کوئی غرض نہیں۔"

قسام کو ورشہ کے اس سنگ نما فقرے نے ایک ہولناک آگہی کی سی کیفیت میں دھکیلا۔

وہ تو سمجھتا تھا کہ یہ لڑکی آج کل صرف اسے ہی تنگ کر رہی ہے مگر یہ تو ہر رشتے کے لیے ایک آزمائش ثابت ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے دبے پاؤں پلٹا تھا۔ مگر اس کے قدموں کی تیزی میں ایک نمایاں طیش تھا آخر کیوں وہ اپنی ذات کے ہرے موسم کسی صحرائی زمین میں گاڑنے پر تلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر جب سے دیوان ہاؤس میں ولی عہد کا عہدہ قسام مالک نے سنبھالا تھا تو ملک صاحب کے دور اقتدار میں صبر، شکر اور اطاعت کے ساتھ زندگی گزارنے والی ورشہ تیمور اس نئے امیر اعلا کے سامنے اب شرطوں کی بات کرنے لگی تھی۔ اس کی قابل قبول شرائط مان لی گئی تھیں اور باقی کی مسترد شدہ خواہشات کا ردعمل اس کے ہر عمل میں ہٹ دھرمی کی صورت ظاہر ہو رہا تھا۔

اب وہ ہر ایک کے اعتراض کے باوجود رکشہ،

سواریاں اہل کالونی حتیٰ کہ ان کے گارڈز اور چوکیدار تک کے لیے پریشانی کا باعث تھیں اور کیوں نہ ہوتیں کہ ایک سال قبل تک یہ لڑکی اس پورچ میں موجود لگژری گاڑی میں سفر کرتی تھی تو منظر کچھ یوں ہوتا کہ دوسری گاڑی میں تین چار گارڈ بھی ساتھ ہوتے۔

اس کی یہ حرکتیں اس کی دادی اور بھابھی کے لیے پریشان کن تھیں لیکن ورثہ کو اس کی کچھ خاص پروا نہیں تھی، وہ صرف اس بات پر خوش تھی کہ چنگ چی سے اترتے ہوئے اکثر اتفاقاً سامنے قسام کی بیش قیمت گاڑی ہوتی تو وہ اپنے اندر جیسے سرشاری کا کے ٹو سر کرلیتی تھی، ایسے میں اس کی گھنی پلکوں کا جنگل پہلے سے زیادہ سیاہ ہوجاتا کیونکہ اس کی یہ سواریاں قسام کے لیے صبر کا کڑوا ترین گھونٹ تھیں۔

وہ اس امیر اعلا کی بے چارگی سے لطف اندوز ہوتی تو جیسے جیت سی جاتی۔ وہ کیا کرتی کہ اس شخص کے دور اقتدار میں اسے حکم عدولی اچھی لگنے لگی تھی۔ گویا وہ اس شاہی محل کی واحد باغی تھی۔ وہ یہاں بالکلوں کی حیثیت میں شمار ہوتی تھی نہ یہاں کوئی غلام تھی۔ وہ بخوبی آگاہ تھی کہ اس گھر سے رہائی میں دادی اور بھابھی کبھی اس کا ساتھ نہیں دیں گی۔ وہ اکیلی تھی سو اس کے لیے آزادی کی جنگ لڑنا اور پھر جیتنا مشکل ترین تھا۔ وہ بس میدان جنگ میں اتر آئی تھی اور فی الحال اپنے حریف کے خلاف اس لڑکی کا واحد ہتھیار اس کے دونوں ابروؤں کے بیچ الف کی صورت ابھرنے والی ایک موٹی سلوٹ ہی تھی۔

☆☆☆

قسام مالک کے خاندان کی یہ خاصیت وروایت ان کے آباؤاجداد سے چلی آرہی تھی کہ ان کے خاندان میں صرف مرد حاکم تھا اور اس قدر با اختیار تھا کہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں اپنی اولادوں اور عورتوں سے مشورہ نہیں کرتا تھا بلکہ انہیں صرف حکم سنایا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کم وبیش نصف صدی قبل

پناہ گزین ہوا۔ تو دیوان صاحب کی والدہ اور اہلیہ میں ان مہمانوں کی بابت کسی قسم کے بھی استفسار کی جرأت نہیں تھی لیکن کچھ عرصے بعد آنے والوں کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ سے انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کی یہاں پناہ گزینی کی وجہ غربت یا غلامی نہیں تھی بلکہ انہیں ایک مسئلے میں جانی تحفظ درکار تھا۔

کچھ دن مزید گزرے کہ دیوان ہاؤس کی عورتوں پر اس مسئلے کی حقیقت کسی پہاڑ کی طرح گری تھی جب انہوں نے یہ بھی جان لیا کہ ہمایوں خان بیرسٹر دیوان کا کوئی دیرینہ دوست نہیں تھا، اسے قتل کے الزام میں جیل ہوگئی تھی اور جب اس کا کیس بیرسٹر کے پاس آیا تو چند دنوں میں ہی اس نے اپنی تحقیق اور تجربے کی بنا پر جان لیا کہ ہمایوں بے گناہ ہے پھر اس نے اپنی محنت اور ذہانت سے ہمایوں خان کو گویا پھانسی کے پھندے سے اتارا تھا۔ بیرسٹر کی اس لگن اور محنت نے ہمایوں کا دل اور اس کی روح تک جیت لی۔ اس نے ایک ٹھٹھرتی ہوئی کمبھیر سیاہ رات میں ان میاں بیوی پر اپنے گھر کے دروازے وا کرتے ہوئے ان کے تحفظ کی جو کڑی ذمہ داری اٹھائی تھی وہ دیوان اور اس کے بڑے بیٹے مالک نے اپنی آخری سانس تک تہہ دل سے نبھائی۔

دوسری طرف پہلے ہمایوں خان اور پھر اس کے بیٹے تیمور نے بھی اپنی خاندانی اور مالی حیثیت کو پس پشت ڈال کر ان کا یہ احسان باادب غلاموں کی صورت ان کی تابع داری میں ہی چکایا تھا۔ دیوان صاحب کی بہنیں، اس کی والدہ، اس کی بیوی، اس کی بھاوجیں ان کی حقیقت جاننے کے بعد جس خاندان کو مہمان خانے میں برداشت نہیں کررہی تھیں۔ ان کے لیے بنگلے کے سب سے محفوظ کونے میں ایک الگ پورشن مختص کیا جانے لگا تو وہ بھڑ کتے دل اور گنگ زبانوں کے ساتھ جیسے انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔

آج سالوں گزرنے کے بعد بھی اس خاندان کی عورتوں کی زبانیں گو بند تھیں مگر آج بھی وہ فیملی ان

وقت کا کھیل تھا کہ ہمایوں کی زندگی میں پیش آنے والا وہ اتفاقیہ حادثہ اس کی نسل کو بے نام ونشان کر چکا تھا اور یہ حقیقت قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

لیکن اب ہمایوں کی پوتی ورشہ تیمور ہر حقیقت کو ٹھوکر پر رکھتے ہوئے اپنی ذات کو کھلی فضا میں اڑتا دیکھنے کی خواہاں تھی۔

☆☆☆

''تم نے میرے پیڑ سے سارے کے سارے پھول توڑ لیے ہیں، تم ایک گندی بچی ہو۔''

تیرہ سالہ ورشہ اس بیڈ روم کا دروازہ دھڑ سے کھولتے ہوئے اندر آئی تھی اور بیڈ سائیڈ پر کھڑے ہوکر زور دار آواز میں ایک بستر میں گھسی بچی سے بولی۔ جو اس کی ہم عمر تھی گو اسے چچا انکل کی بہو فاخرہ آنٹی کے غصے سے ڈر بھی لگتا تھا لیکن آج وہ اس قدر صدمے میں تھی کہ وہ کمرے میں ان کی موجودگی کی پروا کیے بنا جیسے ان کی بیٹی ثمن پر چیخی تھی۔ فاخرہ آنٹی کسی تیر کی سی تیزی سے اس کی جانب لپکی تھیں۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو ورشہ! کیسا پیڑ..... کون سے پھول؟''

آنکھیں جھپکتی ثمن کہنیوں کے بل سیدھی ہوئی۔

''تم ممی سے پوچھ لو، میں تو ابھی تمہاری آواز سے جاگی ہوں۔'' ثمن کسی پکے چور کی طرح اپنی واردات سے مکر گئی۔

''کسی کے روم میں آنے کا یہ کون سا طریقہ ہے اور تم ثمن سے کس طرح بات کر رہی ہو؟''

اس سے پہلے کہ ورشہ ثمن کو بتا پاتی کہ میرا وہ پیڑ اور میرے وہ تیسری پھول..... فاخرہ نے اسے کندھوں سے دبوچتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

''ذرا مجھے یہ تو بتاؤ، اس گھر میں کون سی جگہ ہے جو تمہارے دادا دادی اپنے ساتھ لائے تھے۔'' وہ ''میرا پیڑ میرے پھول۔'' انہوں نے ورشہ کا یہ جملہ چبا چبا کے دہرایا۔

وہ بچی اب سب کچھ بھول کر ان کے غصے سے حواس باختہ ہوئی۔ فاخرہ اسے یونہی کندھے سے دبوچے کمرے سے باہر لے آئیں۔

''اس کا دادا اور باپ تو اس گھر میں سر جھکائے زندگی گزار گئے مگر اس آج کی نسل کو دیکھو کیسے حق جتانے پر اتر آئی ہے۔''

ان کی تیز آواز بہت اونچی تھی اب وہ دونوں اس پورشن کے لاؤنج میں تھیں۔ اسے اپنے کندھے کی تکلیف اور فاخرہ کے غصے کی پروا نہیں تھی۔ اسے اس وقت اس شرمندگی کی پروا تھی۔ جو اسے وہاں کام کرتے ملازمین کے سامنے اٹھانی پڑ رہی تھی۔

''دیوان صاحب کے بعد اس گھر کا صاحب اختیار میرا شوہر ہوتا تو ان بھگوڑوں کی پائی پائی کا حساب کتاب کر کے ہم کب کی جان چھڑا چکے ہوتے۔''

انہوں نے کچن کے دروازے تک آکر ورشہ کو بوا کے حوالے کیا۔

''سب کے سب کان کھول کر سن لو، آئندہ اس لڑکی کو میری اجازت کے بغیر اندر نہیں آنے دیا جائے۔'' ان کی تحکمانہ آواز نے برسوں کی بھڑاس کو جیسے لمحوں میں اگلا۔

ورشہ بوا کی طرف لڑھکتے ہی کچن کے دوسرے دروازے سے بھاگ نکلی تھی۔

اس دن زندگی میں پہلی بار وہ ایک چونکنے جیسی گہری کیفیت کے ساتھ گھر لوٹی تھی۔ وہ گھر آتے ہی سیدھا دادی کے پاس آئی۔ جن کے ہاتھ میں فریم تھا، وہ ایک سفید چادر پر سیاہ پھول کاڑھ رہی تھیں۔

''دادی۔'' ورشہ کے بے حد قریب کھڑا ہونے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو اس کا چہرہ دیکھ کے ٹھٹکیں۔

''بنگلے کے گیٹ پر نیم پلیٹ ہے۔ اس پر صرف

[illegible] اور وحید کے دادا کا نام درج ہے۔ وہاں میرے دادا کا نام اس لیے نہیں لکھا گیا کیونکہ یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔"

وہ آج جس تکلیف سے گزری تھی تو دادی کو یہ حقیقت بتانا چاہتی تھی لیکن اچانک اسے اب تک دادی سے کیے جانے والے وہ سارے سوال یاد آئے جن کے دادی نے اسے غلط جواب دیے تھے۔ جیسے کہ ایک سال پہلے بڑی بوا دو ماہ کی چھٹی کے بعد بنگلے میں واپس آئی تھیں اور انہوں نے بھابھی کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ وہ کسی گاؤں میں اپنے دادا کے پرانے گھر گئی ہوئی تھیں۔

بوا سے یہ بات سننے کے بعد اس وقت بھی وہ سیدھا دادی کے پاس آئی۔

"دادی! ان چھٹیوں میں ہم سب بھی دادا کے یا آپ کے پرانے گھر جائیں گے۔" وہ ان کے کندھے سے لٹک کر بہت دلار سے بولی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ پوتی کی اس فرمائش نے اس کی دادی کو کسی کانچ سے اٹے تنگ و تاریک کنویں میں گرایا تھا۔ وہ ان کے کندھے سے جھولتی ہوئی ان کی گود تک آئی۔

"دادی پلیز، ہم جائیں گے نا۔" اس نے ضدی پن کے ساتھ گونگوں سے بڑھ کر خاموش بیٹھی دادی سے جیسے تائید چاہی، وہ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

"ہم نہیں جا سکتے کیونکہ تمہارے دادا سے اور مجھ سے ان گھروں کا پتا گم ہو چکا ہے۔" انہوں نے یہ بات اس قدر ہلکی آواز میں کی تھی کہ ان کی گود میں چڑھی ان کی پوتی ہی سن پائی کیونکہ ان کا یہ جملہ اس کمرے کے اندر یا باہر کسی بھی باشعور ہستی کے لیے ایک مضحکہ خیز بات تھی۔ اس دن ورثہ کا لمحوں میں [illegible] گیا خواب لمحوں میں ہی ٹوٹ گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے ورثہ! تم تو ابھی بارش میں نہانے گئی تھیں۔"

دادی نے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر اس کی [illegible] پہن کر وہ باہر لان میں گئی تھی اور دادی تب سے بارش کی منتظر تھیں۔ جب بارش تھمنے کے بعد اپنی بھابھی کی ڈانٹ سے چھپتی چھپاتی ورثہ اپنے بالوں اور فراک میں اٹکے بھیگے زرد پھولوں اور فراک کے گلے دامن سے ٹپکتے اس خوش رو کیسری رنگ کے ساتھ دادی کی گود میں چھپتی تو بس ان لمحات میں وہ لٹھے جیسی عورت بھی رنگ دار ہو جاتی تھی۔

وہ آج دادی کو حیران اور بے رنگ چھوڑ کے ان کے کمرے سے باہر آ چکی تھی وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ اسے فاخرہ آنٹی کی باتوں کے معنی مطلب بھی وہی شخص بتا سکتا ہے جس کو وہ دادی سے کیے گئے سوال بتایا کرتی تھی اور دادی سے سنے گئے جواب بتایا کرتی تھی جو سارے کے سارے غلط ہوتے تھے۔

☆☆☆

وہ جب بچپن سے لڑکپن کی طرف آئی تھی اس نے ہر بات کو اور سب کے رویوں کو سوچنا سمجھنا شروع کیا تھا تو اس نے ان کے رہائشی حصے میں آنا جانا کم کر دیا تھا پھر مالک انکل کی وفات کے بعد وہ وہاں صرف زرش بی کے بلاوے پر ہی جاتی تھی۔ اب رعنا بھابھی بھی ادھر جانے لگتیں تو احساس زیاں جو ورثہ کے اندر تھا۔ وہ اس کا کچھ حصہ اپنی بھابھی کے ہاتھ میں بھی تھما دیتی، لیکن وہ ورثہ نہیں رعنا تھیں وہ وہاں جاتیں تو داخلی کوریڈور میں قدم رکھتے ہی ورثہ کی نصیحتوں کا پلندہ اس کشادہ لابی میں پھاڑ کر آگے بڑھ جاتیں۔ جہاں اندرونی جانب کوریڈور کے پہلے سرے پر جبار صاحب کے پورشن کا دروازہ ہمہ وقت کھلا ملتا۔

"آپ نے اندر جھانک کر کسی ملازمہ کو سلام نہیں کرنا۔ اور فاخرہ آنٹی آپ کو جس لب و لہجے میں مخاطب کریں، آپ نے اسی لہجے میں جواب دینا ہے۔"

مگر رعنا بھابھی کی یادداشت ان معاملات میں بہت خراب تھی۔ وہ ہمیشہ ہر نوکر، مالک سے سامنا

ہونے پر نہایت خوش اخلاقی سے سلام دعا کرتی ہوئی اس قالین پوش کو ریڈور کے آخری سرے پر جب پیتل، کانسی اور چاندی سے منقش صندل کے بھاری دروازے پر دستک دے رہی ہوتیں تو بے اختیار ورثہ کی بات یاد آجاتی۔

''جب اس گھر کے تمام افراد اس بڑے پورشن میں بنا دستک کے آتے جاتے ہیں تو صرف ہم پر دستک دینا کیوں لازم ہے۔''

اس کا شکوہ کسی حد تک درست تھا، گویا یہ دستک ان کی حیثیت اور مرتبہ میں واضح تفریق تھی لیکن وہ وقت کے فیصلے قبول کرنے والی رعنا تھیں وہ اس پر حیثیت دروازے کے کھلنے پر اپنا منتشر ذہن سنبھال لیتیں۔

جب چند منٹوں بعد وہ ایک آرام دہ نشست پر زرش بی سے پرسکون اعصاب کے ساتھ بات کر رہی ہوتیں تو جیسے ہر مرتبہ اور ہر تفریق ختم ہو جاتی۔ وہ دونوں خواتین ہم عمر نہیں تھیں مگر ہم مزاج تھیں ان میں تحفے تحائف کا لین دین رہتا تھا۔

رعنا آج بھی یہاں صرف ملنے کی غرض سے نہیں آئی تھیں بلکہ ان کے ہاتھ میں ایک خاص تحفہ تھا اس وقت زرش بی کا مصروف انداز اور ان کے چہرے کی رونق قسام کے اپنی شکارگاہ سے واپسی کی بدولت ہی تھی۔

''آپ تو جانتی ہیں کہ گھر کے کسی بھی کام میں مجھے ورثہ کا تعاون حاصل نہیں۔ ورنہ دو تین قمیصیں میں ایک ہفتے میں کاڑھ لیتی تھی۔''

وہ اپنے شکوے صرف زرش بی سے ہی کر لیتی تھیں پھر وہ اپنے لہجے سے تاسف جھٹکتے ہوتے جبراً مسکرائیں۔

''دیکھیں تو اس بار میں نے آپ کا کرتا بہت دل سے اور نفاست سے کاڑھا ہے۔'' وہ زرش بی کے سامنے کرتا پھیلاتے ہوئے معنی خیزی سے گویا ہوئیں۔ اور جاننے والوں نے جان لیا کہ یہ اس قدر نفاست کن ہاتھوں کی مرہون منت ہے۔

''یہ تمہاری محبت ہے رعنا، ورنہ اس مشینی دور میں اتنا تردد اب کون کرتا ہے۔'' زرش نے اپنے سامنے رکھے تحفے پر بھرپور نگاہ ڈالی یہ پہلی بار نہیں تھا کہ کڑھائی دیکھ کر وہ چونکی نہ ہوں وہ یک بار جیسے دل سے مسکرائیں۔

''ماشاء اللہ یہ ٹانکے تو اماں کے ہاتھ سے لگے ہیں۔'' انہوں نے ٹانکوں کو نہایت محبت سے چھوا۔

''لگتا ہے ان دادی پوتی کے تعلقات میں کچھ بہتری آئی ہے ورنہ اماں تو ورثہ کے رویوں سے جیسے دنیا داری سے کٹ ہی گئی تھیں۔'' وہ گلے پر لگی ڈوری کو سیدھا کرتے ہوئے دکھی سا ہو کر بولیں۔

''پتا نہیں یہ بہتری ہے یا کچھ اور کہ پہلے وہ دادی سے کچھ ہوں ہاں کر لیتی تھی اب کئی ماہ سے وہ بھی بند ہے۔''

رعنا کے بوجھل لہجے اور ٹھنڈی آہ سے وہاں ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

''ورثہ کو میرے پاس بھیجنا، میں اسے سمجھا دوں گی۔''

انہوں نے متانت سے نگاہ ہٹائی اور دوبارہ کرتے کے دامن سے جڑی ریشم کی اس سیاہ ڈوری کو سیدھے رخ موڑنا چاہا مگر ناکام ہوئیں کہ اماں سے کہیں تو غلطی ہوئی تھی، کوئی تو ٹانکا ایسا تھا جو غلط لگ گیا تھا وہ اس غلطی پر اماں سے شکوہ کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی، وہ بس محسوس کر سکتی تھیں کہ سیاہ ڈوری میں سے جھلکتا خوش کن ریشم اب پشیمانی کی کیفیت میں تھا کہ کسی ایک غلط ٹانکے نے سب کچھ الجھا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت اپنے کمرے کے پچھلے ٹیرس پر اپنا اسمارٹ فون کان اور کندھے کے بیچ دبائے ایک ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کین لیے دوسرا ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر جیسے کسی کو لوکیشن سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کے گرد کہیں ہیلو، ہیلو کی آواز ابھری۔ اس نے یونہی بات کرتے کرتے اپنے دائیں بائیں دیکھا لیکن

ٹیرس پر وہ اکیلا تھا۔ اس سیاہ پڑتی شام میں وہ آواز اس کا وہم نہیں تھی اور واقعی ایک ذرا توقف کے بعد وہی آواز دوبارہ ابھری۔ وہ اب بھی ٹیرس سے جڑے اس گھنے درخت کی جانب دیکھنے کے بجائے اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ آواز ورثہ کی تھی اور وہ دوبارہ اس درخت پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی۔ ابھی چھ ماہ پہلے وہ اسی درخت سے اترتے ہوئے گری تھی اور اس کا بازو فریکچر ہوگیا تھا۔

''افوہ بدھو! ادھر سامنے دیکھو۔'' بالآخر اسے کچھ اونچا بولنا پڑا، اس نے سامنے دیکھا، پھر وہ ہکا بکا ہوا۔

''یار! میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے عجلت میں فون بند کیا۔

پھر وہ خفگی کے عالم میں آگے بڑھا، ایک تو آج کل وہ یونی میں اپنے ایڈمشن کے سلسلے میں بزی تھا۔ دوسرا اس کی پھوپھو جو کمن کی برتھ ڈے اٹینڈ کرنے آئی ہوئی تھیں، کچھ روز قبل ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ کوئی سیریس ایکسیڈنٹ نہیں تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھیں، مگر احوال پوچھنے والے دوست احباب کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ جب بھی بڑے پورشن میں جھانکتی تو قسام اسے مہمانوں کے پاس ہی نظر آتا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟'' وہ اسے ڈانٹتے ہوئے ریلنگ کے قریب ہوا، اب فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کے اسے پکڑ سکتا تھا۔

''اب کیا دوسرا بازو تڑوانے کا ارادہ ہے۔'' وہ ڈپٹ کے بولا۔ وہ آج اس پر پہلی مرتبہ یوں غصہ ہوا۔

''تو کیا کرتی، بات بھی ضروری تھی اور تم سے کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔'' وہ اس کے غصے کی پروا کیے بنا اطمینان سے بولی۔

''ہاں پہلے کی تمام باتوں جیسی ضروری بات۔'' وہ اس کے اطمینان سے چڑ کر غصے سے گویا ہوا۔ اور ریلنگ پہ دونوں ہاتھ جماتے ہوئے اسے گھورنے لگا۔

کوئی بھی یہ بنگلہ چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہوجائے تو کیا تیس چالیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ہم اس گھر کا ایڈریس بھول سکتے ہیں؟'' وہ بہت سوچ کے جیسے ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولی۔ ''مطلب کہ جیسے۔'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''تم پتا نہیں کیا چیز ہو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر جھنجلا کے بولا۔ اس نے ریلنگ پر جمے اپنے ہاتھ ہٹائے۔ ''تم نے اس احمقانہ سوال کی خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے۔''

اس نے ایک ہاتھ جینز کی پاکٹ میں ڈالتے ہوئے یوں دیکھا جیسے اسے اسٹوپڈ کہنے کی شدید خواہش کو دبا لیا ہو، وہ اسے پاکٹ سے سیل فون نکالتا دیکھ کر پریشان ہوئی، قسام کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ اسے جواب دیے بنا ابھی نظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔

''جسے تم احمقانہ سوال سمجھ رہے ہو، وہ اسی خاص ہستی کا جواب ہے۔''

وہ آج پھر روہانسی ہوئی۔ اپنے سیل پر ٹیکسٹ کرتا قسام اس کی روہانسی آواز پر چونکا نہ پریشان ہوا۔

''ہاؤ فنی۔'' وہ یونہی سر جھکائے مسکرایا پھر اسی سابقہ جگہ پر آکر بولا تو اس کے لبوں سے ابھرتا وہ سوال اس تمام سچویشن سے ہٹ کر تھا۔ ورثہ نے اسے ہونقوں کی طرح دیکھا یہاں تک کہ قسام نے وہی سوال پھر سے اور برہمی سے دہرایا۔

''ہاؤ اولڈ آر یو ناؤ؟''

احمقانہ سوال اس طرح کے ہوتے ہیں، وہ یہ کہنا چاہتی تھی اگر وہ کہہ دیتی تو پھر دادی کی باتوں سے غلط اور صحیح کو کس طرح الگ کرتی اور وہ ایک اچھا ٹیچر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ''بارہ سال اور دو ماہ۔'' وہ جل بھن کے بولی۔

''وہ خاص ہستی تمہاری کوئی ٹیچر ہے۔ کوئی فرینڈ ہے یا پھر تمہارا خیالی پلاؤ، لیکن اب تم اسے اپنی ایج ضرور بتانا۔ آئی تھنک، وہ تمہیں کوئی دودھ پیتی

بچی سمجھتی ہے جو بھی ہے وہ تم سے مخلص نہیں ہے اس لیے ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتی ہے۔"

اس نے یہ بات اسے ایک شرمندہ کرنے اور دل جلانے جیسی مسکراہٹ کے ساتھ سمجھائی۔ ورشہ کی حالت اس چڑیا جیسی ہوئی جو اسے اپنے گھونسلے کے بے حد قریب دیکھ کر ایک دوسری شاخ پر منہ لٹکا کے بیٹھی تھی۔

"ہر جواب غلط، آخر دادی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔"

گوٹ اس سوال پر پھنس چکی تھی۔ وہ اس شام اس قدر بددل اور ڈپریسڈ تھی کہ اگر اسے چڑیا کا احساس نہ ہوتا تو وہ آج کی رات اس گھونسلے میں گزار سکتی تھی۔

☆☆☆

آج کل وہ اور میشا ایک ساتھ شاپنگ کر رہی تھیں کیونکہ انہیں ایک یونی فرینڈ کی شادی اٹینڈ کرنا تھی۔ آج شاپنگ کا اینڈ کرتے ہوئے جب وہ دونوں ایک ساتھ پارلر گئیں تو دونوں کا موڈ اچھا تھا پھر اس نے میشا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اپنے بے حد لمبے سیاہ بالوں کو بالکل شارٹ کٹنگ میں سیٹ کروانے کے ساتھ ایک عجیب سے کلر میں اسٹریکنگ بھی کروالی تھی، واپسی پر میشا کا موڈ آف تھا اور ورشہ مطمئن تھی۔

وہ خوش بھی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ تبدیلی اسے کس قدر شارپ اور ضدی قسم کی لڑکی ظاہر کرسکتی ہے۔ اب وہ جتنا بھی خوش ہولیتی اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کا ہیئر اسٹائل بھابھی کا دل بھی بند کرسکتا ہے۔

پارلر سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گاڑی جب دیوان ہاؤس سے سو گز کے فاصلے پر تھی تو سامنے کے منظر نے اسے ملال میں مبتلا کیا جہاں چوکیدار بنگلے کا گیٹ کھول رہا تھا۔

"اوشٹ!" اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں کاش وہ اس وقت میشا کی گاڑی میں نہ ہوتی اور اس وقت کوئی بھی نیلا پیلا رکشہ، قسام کی لگژری گاڑی کے قریب پھٹ پھٹ کر رہا ہوتا تو اس اعلا شخص اور اس کے قیمتی ڈریس میں رچی بسی برانڈڈ پرفیوم کی مہک تک کنگال ہوچکی ہوتی۔

"یہیں رکو پلیز!" اس نے میشا کے اسٹیئرنگ گھماتے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا جبکہ نگاہ سامنے مرکوز تھی جہاں اب گاڑی کھلا گیٹ عبور کر رہی تھی، میشا اب کئی ماہ سے اس کی ان حرکات پر حیرت زدہ ہونا چھوڑ چکی تھی۔ ورشہ کی بھٹکتی روش اس کی سمجھ سے باہر تھی ورنہ وہ جانتی تھی کہ اس گھر کا ولی عہد اسے بحری جہاز تک دان کرسکتا تھا۔

اس نے ایک تاسف بھری سانس پر گزارا کرتے ہوئے ایک بیل بوٹوں سے لدی دیوار کے ساتھ نرمی سے بریک لگائے۔ اس کی نگاہ نے آج بھی دیوان ہاؤس کو حسرت اور ستائش سے دیکھا۔ کئی ایکڑ پر پھیلا یہ بنگلہ جانے کب تعمیر ہوا تھا لیکن آج بھی نیا نکور دکھتا تھا اس کی فصیل نما چار دیواری کے اندر اور باہر اگر حفاظت کا انتظام آج بھی سخت تھا تو میشا جانتی تھی کہ وہ دیوان ہاؤس کے مالکوں کے لیے نہیں تھا وہ اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی کے لیے تھا۔ قسام کا کوئی جرم تو تھا جو ورشہ تیمور کو اپنے منصوبوں میں اس کے لیے ہر سزا بوٹی لگ رہی تھی۔

"جب اس بنگلے کی بولی لگے گی تو میں اسے خرید کر تمہیں گفٹ کردوں گی۔" وہ میشا کی دلچسپی بھانپتے ہوئے ایک شاہانہ ادا سے گویا ہوئی تو اس کے چہرے کی لالی میں ایک پراسراری چمک ابھری۔

"اف یہ لڑکی! وہ جی ہی جی میں تلملائی۔" یہ ناممکن خواب ان کو دکھاؤ، جو تمہیں جانتے نہ ہوں، تم اتنی دولت مند نہیں ہو، سو اس خواہ مخواہ کی مقابلہ بازی کا کچھ فائدہ نہیں مائی ڈیئر۔"

وہ جس طرح سے مسکرائی تھی تو شاید اس استہزائیہ مسکراہٹ نے ورشہ کو مشتعل کیا ورنہ وہ یوں بے اختیاری میں اپنا پلان کیوں کر لیک کرتی۔

"میں جانتی ہوں کہ میری فیملی اور تم اس

مقابلے بازی کو اس وقت سنجیدگی سے لوٹی جس وقت قسام مالک کا ہم پلہ یہ کیس جیت کر میرے ساتھ کھڑا ہوگا۔"

وہ اپنے اشتعال پر خاک ڈالتی اس قدر تحمل سے گویا ہوئی کہ میشا چونکی، اور اس کی آنکھوں میں بے یقینی جھلکی۔ وہ اگلے کئی لمحوں تک غصے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں اسے تکے گئی۔ وہ اپنی دوست کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ کس شخص کی بات کر رہی ہے۔

ورثہ کو یہ تو یاد تھا کہ وہ جس کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ مقابلہ جیتنا چاہتی ہے وہ قسام کی برابری پر تھا اور وہ یہ بھول چکی تھی کہ اس بھرے شہر میں وہ واحد شخص تھا جو قسام کا کھلا حریف تھا۔

کیا ورثہ اس قدر بے رحم بھی ہو سکتی ہے۔

وہ صدمے جیسی کیفیت میں تھی۔ اس نے اپنی سانس بدقت بحال کی کہ اس کی دوست جانے کیوں ایک بلند بخت شخص کے ہاتھ سے اپنا سفر چھین کر ایک اندھے کنویں کی جانب بڑھ رہی تھی تو کیوں؟

☆☆☆

اس پر ہمیشہ اور ہر لحاظ سے جیت غالب رہی تھی وہ سمجھتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن سے وقت ناانصافی نہیں کر سکتا لیکن آج کل وہ وقت کی یہ ناانصافی جھیل رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے شام و سحر اور اس کے گھر کی دھوپ چھاؤں سے جیسے گم ہوتی جا رہی تھی یہ اس کی زندگی کا پہلا خسارہ تھا۔

اگر وہ اس کے ہر عمل پر خاموش تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس سے غافل تھا۔ تاہم وہ ورثہ کی ضد اور اس کے روز و شب میں برپا ہوتی تبدیلیوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دیوان ہاؤس سے جانا اس کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ قسام اسے کسی صورت یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

اس نے سائیڈ مرر سے نگاہ ہٹاتے ہوئے ایک گہرا سانس بھرا پھر اس نے اپنا سیل فون اٹھایا، اسے آن کرتے ہی واٹس ایپ پر گیا۔ اور بے اختیار چونکا۔

"اٹس ناٹ گڈ....." اور گیٹ کے پار آج اپنا دوپٹہ سنبھالتی وہ لڑکی بے خبر تھی کہ اس کی دن بھر کی سرگرمیاں قسام کو واٹس ایپ ہو چکی تھیں۔

وہ آج دوسری بار وہاں گئی تھی لیکن کیوں؟ وہ الجھا اور اس نے سر اٹھا کر ان قد آور درختوں میں گھری اس طویل القامت چار دیواری پر بے چین نگاہ ڈالی۔

اپنے دل سے توہمات کو جھٹکتے ہوئے اپنے رہائشی ایریا کی طرف جانے کے بجائے بنگلے کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں کی مکین نے آج کل اس کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ چار دیواری بھی مضبوط تھی اور یہاں سکیورٹی بھی اعلا ترین تھی، جب ہر جگہ سب ٹھیک تھا پھر وہ کس چیز سے خوف زدہ تھا کہ پرسکون ہونے کے باوجود ایک سائیں، سائیں کرتی الجھن اور بے سکونی بھی مسلسل اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

گہرے نیلے دبیز پردوں سے ڈھکی سا گوانی کھڑکیوں کے پار شام کا لاپروا سا اجالا جیسے رات کی بوجھل اور متفکر سیاہی میں مدغم ہوا جا رہا تھا اس وقت دیوان ہاؤس کے پورشن میں اپنی مخصوص نشست پر براجمان زرش بی اپنی چھوٹی بہن فاخرہ کی گفتگو کو سننے اور سمجھنے کے بجائے بس بے خیالی میں مسکرا رہی تھیں۔

اگر فاخرہ غور کرتی تو جان لیتی کہ اس کی آپا الجھی ہوئی تھیں اور ان کا دھیان جانے کہاں بھٹک رہا تھا، وہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں بیاہی ہوئی تھیں، ان دونوں کے مزاج و اطوار میں بھی اس شام اور رات جیسا ہی فرق تھا، یہی وجہ تھی کہ ان کی اولادوں کی طبیعت، تربیت اور طرز زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی فرق نمایاں تھا۔

قسام نے وکالت کا پیشہ اپنے باپ کی خواہش پر چنا تھا مگر اپنے پولیٹیکل بیک گراؤنڈ کو سخت تگ و دو

چچازاد ولید باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا فیملی بزنس خوب احسن طریقے سے سنبھال رہا تھا۔

دوسری طرف زرش اور فاخرہ کے میکے کا ہر مرد سول اور گورنمنٹ سروس میں تھا۔ اس طرح ان دونوں خاندانوں کے گٹھ جوڑ نے انہیں نمایاں حیثیت دے رکھی تھی سو ہمیشہ سے دیوان فیملی کا شمار اس شہر کی اعلا تعلیم یافتہ اور نامور پولیٹیکل فیملی میں ہوتا تھا۔ اس قدر ناموری اور طاقت کے باوجود بھی دیوان فیملی کچھ سال پہلے چند کرائسس کا شکار رہی تھی۔ ان کی زندگی میں اچانک رونما ہونے والا وہ حادثہ چند گھنٹوں میں حل ہوگیا تھا مگر ان کے پورے خاندان نے اس حادثے کا ذمہ دار ہمایوں فیملی کو ٹھہرایا تھا تو کچھ غلط نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے باسیوں کے ذہن ودل پر گھنٹوں میں حل ہوجانے والے اس حادثے کے اثرات ان چار پانچ سالوں میں معدوم ہونے کے باوجود اکثر سر اٹھا لیتے تھے۔

اب یہاں فاخرہ جیسے لاپرواہ قسم کے لوگوں کے نزدیک دیوان فیملی میں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا اور اسے یونہی ٹھیک ہی چلتے رہنا تھا لیکن زرش بی الگ سوچ کی مالک تھیں۔ وہ بہن کی طرح جذباتی نہیں تھیں وہ سوجھ بوجھ والی اور زیرک نگاہ تھیں، اس لیے ان کو پچھلے ایک ماہ سے ایک فیملی ڈنر کے بعد اس سب ٹھیک میں سے سب کچھ غلط ہونے کی بو آنے لگی تھی۔

ان کے خاندان میں یہ رواج برسوں پرانا تھا کہ کسی بھی مرد کو سفر پر جانا ہوتا تو اس دن تمام بہن بھائی، لنچ یا ڈنر ایک ساتھ کرتے، کبھی قسام کو کچھ عرصہ کے لیے اپنی شکارگاہ پر جانا ہوتا یا پھر ولید بیرون ملک کسی بزنس ٹور پر جارہا ہوتا تو ان کی روانگی اور واپسی، ان دونوں صورتوں میں دونوں فیملیاں ایک دوسرے کے ہاں مدعو ہوتیں کہ ڈنر چھوٹے پورشن میں ہوتا تو فاخرہ تقریباً اپنا سارا میکہ مدعو کرلیتی۔ اس کے برعکس زرش بی بیٹے کا مزاج سمجھتے ہوئے ایسی نوعیت کے ڈنر پر اس قدر گریز رنگ کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

کے رہائشی بھی مدعو ہوتے، ایسے میں فاخرہ اور ولید کے خراب موڈ کی بھی پروا نہیں کی جاتی تھی لیکن مالک صاحب کی وفات کے بعد شاید زرش بی اپنی بہن اور اس کی اولاد کی پرواہ کرنے لگی تھیں۔ یا پھر شاید ورثہ تیمور نے خود کو بہت محدود کرلیا تھا جو بھی تھا اب وہ بڑے پورشن کے فیملی ڈنر میں شرکت نہیں کرتی تھی۔ فاخرہ اس تبدیلی پر بہت مطمئن اور خوش تھی جبکہ زرش بی اس تبدیلی پر بس خاموش تھیں وہ فاخرہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں لیکن ان کی سوچ کہیں اور بھٹک رہی تھی۔

جب ایک ماہ قبل ڈنر ختم کرنے کے بعد وہ سب چائے پی رہے تھے اور فاخرہ انہیں یونہی کسی فنکشن کی تفصیل بتانے میں محو تھی زرش بی اسے سنتے ہوئے ذرا فاصلے پر بیٹھے قسام اور ولید کے درمیان ہونے والی گفتگو پر توجہ نہیں دے سکیں۔ مگر ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی ان کو یاد تھا کہ ان دونوں کی بحث کسی تلخ کلامی پر ختم ہوئی تھی پھر جیسے ان تینوں خواتین کو اپنی جانب متوجہ پا کر ایک دم سنبھل گئے۔

قسام اگلی صبح شکارگاہ چلا گیا تو وہ اس سے تلخ کلامی کی وجہ دریافت نہیں کرسکیں، فاخرہ اور ثمن نے تو شاید اس سب کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا لیکن وہ اگلے کئی دن پریشان رہنے کے بعد اب کچھ مطمئن ہوچکی تھیں مگر ان کا اطمینان آج لنچ ٹیبل پر اس وقت بھک سے اڑ گیا جب قسام اور ولید نے ایک ماہ بعد کی ملاقات پر آپس میں چند رسمی جملوں کا تبادلہ بھی سابقہ انداز میں کیا۔

فاخرہ اپنی گفتگو کے دوران اس وقت کھٹکی جب وہ زرش بی کو اپنی دوست کی بیماری کا بتا رہی تھی اور وہ جواباً مسکرائے جارہی تھیں۔ فاخرہ ایک دم خاموش ہوئی، اس نے بڑی بہن کی عدم توجہی کو جیسے اچانک نوٹ کیا۔ کوئی تو مسئلہ تھا جس نے اس کی ذہین وفطین بہن کو الجھا رکھا تھا۔ وہ ان کی غائب دماغی پر چونکی۔

''بتائیں تو آپا! میں بھلا ابھی کس کا ذکر کررہی

تھی۔ وہ اپنے دونوں بجرے دبائے ہوئے تھی سے گویا ہوئی۔

اب اگر زرش بی اس کو اپنے پریشان کن وہمات سے آگاہ کرتیں تو تیز مزاج کی مالک فاخرہ، ولید سے اس بات کی پوچھ گچھ جانے کس انداز میں کرتی جبکہ وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔

''ہاں..... وہ..... میں دراصل.....'' وہ ذرا سا گڑبڑانے کے بعد کوئی مناسب جواب تلاش ہی لیتیں۔ اسی پل لاؤنج کا دروازہ برق رفتاری سے کھلا، اور ثمن کی طوفانی آمد نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ زرش بی نے تشکر بھرا سانس لیا کہ ان پر حاوی وہ مشکل گھڑی فی الفور ٹل گئی تھی۔

''اللہ خیر!'' فاخرہ نے بیٹی کی اس حرکت پر اسے تند نگاہی سے دیکھا کہ خالہ کے گھر بھی مینرز کے ساتھ آیا جاتا ہے، جسے ثمن نے سہولت سے نظر انداز کیا۔

اگلے ایک منٹ تک وہ لاؤنج کی ہر چھوٹی بڑی لائٹ آن کر چکی تھی۔ وہ عموماً ایسا نہیں کرتی تھی۔ وہ اس طرح کا مظاہرہ اس وقت کرتی جب اسے قسام سے کوئی شکایت ہوتی یا پھر اسے خالہ کے سامنے خود پر عائد پابندیوں کا غبار نکالنا ہوتا۔ تب یہاں آتے ہی وہ بڑے پورشن کا پرسکون ماحول لمحوں میں بدل کے رکھ دیتی، اس کے خیال میں یہ تیز ترین روشنی اس کی مہربان قسم کی خالہ کو پوری آنکھیں کھولنے پر مجبور کرتی تھی۔

''اب یہ بچکانہ عادتیں چھوڑ دو ثمن!'' اس نے ماں کی سیاست آواز کا ایک بار پھر نظر انداز کیا۔

زرش بی نے بہن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جانے کیوں مگر انہیں ثمن کی یہ عادت بہت پیاری لگتی تھی کہ وہ یہاں آ کر پہلے فانوس روشن کرتی تو وہ بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ دبا کر پورے وجود پر مصنوعی سنجیدگی طاری کر لیتیں۔ وہ کبھی اسے سمجھا نہیں پائیں کہ شکوے شکایت دکھائے نہیں جاتے بلکہ سنائے جاتے ہیں۔ لیکن آج ثمن الگ موڈ میں تھی۔

اس نے زرش بی کے مقابل آ کر یہ شکوہ چھپا لیا کہ وہ جو ایک ماہ بعد لوٹا تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے سارا وقت اپنے آفس میں یا پھر ادھر ادھر کیوں گزارتا ہے، اس نے آج وال کلاک کی جانب کچھ اشارہ نہیں کیا وہ جانتی تھی کہ زرش بی کا دل، ثمن کا چہرہ اور وال کلاک، تینوں قسام کی دیوان ہاؤس میں موجودگی کا راز اگل رہے تھے۔ آج نہ وہ اس بات پر چیخی کہ میں اگر ان گنت پابندیوں کے ساتھ کسی قیدی کی طرح زندگی گزار رہی ہوں تو اس کی وجہ کو دیوان ہاؤس سے فارغ کر دیں۔ آج وہ زرش بی کے سامنے کھڑی بالکل خاموش تھی۔ لیکن وہ بات کر رہی تھی۔ کہ ثمن کو تکتے ہوئے زرش بی کے چہرے نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ اور وہ کہیں گہرائی تک ٹھٹھکیں۔

آج پہلی بار ان کی چھٹی حس نے ایک انوکھا انکشاف کیا کہ شکوے شکایت ہمیشہ سنائے ہی نہیں جاتے کچھ شکوے دکھائے بھی جاتے ہیں۔ انہوں نے سٹنگ ایریا کی اس دیوار پر ایک چور قسم کی نگاہ ڈالی جہاں قسام نے صبح آفس جانے سے قبل ایک تصویر آویزاں کی تھی جو اس جگمگ کرتے ماحول سے اوجھل تھی۔ اگر دیوار نے راز کو رکھ لیا تھا تو ثمن کو دیوار پر آراستہ اس تصویر سے یقیناً کسی ملازمہ نے آگاہ کیا تھا وہ بھانجی کی خاموشی میں چیختے شکوے کو سمجھتے ہوئے پھیکا سا مسکرائیں پھر ذرا سا آگے ہوئیں انہوں نے سامنے کھڑی ثمن کو کلائی سے پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا۔ ہمیشہ پرسکون دکھنے والی اس عورت نے چند گہرے سانس لیے وہ اسے کیا سمجھاتیں، کچھ حقیقتیں روز روشن کی طرح ہم پر عیاں ہوتی ہیں ہم ان پر کسی بھی تدبیر سے پردہ نہیں ڈال سکتے، انہیں کسی بھی ہیر پھیر سے اندھیرے کے سپرد نہیں کر سکتے کہ وہ اندھیروں میں بھی چمکتی ہیں۔

فاخرہ ان خالہ بھانجی کی مستقل خاموشی سے گھبراہٹ کا شکار ہوئی۔ زرش بی کی خاموشی نے ایسا کیا بتایا تھا کہ اس کی لاڈلی بیٹی کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

Khawateen Digest August 2021

☆☆☆

اس پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی قسام کا رنگ اڑا..... اس کی آنکھیں پتھر ہوئی تھیں یا اس کا دماغ، وہ سمجھ نہیں پایا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ حیرت اور ڈوبتے دل کے ساتھ۔

اس کو رعنا بھابھی کی طرح یقین نہیں آیا کہ ابھی اس نے جس لڑکی کو دیکھا ہے وہ ورشہ ہی ہے؟ یقین نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آج کئی ماہ بعد ورشہ نے رسمی علیک سلیک کے علاوہ نہ صرف اس کا حال پوچھا۔ بلکہ ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ یقین نہ کرنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

رعنا بھابھی خوش قسمت تھیں کہ وہ اس پر اپنا غصہ نکال سکتی تھیں۔ چند منٹوں بعد جب وہ چائے کے دو کپ لیے اس تھری سیٹر صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھی تو اسی صوفے کے پہلے سرے پر وہ ہنوز اسی کیفیت میں تھا ورشہ کو پہلے کی شاموں اور آج کی شام میں ایک واضح فرق محسوس ہوا۔ اگرچہ گھر میں وہی مخصوص ماحول تھا۔

دادی چپ چاپ تسبیحات میں مشغول تھیں رعنا ورشہ کا غصہ کچن کی ہر چیز پر نکالتی تھیں اور آج بھی وہی حال تھا۔ تو فرق کیوں تھا۔ وہ جھنجھلائی اور اس نے خاموشی سے چائے پیتے قسام کو چور نگاہوں سے دیکھا۔ وہ آج ڈیڑھ ماہ بعد ملے تھے۔ اس کے کلون کی مہک اس کا وجود چھوڑ کے ورشہ کے ساتھ لپٹ جاتی تھی۔

آج وہ اتنا خاموش اور سپاٹ تھا کہ کلون کی مہک کو سینت کے بیٹھا تھا۔

''اس بار شکارگاہ پر کچھ زیادہ ہی وقت لگا آئے ہو۔''

بھابھی حق میزبانی نبھاتے ہوئے کچھ وقت کو کچن کے دروازے پر نمودار ہوئیں وہ چولہے پر ہنڈیا بھون رہی تھیں۔

''زیادہ عرصہ کہاں بھابھی! بس ایک ماہ چار دن۔'' ورشہ کی آواز دھیمی ہوئی۔

وہ یہ بات کر کے اس پر کیا جتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کی عدم موجودگی کا حساب رکھتی ہے وہ اس بات پر بھی بے تاثر رہا۔

ورشہ کو دنیا میں سب سے زیادہ ہتک آمیز جو چیز لگتی تھی وہ اس شخص کی خاموشی تھی۔ سو اس نے بھی ایک دم اٹمڈتی بے قراری کو بہت احتیاط سے سمیٹا اور اسے دیکھا جو اس وقت لاتعلقی کی حد پر کھڑا تھا۔

''آپ بھی حد کرتی ہیں بھابھی! اب ایک پولیشن اپنے آبائی حلقے میں جا کر جوڑ توڑ رائے کرتا ہے تو وقت گزرنے کا پتا کہاں چلتا ہے۔''

وہ ہنسی اور پھر اس کی طرف چہرہ گھمایا وہ اس سے کچھ کہنے والی تھی جس نے اس کا طنز بہروں کی طرح سنا تھا۔

''وقت گزرنے کا تو تمہیں بھی پتا نہیں چلتا جو صبح آٹھ بجے کی نکلی شام کے چھ بجے آئی ہو۔'' یا تو بھابھی کی برداشت اب قسام کی موجودگی فراموش کر چکی تھی یا پھر انہوں نے یہ ذکر قسام کو ورشہ کی روٹین بتانے کے لیے دانستہ چھیڑا تھا، جو بھی تھا لیکن بھابھی کی اس بات پر اس سپاٹ چہرے پر مسکراہٹ رینگی جس نے پرسکون بیٹھی ورشہ کو ہلکا سا لڑ بڑایا۔ وہ بے خبر تھی کہ چند منٹوں بعد اس پر کون سا پہاڑ گرنے والا ہے۔

''توبہ ہے بھابھی! آپ بھی کہاں کا غصہ کہاں نکالتی ہیں۔''

اس نے ٹانگ پر ٹانگ جماتے ہوئے ٹخنوں سے اوپر اٹھے کیپری کو سیٹ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں شانوں کو چھوتے بالوں کو نزاکت سے سمیٹتے ہوئے ایک کندھے پر منتقل کیا۔ جانتی تھی کہ وہ چاہے کہیں بھی متوجہ تھا وہ اس کی ایک ایک ادا دیکھ رہا تھا۔

''پہلے میں عیشا کے گھر گئی تھی وہاں سے ہم شاپنگ مال گئے..... پھر ٹیلر کے پاس۔ اس کے بعد کا سارا وقت پارلر میں گزارا۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بات کرتے ہوئے اب پہلے سے کئی گنا مطمئن تھی۔ وہ اسے دیکھے بنا بھی جج کر سکتا تھا کہ وہ اس

نے حلیہ کے ساتھ بہت شارپ اور اسمارٹ بننے کی کوشش کررہی تھی۔

قسام نے سامنے ٹیبل سے سیل فون اٹھا کے ایک مختصر سا ٹیکسٹ لکھ کر اس نمبر پر بھیجا جس کے گرد سرخ بریکٹ تھی۔ اگلے لمحے ورشہ کے سیل فون کی اسکرین پر جو نمبر بلنک ہوا تو وہ چونکی، وہ اسے چونکتا دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آر یو شیور کہ تم نو بجے یشا کے گھر پر تھیں۔''

یہ ٹیکسٹ پڑھ کے اس کے چودہ طبق روشن ہوئے اس نے بھسم ہوتے اطمینان کے ساتھ اسے دروازہ عبور کرتے دیکھا اور اسی لمحے قسام کے پلٹ کے دیکھنے پر اس کی ساری اسمارٹنس ہوا ہوئی، وہ پلکیں نہیں جھپکا سکی۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ اس کے ٹیکسٹ کا جواب نہ آتا وہ مبہم سا مسکرایا۔

''تم میری جاسوسی کررہے ہو شیم آن یو۔''

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے ایک اور ٹیکسٹ بھیجا۔

اپنے کمرے میں زمین ناپتی ورشہ نے اللہ حافظ پر مشتمل وہ میسج کھولتے دماغ کے ساتھ پڑھا اب وہ اسے کال کررہی تھی مگر اس کی کال دوسری بیل پر کاٹ دی گئی۔

''کسی کا چین وسکون غارت کرنے کا صرف تمہیں حق نہیں ورشہ تیمور!'' وہ اس کی دوسری کال انگیج کرتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے کی طرف جارہا تھا جہاں اسے اکبر سے کچھ خاص معلومات درکار تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اسے محض زچ کررہی ہے۔ پریشان کررہی ہے لیکن یہ قسام مالک کی بھول تھی وہ لڑکی اس کے ساتھ بہت برا کرنے والی تھی۔

☆☆☆

''سر ٹھیک کہہ رہے تھے، ان دونوں کو کچھ پروا نہیں ــــ فائنل ٹرم کی ڈیٹ شیٹ آچکی ہے مگر ان کی مدر کو تو پروا ہونی چاہیے نا۔''

ورشہ نے ٹیبل پر سے پیزا اٹھا کر اسے بیگ میں سیٹ کیا۔

مجھے یقین ہوگیا تھا کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔'' وہ آف موڈ کے ساتھ بولا۔

''میں تم سے کیوں ناراض ہوں گی۔'' بیگ سے ڈرائنگ بک نکالتے ہوئے نرمی سے گویا ہوئی۔

''کیونکہ میں تمہیں وہ بات سمجھا نہیں سکا تھا مگر یقین کرو کہ پچھلے دو دنوں سے میں اسی بات کا مطلب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھا۔''

اس نے دیکھا وہ ڈرائنگ بک کے ایک مڑے تڑے صفحے کو نہایت احتیاط سے سیدھا کررہی تھی۔ ثمن اور ولید ٹیوشن ٹیوٹر کے اٹھتے ہی بیگ اسی ٹیبل پر پھینک کر بھاگ جاتے تھے لیکن ورشہ بڑے پورشن کے ایک لان کارنر میں سیٹ شدہ جہازی سائز چھتری کے نیچے ایک دو گھنٹے تو ضرور ہی گزارتی تھی۔

''اگر میں زرش بی کی افطار پارٹی میں نہیں آئی تھی تو اس کی وجہ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔''

اس نے ڈرائنگ بک کے بالکل صاف صفحے پر چند ٹیڑھی لکیریں کھینچیں۔

''تمہارا جھگڑا، ثمن اور فاخرہ آنٹی سے ہوا تھا، مجھ سے یا میری فیملی سے نہیں ہوا تھا کہ تم ممی کے بار بار بلانے پر بھی ہماری طرف نہیں آئیں اور دوسرے ہی دن تم ثمن کے ایک بلاوے پر اپنی انسلٹ بھول کے وہاں پہنچ جاتی ہو تو میں اس سب کو کیا سمجھوں۔''

اس کے انداز میں اتنا غصہ تھا کہ وہ حیران ہوگئی وہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے اس سے حل کرواتی تھی اس لیے اس کی پروا بھی کرتی تھی۔

''دو روز پہلے آنٹی نے جو کچھ بھی کہا، تم جانتے ہو۔ میں کچھ نہیں سمجھی تھی۔ بٹ آئی تھنک وہ انسلٹنگ سینٹنس تھے لیکن کل اردو کے پیریڈ میں اپنی کلاس فیلو سے ان جملوں کا مطلب جان کر میں حیران رہ گئی کہ وہ میری فیملی کے لیے انسلٹنگ نہیں بلکہ اونر تھے تو میں نے اسی وقت آنٹی کو معاف کردیا۔''

وہ کچھ اترا کے اور مسکرا کے بولی اس نے بک کا زاویہ بدلا اب چھوٹے بڑے پہاڑوں سے بھرا

پینسل اسکیچ قسام کے سامنے تھا جو اس کی بات پر حیران بیٹھا تھا۔ اگلے ایک منٹ تک وہ اس جملے میں اس اونر کو ڈھونڈتا رہا جس کی وجہ سے وہ اترائی تھی۔

"(ان بھگوڑوں سے ہم جان چھڑا چکے ہوتے) اس نے اس جملے کو سوچنے سمجھنے اور سرچ کرنے میں کئی گھنٹے ضائع کیے تھے۔ وہ انہماک سے ڈرائنگ کرتی ورشہ کو دیکھتا رہ گیا۔

نفرت، ہتک اور بے عزتی سے بھرے اس جملے کو اس کی کلاس فیلو نے آخر کن معنی میں اونر کا درجہ دیا تھا جبکہ قسام کی ریسرچ کچھ اور بتا رہی تھی۔

اس وقت وہ اپنی ڈرائنگ کے سوا کہیں متوجہ نہیں تھی جہاں صرف ہرا اور براؤن رنگ بھرنے سے ان آڑی ترچھی لائنوں نے پہاڑیوں اور درختوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

"تمہاری کلاس مونیٹر نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" اب قسام کے تجسس کا گراف بہت اوپر جا چکا تھا وہ کرسی کو آگے گھسیٹ کر ٹیبل پر ہاتھ لٹکائے بے صبری کے ساتھ جواب طلب کر رہا تھا۔

"اس نے کہا تھا کہ نصف صدی قبل ان بہادر لوگوں کو بھگوڑے کہا جاتا تھا جو ڈاکوؤں اور لیٹروں کے گھوڑے چرا کر کہیں غاروں میں یا پھر طاقت ور لوگوں کے ہاں پناہ لیتے تھے۔"

وہ قسام کو یہ سب بتانے کے بعد ایک بار پھر اترائی۔ اور یہ سب سننے کے بعد قسام کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جب وہ سکتے کی کیفیت سے باہر آیا تو ہنسا..... پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

ورشہ کو اس کا ہنسنا برا لگا..... اب وہ چھوٹی موٹی پہاڑیوں کے بیچ میں سے ایک راستہ نکال رہی تھی۔

"او..... مائی گاڈ..... آر یو فلی اسٹوپڈ۔" اب وہ قہقہے پر قہقہہ لگا رہا تھا۔ وہ جو خفا ہو رہی تھی ایک دم ٹھٹھکی۔ قسام کبھی اس طرح نہیں ہنستا تھا۔ وہ اسے کبھی یوں شرمندہ نہیں کرتا تھا۔ کوئی تو گڑبڑ تھی۔ اس کا چہرہ اترا۔

"تو کیا اس نے۔" وہ جملہ مکمل بھی نہیں کر سکی۔

"ہاں اس نے صرف بکواس کی ہے۔" وہ ہنسی پہ کنٹرول کرتے بولا۔

وہ سر دائیں بائیں جھٹکتا ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

"یعنی تم ایک سات آٹھ سال کی بچی کی طرح اس کہانی پر یقین کر چکی ہو کہ ہمایوں دادا نے لیٹروں کے گھوڑے چرانے کے بعد دیوان ہاؤس کا رخ کیا تھا۔"

وہ جھنجھلا کے بولا تو اس کی جھنجھلاہٹ میں غصہ نہیں تاسف تھا۔ وہ اس پر اعتبار کرتی تھی کیونکہ وہ اسے جھوٹ میں سے سچ الگ کر کے دکھاتا تھا۔ آج بھی وہ اس تیرہ سال کی لڑکی کو اپنی عقل استعمال کرنے پر اکسا رہا تھا۔

"فرض کرو، اگر ہمایوں داداد ڈاکوؤں کے گھوڑے چرا بھی لیتے تو وہ دیوان ہاؤس آنے کے بجائے شکارگاہ کا رخ کرتے۔"

وہ جانتا تھا کہ وہ اس سچ پر ہرٹ ہوگی اور وہ ہرٹ ہوئی اس کا کھلا کھلا چہرہ اچانک بجھا اگر وہ اس کی باتوں پر یقین رکھتی تھی تو وہ بھی اس کے چہرے پہ وقتی آسودگی کو برقرار رکھنے کی خاطر اسے جھوٹ موٹ کے کوہ قاف میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔

"آنٹی جو بھی کہیں لیکن پوری دنیا جانتی ہے کہ تمہارے دادا نے اپنا آبائی علاقہ ایک قتل کیس کے بعد ان دشمنوں کی وجہ سے چھوڑا تھا۔"

صرف یہ بات تھی جو وہ نگاہ چرا کے کرتا تھا اگر وہ اس بات میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتا تھا وہ تب بھی یقین کر لیتی تھی۔

"اور بھگوڑے ان کو کہتے ہیں جو اپنے یا کسی دوسرے کے گھر سے کوئی قیمتی چیز چرا کر بھاگ جاتے ہیں اور تا عمر بھاگتے ہی رہتے ہیں جبکہ ہمایوں دادا کا سفر دیوان ہاؤس سے آگے گیا ہی نہیں۔"

اس نے ورشہ کو دو دن بعد ہی اس کوہ قاف سے نکال لیا تھا جس کے زعم میں وہ اپنی بے عزتی بھول بھال کر فاخرہ آنٹی کو معاف کر چکی تھی۔ "اور آنٹی نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا کہ میں کمزور لوگوں کی

کرتی ان کے رعب میں آچکی ہوں۔ وہ سر گردن میں گھسیڑے ہوئے تھی۔ وہ قسام کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکی، اب وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ صفحے پر پھیلے منظر میں اس رستے کو دیکھ رہی تھی جہاں ایک بہادر انسان کو کئی گھوڑوں کے ساتھ نکلنا تھا۔

وہ سارا منظر جیسے گم ہوا۔ آنٹی جو بھی کہتی تھیں اور دنیا جو بھی سمجھتی تھی۔ وہ اس رونے کو بھول کر صفحے پر بکھرے منظر میں وہ راستہ تلاش کر رہی تھی جہاں اسے اپنی انا اور خودداری کو پھر سے بحال کرنا تھا۔

☆☆☆

بنگلے کے عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے ورثہ کی حواس باختگی اور بے قراری قسام کے سیل فون کی بجتی گھنٹی میں جیسے اس کے ساتھ ساتھ تھی وہ اسے کال پر لینے کے بجائے اس کی کال ڈسکنیکٹ کر رہا تھا۔ لیکن اکبر سے بات کرنے کے بعد اس کے انداز میں جھلکتی لاپرواہی لمحوں میں بھسم ہوئی اس نے ٹیکسٹ ٹون دیتے اپنے سیل پر ایک اضطراب بھری نگاہ ڈالی۔

یہ لڑکی اپنے ساتھ کیا کرنے والی تھی اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ رات بہت روشن تھی اگر وہ نظر اٹھا کر دیکھتا تو اس لان کے پھولوں کو چھوتی تر و تازہ چمکتی ہوا اسے مسحور کر دیتی لیکن وہ سر جھکائے چھوٹے قدموں سے چلتا۔ ٹیکسٹ پڑھنے میں الجھا ہوا تھا جن میں صرف بات کرنے پر اصرار تھا۔

''ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں ہر نیا دن ہمیں حالات انسانوں کے نئے رخ سے آشنا کرتا ہے۔''

اسے اپنے بابا کی یہ بات آج کل زیادہ ہی یاد آرہی تھی اس کا باپ اس کا کرش تھا، وہ اپنے باپ کے لائف اسٹائل کو آئیڈیالائز کرتا تھا لیکن وہ اپنے بابا کی طرح مضبوط اعصاب کا مالک نہیں تھا شاید.....

وہ اپنے پورشن میں آنے تک فون آف کر چکا تھا وہ سٹنگ ایریا میں آتے ہی بے ساختہ یا دانستہ اس فوٹو کی طرف آیا جسے چند ماہ پہلے ان لارج کروانے کے بعد اس نے نہیں رکھ دیا تھا۔ اسے یہ فوٹو اسی دیوار پر لگانا تھا مگر وہ ایک خاص موسم کا منظر تھا وہ تصویر اسے ہپناٹائز کرتی تھی یا وہ اس کا اسیر تھا۔ وہ کبھی سمجھ نہیں پایا۔

آج صبح اسے یہاں آراستہ کرنے کے بعد وہ یونہی ساکن پلکوں کے ساتھ دیکھتا رہا تھا ابھی رات کے نو بجے بھی اسے یونہی لگ رہا تھا جیسے ماہ اپریل کی ایک چمکیلی دوپہر اس فوٹو سے نکل کر اس کے ساتھ کھڑی تھی جہاں اس کے بابا ایک چمکتی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ممی کو دیکھ رہے تھے۔ ممی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے قسام کو دیکھ رہی تھیں۔ اور قسام۔

اس نے اس چمکتی دوپہر کی ایک ایک چیز اور ایک ایک ادا کو اپنی سانسوں میں بھرتے ہوئے ڈائننگ ایریا کی طرف دیکھا جہاں ممی ڈنر ٹیبل لگواتے ہوئے قسام کو اسی طرح دیکھ رہی تھیں۔ ہلکی سی بے چینی اور حیرانگی کے ساتھ اس کے دل پر ایک بوجھ سا گرا۔

وہ مزید الجھا کہ ممی کے ساتھ ڈنر لیتے ہوئے وہ ان کی ہر بات کے جواب میں بس ہوں ہاں کرتا رہا۔

بالآخر ان کے ٹوکنے پر وہ تھکاوٹ کا بہانا کرتے ہوئے ڈنر ختم ہوتے ہی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ اس تصویر کو اس وجہ سے منظر عام پر لے آیا تھا کہ اس کے بابا کی وہ فیصلہ کن مسکراہٹ قسام کی جیت اس کی ہمت اور سب کچھ تھی پھر وہ کس بات سے ڈر رہا تھا اس نے اپنے حواس سیٹ کرنے کے لیے چند گہرے سانس لیے، موبائل کو بیڈ پر اچھالا۔ فی الحال اسے ایک بھرپور شاور لینا تھا اس کے بعد ایک کیس کو اسٹڈی کرنا تھا۔ کم از کم وہ فون آن ہونے تک پرسکون رہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''مجھے تم سے بات کرنا ہے۔'' اس کے فون آن کرتے ہی وائس میسج آیا۔

''یہ آسیب ایک بجے تک بیدار ہے۔'' وہ جیسے کراہا۔

بھی پھیر۔ جواب بھی وائس میسج میں دیا گیا۔
"مجھے اس طرح بات نہیں کرنی۔" لہجہ ایسا تھا کہ اس کو چبانا چاہتی ہو۔
"اگر روبرو بیٹھ کے بات کرنی ہے تو بڑے پورشن میں آسکتی ہو۔" وہ اس وقت ڈسٹرب بھی تھا اور اس سے خفا بھی، ورنہ اس کے پاس بہت خوب صورت جواب تھے۔
"مجھے وہاں آنے جانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔" کیا اکڑ تھی وہ لب بھینچ کے رہ گیا۔
وہ آج دوسری بار جس لڑکی کے فلیٹ پر گئی تھی۔ اس کی شہرت جیسی بھی تھی سو تھی لیکن سوچ طلب مسئلہ یہ تھا کہ ورثہ اس سے کیوں مل رہی تھی۔
"تو ٹھیک ہے پھر میں آجاتا ہوں۔" وہ چت لیٹتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوا۔
وہ اب بھی وائس میل پر تھے۔
"ہرگز نہیں۔ بھابھی کی موجودگی میں بات نہیں ہوسکتی۔" وہ جیسے چیخ کے بولی۔
وہ حد درجہ جھنجلایا اور فون چبھتی نظروں سے دیکھا، اب کال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
"سوچ لو ہم باہر کہیں بھی ملیں گے تو لوگ اسے ڈیٹ سمجھیں گے۔" وہ عرصے بعد اس ٹون میں بولا تھا دوسری جانب اس کے چہرے ـــ کا رنگ بدلا نہ دھڑکنوں نے لے بدلی بس سماعتوں پر اثر پڑا اور وہ خوش رنگ ہوئیں۔ چلو کفر تو ٹوٹا کہ اس شخص کی طویل خاموشی اس کی سماعتوں کو صحرا کردیتی تھی۔
"مجھے سچ بتانا کہ ایک عام شہری کی جاسوسی کرنا چیپ حرکت ہے یا نہیں؟" وہ مطلب کی بات پر آئی۔ وہ ایک دم سیدھا ہوا۔
"مجھے بھی سچ بتانا۔ ایک عام شہری کو پریشان کرنا کیا چیپ حرکت نہیں۔"
"یہ مقابلہ بازی نہیں قسام! اپنا ذاتی گھر ہر انسان کا خواب ہوتا ہے۔"
"کیا تم اپنے لیے فلیٹ دیکھ رہی ہو۔"
وہ کسی تمہید میں پڑے بنا نرمی سے بولا۔
تم اس لڑکی سے کیوں مل رہی ہو۔ یہ سوال اسے بھڑکا سکتا تھا۔
"اگر میں کہوں ہاں!" وہ دل میں خوش ہوئی کہ وہ غلط سمت میں سوچ رہا تھا جبکہ اصل معاملے کی بھنک بھی قسام کو پاگل کرسکتی تھی۔
"جب تم جانتی ہو کہ تمہاری منزل دیوان ہاؤس ہی ہے تو اپنا وقت اور پیسہ کیوں ضائع کررہی ہو۔" بولنے والے کا لہجہ اس قدر دوٹوک تھا کہ ورثہ کا دماغ چکرایا اور چہرہ فق پڑ گیا۔
اس نے بات کو ایسے رخ پر ڈالا تھا ورثہ کو جس جواب کی توقع نہیں تھی۔
"میں تمہاری پابند نہیں ہوں، اپنی مرضی کی مالک ہوں۔" اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے بے ترتیب تنفس پر قابو پانے کی کوشش کی۔
"اور دوسری بات۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "تم فٹافٹ اپنا حلیہ اور ساتھ ہی اپنا ڈیزائنر چینج کرو ورنہ صبح گارڈ بابا تمہارے لیے گیٹ ہی نہیں کھولے گا تو تم باہر کیسے جاسکو گی۔"
وہ اس قدر سکون سے گویا ہوا کہ وہ اس کی پہلی بات کا صدمہ بھلا کر اس دوسری بات پر خون خوار ہوئی۔
"قسام! تم دیکھنا کہ....." غصہ اس قدر حاوی تھا کہ بات ادھوری رہ گئی۔
"تم درد دل ہو بس ٹھیک ہے کافی ہے۔ اب درد سر بننے کی کوشش مت کرو یار۔"
اس نے چند گھڑیاں دوسری طرف چھائے سکوت کو محسوس کیا پھر فون بند کردیا۔
ورثہ کو تپ چڑھی اور انتہا کی چڑھی۔ وہ اس رنگ چھڑکتی بات کو اگر پکڑ پاتی۔ تو کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ جو اس کی مرضی کے خلاف اس کا کمرہ رنگ برنگا کررہی تھی۔

☆☆☆

جانے کیا وجہ تھی کہ ورثہ کا سارا غصہ اس کمرے کے دروازے تک آتے آتے جیسے ہوا ہوجاتا تھا۔

بس کے شکوے رہ جاتے اور اکثر تو وہ شکوے کئے بھی بنا اظہار کے دم توڑ دیتے، تو اس کی وجہ اس کے بابا تھے۔ اچھی یادداشت کی بنا پر اسے سب کچھ یاد تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ اس کی دادی سے اس کا باپ بہت محبت کرتا تھا اور دادی کو کسی سے محبت نہیں تھی۔ وہ صرف ان باپ بیٹی کا خیال رکھتی تھیں۔ ورشہ کے ذہن میں یہ احساس اس کی عمر کے ساتھ ہی پروان چڑھا تھا۔

ان کے جذبات اتنے سپاٹ تھے کہ وہ ان کے لمس میں بھی والہانہ پن محسوس نہیں کر سکی۔ وہ اس قدر ناپ تول کر بولتی تھیں کہ وہ ان کی گفتگو میں اظہار محبت جیسے جملے تلاشتی رہ جاتی جیسے فاخرہ آنٹی ثمن کو اپنے ساتھ لپٹا کر کہتی تھیں۔

"تم تو میری جان ہو، میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔" تو شعوری عمر تک اس کا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ ان دادی پوتی کے درمیان محبت کی سیڑھی وہی شخص تھا جب اس کا باپ زندہ تھا تو دادی اجنبی چہروں سے اسے یوں متعارف کرواتیں۔

"یہ میرے تیمور کی بیٹی ہے۔" انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ میری پوتی ہے لیکن میں نے اسے ماں بن کے پالا ہے یہ میری بیٹی ہے۔ اس کے بابا کی وفات کے بعد دادی محبت کی اس سیڑھی سے چند زینے اترائی کی طرف آتیں یہ میرے تیمور کی نشانی ہے۔ اب اسی سیڑھی پر ورشہ چند زینے چڑھائی پر جاتی کہ دادی بابا کی محبت تھیں وہ غیر شعوری طور پر اپنے بابا کو کاپی کر رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ بھی اس کے کمرے کے دروازے کے بیچ ٹھہر جایا کرتے تھے تو وہ بھی ماں سے خفگی کے طور پر اور گلوں شکووں کی بات پر ٹھہرتے ہوں گے اور دادی انہیں یوں گم صم کھڑے دیکھ کر جب سر جھکا لیتی تھیں تو اس کے بابا کے شکوے بھی بنا اظہار کے دم توڑ دیتے ہوں گے۔ وہ ان کے جھکے سر کو دیکھ کر پلٹ جاتے ہوں گے۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

اور وہ اس مصنوعی بلاوے پر ورشہ ہی کی طرح اندر ہی اندر ایک اصل پکار کے منتظر رہتے ہوں گے۔

ان کے ذہن میں جو بھی تھا، وہ خود کیا سوچتے تھے مگر وہ ہر روز کہیں بھی جانے سے پہلے ورشہ کو دادی کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے جاتے تھے۔

لیکن آج پہلی بار اس دروازے کے پاس رک کر ورشہ کا غصہ کم ہوا نہ دکھ کا زور ٹوٹا۔

آج آگے بڑھنا بہت مشکل کام تھا، برسوں کی شش و پنج کے بعد اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ اس کے بابا کو دادی سے جو شکایات بھی تھیں۔ وہ ان کی خاموشی اور ان کے گول مول بیانات کی بنا پر تھیں آج اس نے گزرے ماضی کے ہر دن کو اپنی یادداشت میں تازہ کیا جس دن اس نے اپنے بابا کو آخری بار دیکھا تھا جب وہ صبح سویرے ہی دادی کے کمرے میں گئے تو وہ باپ کے پیچھے ہی تھی۔

"میں رعنا چچی کو لینے جا رہا ہوں، وہ بہت اکیلی ہیں، انہیں ہماری ضرورت ہے، وہ ہمارے ساتھ رہیں گی تو ورشہ کی وجہ سے ان کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی لیکن مالک انکل کا کہنا ہے کہ میرا یہ فیصلہ ٹھیک نہیں ہے۔

وہ یونہی بنا کسی سوال جواب کے ٹھس بیٹھی رہیں۔

"میرا یہ فیصلہ ٹھیک نہیں ہے اماں؟" انہوں نے یہ سوال ایک بار پھر دہرایا تھا۔ اگر وہ ذرا سا سر اٹھا کر خاموشی توڑ کر کہہ دیتیں کہ مالک بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں وہ ماں سے کیا سننا چاہتے تھے۔ وہ اپنی ماں کے فرماں بردار تھے پھر وہ چلے گئے۔

اس روز پہلی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے ورشہ کو دادی کا خیال رکھنے کی تاکید نہیں کی تھی انہوں نے بنا کسی بات چیت کے اسے گلے لگا کر بہت سا پیار کیا تھا۔ اس دن کے بعد ورشہ کو وہ شفیق چہرہ دوبارہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ ام میرات بنت ام کلثوم جو اس کی دادی تھیں۔ اب ان کی خاموشی سے ان کی شخصیت مجروح ہوئی تو اس نے بلا تامل یقین کر لیا کہ پانچ سال پہلے ام میرات کی خاموشی ہی اس کے بابا کی

موت کا سبب بنی تھی۔

ان کے کمرے سے پھر لاؤنج سے پھر برآمدے سے باہر بھاگتی اس نوعمر لڑکی کے سلگتے آنسو اس کے نرم چہرے کو جھلسا رہے تھے۔ کیا ہو جاتا جو دادی اس سے کہہ دیتیں۔ تمہاری کلاس فیلو نے جو سنائی تھی وہ کہانی جھوٹ پر مبنی تھی تو اس کی خودداری برقرار رہ جاتی۔ وہ اس گم ہوتی شام میں تیز قدموں کے ساتھ جانے کس سمت جا رہی تھی۔ کیا ہو جاتا اگر ام میرات اپنی خاموشی توڑ کے اپنے بیٹے سے کہہ دیتیں۔

''تمہارا فیصلہ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ تو ماں کا فرماں بردار تھا۔ وہ کہہ دیتیں تم کہیں نہیں جاؤ گے تو شاید آج اس کا باپ زندہ ہوتا اور وہ لوگ کہیں نہ کہیں اپنا گھر بنا چکے ہوتے۔ اس نے پھولی سانسوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ سر اٹھا کے اس پیڑ کو دیکھا۔ اس پورے بنگلے میں یہ پیڑ واحد چیز تھا جسے وہ اپنا سمجھتی تھی جس پر اب ایک گلی تک نہیں تھی۔ وہ پتھر، جھرنے، صحرا، پہاڑ اور خلا تک میں یہ پیڑ واحد شے تھا جو اس کی ہر ڈرائنگ میں اپنے کیسری پھولوں سمیت موجود ہوتا تھا اب اس کی شاخوں پر فاختہ کے ٹوٹے گھونسلے کے باقی ماندہ تنکے لٹک رہے تھے جو پیڑ سے پھولوں کے جھڑتے ہی شاید اڑ گئی تھی۔

اس نے آنکھیں زور سے میچیں تو رخسار بھگوتے آنسو گردن پر بہنے لگے۔

اس کا جھگڑا بے سبب تھا۔ وہ پھول حق داروں نے اتار لیے تھے کہ ام میرات اور ہمایوں خان اس بنگلے میں خالی ہاتھ آئے تھے۔

☆☆☆

وہ اپنی یادداشت کھنگال رہی تھی اور اسے یاد آ رہا تھا اس دن جب مالک انکل نے اسے گود میں اٹھا کر اسے بتایا تھا کہ تمہارا بابا اور میرا دوست اب اللہ کے پاس جا چکا ہے تو ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

اس دن گیسٹ ہاؤس میں موجود تمام چہروں

بھی اس چیز کے لیے جو میری ملکیت نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"یہ تمہاری ملکیت نہ سہی لیکن تمہیں اس سے لگاؤ ہے۔ یہ تمہارے لیے بہت خاص ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے آنکھیں جھپک کے آنسوؤں کو روکا۔

"فرق پڑتا ہے ورشہ! جو چیز دوسروں کے لیے عام سی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے لیے بہت خاص ہوتی ہے یہی تو محبت ہے۔"

وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی جو شائبہ کی حد تک مسکرایا تھا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے اب اس کا دکھ نہیں۔" اس نے پیڑ کی طرف دیکھا۔ "میں اپنے ماضی کو کھوج رہی تھی اور میں نے بہت کچھ ڈھونڈ لیا ہے۔" وہ چونکا اور ٹھٹکا ہی نہیں وہ اپنی جگہ سے جیسے ہلا تھا اسے ورشہ سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی جب وہ ڈرائنگ بک کے نیٹ پیج پر پینسل چلانا شروع کرتی تو اس کا موڈ اس کی خواہش اور دن بھر کا ذہنی سفر اس اسکیچ میں ظاہر ہو جاتا تھا۔ وہ دو دن سے ٹیوشن نہیں لے رہی تھی یعنی وہ دو دن سے اپنے ماضی میں بھٹک رہی تھی۔

"ورشہ! تم ابھی چھوٹی ہو۔ تم صرف اپنی پڑھائی پر فوکس رکھو۔ ہم برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔ تم اپنا بیگ لے کر آؤ۔ آج میں تمہیں پڑھاؤں گا۔" سترہ سال کے اس لڑکے نے کچھ بے چین سا ہو کر تیرہ سال اور چند ماہ کی اس لڑکی کو ایک سمجھ دار شخص کی طرح سمجھایا۔

"میں نے اس دن کے ایک ایک منٹ کو سوچا ہے جس دن میرے بابا رعنا بھابی کو لینے گئے تھے اور اس دن دادی نے۔" اس نے قسام کی سمجھ داری کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

"دیکھو اگر تم ہرٹ ہوئی ہو تو اپنی کلاس فیلو یا پھر اس لینڈ لیڈی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ اس میں تمہارے ماضی یا دادی کا کچھ رول نہیں اگر گریبان پر لگا ہے تو ان کا پکڑو۔"

اور حیرت کی بات تھی کہ اس نے یہ گفتگو بالکل نارمل لہجے میں کی تھی لیکن ورشہ کے لیے اس گفتگو میں جو حیرت کا باعث تھا وہ آخری جملہ تھا۔ وہ اب دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جس کی حمایت میں بول رہا تھا۔ وہ اس کو اسی ہستی کا اصل چہرہ دکھانا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے تم میری بات نہیں سننا چاہتے نہ سنو، لیکن اپنی بات پر قائم رہنا۔ ایک دن میں ان کا گریبان پکڑوں گی تو اس دن یاد رکھنا مجھے یہ مشورہ کس نے دیا۔"

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ وہ یونہی آلتی پالتی مارے اسے منظر سے غائب ہونے تک دیکھتا رہا۔ وہ اسے اپنے ساتھ مخلص مانتی تھی تو وہ بھی اس کے ساتھ مخلص رہنا چاہتا تھا یہ اس کے آگے بڑھنے کی عمر تھی اور وہ الٹے قدموں کے کھیل میں پڑ رہی تھی۔

وہ اس کے ماضی کے قصے سے ایک جملہ تک سننے کا روادار نہیں تھا اور وہ یہ قصہ اس کے سوا کسی کو بھی نہیں سنا سکتی تھی۔ وہ ماضی میں بھٹکتی رہتی تو آگے کیسے بڑھ سکتی تھی۔

☆☆☆

زرش بی تقریباً تیس منٹ سے قسام کو اپنے سامنے متحرک اور مصروف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن وہ بیٹے کا موڈ جج نہیں کر پا رہی تھیں یہ جبکہ اس کا اپنا موڈ ایسا تھا کہ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھیں انہیں کچھ دیر پہلے خبر ملی تھی کہ صبح ولید آیا تھا پھر اس نے اور قسام نے ایک ساتھ آدھا گھنٹہ تو گزارا تھا لیکن یہ میٹنگ اس وقت ہوئی جب زرش بی نہا رہی تھیں۔ ان کی یہ عادت تھی کہ وہ کمرے سے باہر آتے ہی ایک بار کچن میں ضرور جھانکتی تھیں۔ انہیں یہ خبر کچن میں موجود ملازمہ سے ملی۔ وہ اسے ناشتہ لگانے کا کہہ کر لیونگ روم میں آئیں تو خوش گوار سی حیرت میں گھریں کہ قسام یہیں تھا اس کے ہاتھ میں ایک پینٹنگ تھی، وہ اسے صبح بخیر کہتی جب اپنی نشست پر آئیں تو نگاہ

سامنے ٹیبل پر پھیلی جہاں نئی پینٹنگز سے اتارے گئے پرانے اخبارات کا بکھراؤ جیسے اس سیٹ شدہ لاؤنج کو اپ سیٹ ظاہر کررہا تھا۔

اس نے اس چوکور پینٹنگ کو دیوار پر اس جگہ سیٹ کیا جہاں سربراہی نشست عین مقابل تھی ڈارک بلو شیڈ کی اس پینٹنگ کے وہاں لگتے ہی لائٹ بلیو پینٹ سے مزین اس دیوار کی حالت ان پرانے اخبارات جیسی ہوئی۔

اب اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہاں بیٹھی زرش بی زیادہ اپ سیٹ تھیں یا وہ دیوار۔

"بی بی جی! ناشتہ لگادیا ہے۔" اس اطلاعی جملے پر وہ جیسے گہرے دھیان سے چونکا۔

"میرے لیے صرف چائے لے آؤ۔" اس مختصر آرڈر کے بعد اس نے قریبی ٹیبل سے ایک دوسری پینٹنگ اٹھائی زرش بی کا ماتھا ٹھنکا۔ ان کے بیٹے کی طبیعت خراب تھی یا پھر اس کا موڈ خراب تھا۔

"پہلے ٹیبل سے یہ پھیلاوا سمیٹو پھر گرم ناشتہ بھی یہیں لے کر آؤ۔" ملازمہ کو حکم دینے کے بعد انہوں نے قسام سے اس کی طبیعت کا پوچھا جس نے فوری طور پر رخ بدلتے ہوئے بالکل فریش مسکراہٹ کے ساتھ ماں کو تسلی بخش جواب دیا تو انہوں نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے دیکھتی رہیں جب تک وہ ان کے ساتھ بیٹھ نہیں گیا۔

"رات کو تم نے ڈنر بھی برائے نام کیا تھا اور اب بھی چائے۔"

"اس وقت صرف چائے کی طلب ہورہی ہے۔" وہ مسکرا کے بولا۔

اب اس کی توجہ ماں کے سیاہ کرتے سے ابھی، جس پر گرے کلر کے ریشم سے ہلکی بیل کڑھی ہوئی تھی۔ ایک وقت تھا جب ورثہ بھی ایسی ہی نائس ڈریسنگ کرتی تھی وہ بے ساختہ ڈسٹرب ہوا۔ کچھ دیر [illegible] نے اسے کچھ بات کی جس کا جواب ساختہ ہنس دیں۔

"اوہ..... خدایا..... تمہارا دماغ آج کل کہاں اڑتا پھر رہا ہے۔" وہ ماں کی بات اور ان کی ہنسی پر خفت کا شکار ہوا کہ ممی اتنا زیادہ کب ہنستی تھیں۔

"میں نے رات کو تم سے پوچھا کہ خان بابا کے بیٹے کی شادی کا کیا بنا؟ تم نے کہا زخمی ہوگیا تھا سو اسے کراچی بھیج دیا ہے۔ اب میں نے پوچھا کہ تمہارے ہرن کا کیا حال ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس کی ڈیٹ فکس ہوچکی ہے۔"

"اوہ..... گاڈ!" وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ جیسے ہنستا ہی چلا گیا۔

"مجھے لگا آپ نے رات والا سوال دہرایا ہے۔" وہ ہنسی سمیٹتا چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اپنی غائب دماغی پر متعجب تھا۔

وہ اس کی غائب دماغی پر متعجب نہیں بلکہ پریشان تھیں۔ "پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔" وہ ممی کی بات پر چونکا پھر سنبھل سا گیا۔

"پریشان تو نہیں ہوں شکارگاہ پر بہت بزی رہا تو شاید تھک گیا ہوں۔" اس نے ٹی پاٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "کیا ولید اور تمہارے درمیان کوئی مسئلہ چل رہا ہے۔"

پہلے وہ شوہر کے ساتھ اور اب بیٹے کے ساتھ بھی یونہی بنا تمہید کے بات کرتی تھیں۔ وہ اسے پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے خدشہ ہو وہ اس موضوع پر بحث کرے گا یا پھر اسے ٹال دے گا وہ ایک دوسرے کو اس قدر سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل وہ کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہے تھے، وہاں اب پرانے اخبارات کا پھیلاوا بھی نہیں تھا پھر بھی سب کچھ اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ اب اندازہ لگانا مشکل تھا کہ زرش بی زیادہ اپ سیٹ تھیں وہ لیونگ روم یا پھر قسام مالک۔

☆☆☆

سامنے ٹیبل پر پھیلی جہاں نئی پینٹنگز سے اتارے گئے پرانے اخبارات کا بکھراؤ جیسے اس سیٹ شدہ لاؤنج کو اپ سیٹ ظاہر کررہا تھا۔

اس نے اس چوکور پینٹنگ کو دیوار پر اس جگہ سیٹ کیا جہاں سربراہی نشست عین مقابل تھی ڈارک بلو شیڈ کی اس پینٹنگ کے وہاں لگتے ہی لائٹ بلیو پینٹ سے مزین اس دیوار کی حالت ان پرانے اخبارات جیسی ہوئی۔

اب اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہاں بیٹھی زرش بی زیادہ اپ سیٹ تھیں یا وہ دیوار۔

"بی بی جی! ناشتہ لگادیا ہے۔" اس اطلاعی جملے پر وہ جیسے گہرے دھیان سے چونکا۔

"میرے لیے صرف چائے لے آؤ۔" اس مختصر آرڈر کے بعد اس نے قریبی ٹیبل سے ایک دوسری پینٹنگ اٹھائی زرش بی کا ماتھا ٹھنکا۔ ان کے بیٹے کی طبیعت خراب تھی یا پھر اس کا موڈ خراب تھا۔

"پہلے ٹیبل سے یہ پھیلاوا سمیٹو پھر گرم ناشتہ بھی یہیں لے کر آؤ۔" ملازمہ کو حکم دینے کے بعد انہوں نے قسام سے اس کی طبیعت کا پوچھا جس نے فوری طور پر رخ بدلتے ہوئے بالکل فریش مسکراہٹ کے ساتھ ماں کو تسلی بخش جواب دیا تو انہوں نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے دیکھتی رہیں جب تک وہ ان کے ساتھ بیٹھ نہیں گیا۔

"رات کو تم نے ڈنر بھی برائے نام کیا تھا اور اب بھی چائے۔"

"اس وقت صرف چائے کی طلب ہورہی ہے۔" وہ مسکرا کے بولا۔

اب اس کی توجہ ماں کے سیاہ کرتے سے ابھی، جس پر گرے کلر کے ریشم سے ہلکی بیل کڑھی ہوئی تھی۔ ایک وقت تھا جب ورشہ بھی ایسی ہی نائس ڈریسنگ کرتی تھی وہ بے ساختہ ڈسٹرب ہوا۔ کچھ دیر بعد زرش بی نے اس سے کچھ بات کی جس کا جواب اس نے فوری اور ریلیکس موڈ میں دیا۔ تو چند لمحے اسے شدید حیرت سے گھورنے کے بعد وہ ایک دم بے ساختہ ہنس دیں۔

"اوہ..... خدایا..... تمہارا دماغ آج کل کہاں اڑتا پھر رہا ہے۔" وہ ماں کی بات اور ان کی ہنسی پر خفت کا شکار ہوا کہ ممی اتنا زیادہ کب ہنستی تھیں۔

"میں نے رات کو تم سے پوچھا کہ خان بابا کے بیٹے کی شادی کا کیا بنا؟ تم نے کہا زخمی ہوگیا تھا سو اسے کراچی بھیج دیا ہے۔ اب میں نے پوچھا کہ تمہارے ہرن کا کیا حال ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس کی ڈیٹ فکس ہوچکی ہے۔"

"اوہ..... گاڈ!" وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ جیسے ہنستا ہی چلا گیا۔

"مجھے لگا آپ نے رات والا سوال دہرایا ہے۔" وہ ہنسی سمیٹتا چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اپنی غائب دماغی پر متعجب تھا۔

وہ اس کی غائب دماغی پر متعجب نہیں بلکہ پریشان تھیں "پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔" وہ ممی کی بات پر چونکا پھر سنبھل سا گیا۔

"پریشان تو نہیں ہوں شکارگاہ پر بہت بزی رہا تو شاید تھک گیا ہوں۔" اس نے ٹی پاٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "کیا ولید اور تمہارے درمیان کوئی مسئلہ چل رہا ہے۔"

پہلے وہ شوہر کے ساتھ اور اب بیٹے کے ساتھ بھی یونہی بنا تمہید کے بات کرتی تھیں۔ وہ اسے پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے خدشہ ہو وہ اس موضوع پر بحث کرے گا یا پھر اسے ٹال دے گا وہ ایک دوسرے کو اس قدر سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل وہ کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہے تھے، وہاں اب پرانے اخبارات کا پھیلاوا بھی نہیں تھا پھر بھی سب کچھ اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ اب اندازہ لگانا مشکل تھا کہ زرش بی زیادہ اپ سیٹ تھیں وہ لیونگ روم یا پھر قسام مالک۔

☆☆☆

ان کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ وہ نا صرف صبح، صبح جاگ گئی تھی بلکہ ایسی نک سک سے تیار

ہو رہی تھی کہ اسے انھیں پھاڑ کے دیکھنا کچھ غلط نہیں تھا۔ جو تیار ہو رہی تھی خود اس کے لیے بھی ناقابل یقین تھا کہ وہ ایک انجان شخص کے لیے اس طرح تیار ہو سکتی ہے مگر وہ ہو رہی تھی۔

وہ کیوں تھا اور کیسا تھا اسے اس میں دلچسپی نہیں تھی، اس شہر میں دوسرے بہت سے نامور اور باحیثیت وکیل تھے سو یہ چیز بھی غیر اہم تھی۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ایڈوکیٹ ایاز، بشارت قسام مالک کے لیے ناقابل برداشت تھا تب ہی ورثہ کے لیے اہمیت کا حامل تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک مناسب سائز کا آئینہ تھا وہ کمرے کی چاروں لائٹس آن کیے اپنے چہرے کو ہر اینگل سے دیکھ رہی تھی۔

"اتنی صبح کہاں کی تیاری ہے۔" رعنا بھابھی نے اس کی جگمگ کو چبھتی نظروں سے دیکھا۔

"صبح کہاں؟ گیارہ بج رہے ہیں۔" آئینہ اسے ہر اینگل سے دلکش ظاہر کر رہا تھا۔

"دیکھیں تو میں اچھی خاصی خوب صورت ہوں۔" اس نے جانے کس رنگ کی لپ اسٹک کو بھرے بھرے ہونٹوں پر نئے سرے سے پھیلایا۔

"کبھی تم خوب صورت تھیں۔" رعنا بھابی کی خفگی اس جملے سے خاک کم ہوتی کہ ورثہ کے شانوں پر جھولتے بدرنگ بال اس کا پارہ نیچے نہیں آنے دے رہے تھے۔ اس نے رعنا کا جملہ منہ بسور کے نظر انداز کیا۔

"میرا چہرہ ہیرے کی طرح دمک رہا ہے۔" وہ اترائی۔

"یہ تازہ فیشل کی بنا پر ہے ورنہ کوئی نور نہیں برس رہا۔" وہ بیڈ شیٹ جھاڑتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"کسی کی خوشی میں خوش ہونا بھی ثواب ہے۔" کانوں میں سنہری موتیوں سے مزین بندے ڈالتے ہوئے اسے سچ مچ کا غصہ آیا۔

"اگر ثواب کے معنی پتا ہیں تو گناہ کا حساب بھی رکھو۔" وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدہ ہوئیں۔

بکل بند کرتی خفگی سے بولی۔

"کل تمہارے حلیے نے مجھے قسام کے سامنے دو کوڑی کا نہیں رہنے دیا۔" رعنا بھابھی نے جان بوجھ کے کل کا غصہ آج پھر سے جتایا۔ وہ طمانیت محسوس کر رہی تھیں کہ ورثہ کل کی نسبت آج مناسب لباس میں تھی۔

"جب حلیہ میرا خراب تھا اور مجھے فرق نہیں پڑا تو آپ اپنی قیمت کیوں گرا رہی ہیں۔" اس نے ہینگر نکالتے ہوئے وارڈروب کا پٹ زور سے بند کیا کہ اپنے کمرے سے باہر آتی دادی نے بے اختیار دہلیز کو پکڑا۔ بیٹیوں کی اس کی طرح کی لاپروائیاں ماؤں کی حیثیت گرا دیتی ہیں۔ وہ کہنا چاہتی تھیں لیکن خاموش رہیں۔ اس نے جان لیا تھا کہ ام میرات کمرے سے باہر آ چکی ہیں اور ورثہ الٹے جواب دینے میں ماہر تھی۔

ابھی کچھ دن پہلے رعنا بھابھی نے اسے گلے میں دوپٹا لینے سے جب ان الفاظ میں ٹوکا کہ اپنی دادی کو دیکھو جن کی پیشانی تک ڈھکی رہتی ہے۔"

"مجھے ان سے مت ملائیں۔ مجھے ان جیسا نہیں بننا۔ اور تم ان کی مثال بھی کیسے دے سکتی ہو، تم چاہو گی کہ ورثہ ام میرات جیسی خواہش پرست اور خود غرض ثابت ہو۔" رعنا تب بھی خاموشی سے نظر جھکا گئی تھیں۔

"آج تو میں مہذب حلیے میں ہوں آج آپ اور آپ کے امیر کو خوش ہونا چاہیے۔" وہ خراب موڈ جھٹک کے مسکرائی۔

یہ سچ تھا کہ اس پر قسام کی دھمکی اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ بات ہی نہیں کرتا تھا، عمل بھی کر سکتا تھا آج بھی اس نے دوپٹہ ہینگر سے نکالنے کے بجائے کھینچا تو رعنا ارے ارے کرتی رہ گئیں اس کی یہ عادت کئی دوپٹے پھاڑ چکی تھی۔

ام میرات نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہی ہو بس اتنا کہا کہ دوپہر تک آ جانا۔ آگے پیچھے باہر آئیں تو سنہری بندوں والی وہ لڑکی حیران نہیں ہوئی۔ ایک کمزور بوڑھے وجود کے لیے یہاں تک اکیلے آنا

آسان نہیں تھا۔ وہ اسٹف اور دیواروں کا سہارا لیتی ہوئی یہاں صرف اس کے لیے آئی تھیں۔

وہ سنہرے اور زرد لباس میں اپنے سرد تاثرات کے ساتھ سردیوں کی دوپہر لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہم شکل وجود سے نگاہ چرائی مگر اس بوڑھے وجود کی نگاہیں جیسے اپنی جوانی کو تکے جا رہی تھیں۔

وہ عمر رسیدہ عورت اپنی ہم شکل کو اپنا ہم مزاج نہیں سمجھتی تھی تو وہ غلط سمجھتی تھی کہ درشہ تیمور اُم میرات جیسی ہی خواہش پرست اور خود غرض ثابت ہو رہی تھی۔

قسام سچ کہتا تھا کہ ضد اور جذباتیت میں اس خاندان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ بیٹے کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے شک ہو، وہ اس موضوع پر بات کرے گا یا ٹال دے گا۔ لیکن وہ بات کرنا چاہتا تھا وہ ٹیبل سے اٹھ کر ترچھے رخ ہوا۔

''ولید کے خیال میں دیوان ہاؤس کی سکیورٹی سے ہمارا بجٹ کنفیوز ہو رہا ہے تو بلاضرورت اس کی سکیورٹی ہٹا دینا چاہیے۔''

اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سامنے لگی پینٹنگ میں صرف اس ستارے کو دیکھا جو چاند کے ہالے میں تھا مگر ہالے کے کنارے پر تھا۔ وہاں خاموشی چھا گئی جسے زرش بی کی آواز نے توڑا۔

''اور تم نے پھر کیا سوچا ہے۔'' وہ بھی اسی منظر کو دیکھ رہی تھیں جہاں ایک دائرے میں گہرا نیلا اور سفید رنگ آپس میں گڈمڈ ہو رہا تھا تو کہیں سے نکتوں کی صورت چمک رہا تھا۔

''جب مناسب سمجھوں گا تب ہٹا دوں گا۔''

وہ کیوں سمجھ رہا تھا کہ اس کے نظر ہٹا لینے سے وہ ستارہ ہالے سے سرک جائے گا۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے بھی اس کی نگاہ ہالے کے کنارے پر ٹکی تھی۔

اگر یہی بات اسی انداز میں ولید کو بھی بتا دیتے تو کچھ حرج نہیں تھا۔ جیسے وہ جانتی تھیں کہ اس نے ولید سے کچھ اور کہا ہوگا۔ ''تو اس سے کیا ہوتا وہ بحث کے لیے کوئی اور وجہ ڈھونڈ لیتا کیونکہ اس کے خیال میں میری سیاست اور تیمور انکل کا گھر ہمارے بزنس پر چل رہے ہیں۔'' وہ عجیب انداز میں ہنسا وہ کچھ دیر تک کچھ بول نہیں سکیں۔ ''تو کیا یہ سچ نہیں ہے؟'' تمہید باندھنا اچھی عادت ہوتی ہے اور یہ اچھی عادت ممی میں نہیں تھی۔ وہ ایک دم ٹینس ہوا۔

''ہمایوں صاحب کوئی لینڈ لارڈ نہیں تھے ان کی پراپرٹی کروڑوں میں نہیں تھی۔ بزنس میں ان کا حصہ ضرور ہے مگر وہ ماہانہ انکم اس قدر سکیورٹی افورڈ نہیں کر سکتی۔'' وہ ممی کی اس بات کو جھٹلا نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ سچ تھا اگر وہ مزید ٹینس ہوا تھا تو اس کی وجہ دیوان فیملی کا یہ حساب کتاب تھا جو مالک صاحب کی وفات کے ایک سال بعد ہی شروع ہو چکا تھا۔

''تو آپ بھی یہی چاہتی ہیں کہ میں سکیورٹی ہٹا دوں یہ تو تیمور انکل کی فیملی کو ان کے سپرد کرنے کے مترادف ہوا نا۔

وہ تحمل کے ساتھ بولا تھا لیکن آواز میں بوجھل پن نمایاں تھا۔ زرش بی پلکیں جھپکانا بھول گئیں اگر ان کو اپنی بہن اور اس کی فیملی عزیز تھی تو دوسری طرف انہیں اماں، رعنا بھابھی اور درشہ سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ شرمندہ ہوئیں۔

''حالات جیسے بھی ہوں لیکن جب ہماری روایات اور ظرف پر حرف آنے لگے تو تم نے اس وقت صرف بیٹے کا ساتھ دینا ہے۔'' وہ شوہر کی یہ نصیحت یاد کرنے کے بعد مزید شرمندہ ہوئیں۔

''وہ دشمنی والا قصہ تو چند سال پہلے ختم ہو گیا تھا تمہارے بابا نے ان کے علاقہ داروں اور وہاں کے بارسوخ لوگوں کے سامنے وہ بدلے والا معاملہ قصاص کے ساتھ نپٹا دیا تھا۔ اماں کے بھائی اور بھتیجوں کا وہ سائن شدہ معاہدہ میرے پاس محفوظ ہے۔''

وہ بے یقینی کی حالت میں تھیں۔

''ضد اور جذباتیت کسی سائن کسی معاہدے کو یاد نہیں رکھتے ممی!''

اب وہاں گہری خاموشی تھی۔ وہ کسی اور موضوع پر

بات کر سکتے تھے مثلاً اس تمام دورانیے میں وہ اس تازہ پینٹنگ کو اتنی بار دیکھ چکی تھیں کہ وہ اس سے پوچھ سکتی تھیں کہ اس سیاہ پڑتے نیلے رنگ میں جو سفید چاند نما گول دائرہ ہے اگر آرٹسٹ کی تخلیق میں یہ چاند ہے تو یہ بجھا ہوا کیوں ہے اگر چاند بجھا ہوا ہے تو ہالہ اتنا روشن کیوں ہے۔

وہ ان کو بتا سکتا تھا کہ چاند جس کا اسیر ہے وہ روشنی سمت بدل رہی ہے۔ وہ انہیں بتا سکتا تھا کہ ان شاداب آنکھوں کی بینائی خوف زدہ ہے اگر یہ روشنی ہالے سے بھی سرک جائے گی تو پھر کیا ہوگا۔

مگر ماحول کا گونگا پن جانتا تھا کہ یہاں جب بھی خاموشی ٹوٹے گی تو دوبارہ پھر اسی کا تذکرہ ہوگا جو اس داستان پر حاوی تھا۔

☆☆☆

جب وہ خولہ عباس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو اس کا ذہن و دل اپنے فیصلے پر قائم تھا مگر لمحہ بھر کو اس کی نم ہتھیلیوں پر اک چھوٹا سا جملہ رہ گیا۔

''اب بھی وقت ہے'' وہ جیسے بہری ہوئی اور بیل دینے سے قبل خود پر اک طائرانہ نگاہ ڈالی خولہ اسے انٹر کام اسکرین پر دیکھ چکی تھی کہ پہلی گھنٹی پہ ہی دروازہ کھل گیا۔

اسے احساس ہوا کہ ہتھیلی پر جو رہ گیا تھا، وہ کوئی جملہ نہیں بلکہ ٹھنڈا پسینہ تھا۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے تھیں اس نے خولہ کی آنکھوں میں اپنے لیے انتہا کی ستائش دیکھی۔

''کیسی ہو؟''

اس نے حال پوچھتے ہوئے ورشہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ جب اس کی یونیورسٹی گئی تو اس کا شمار بولڈ اور جینئس لڑکیوں میں ہوتا تھا مگر ان بہترین لڑکیوں میں نہیں ہوتا تھا جو ورشہ کے گروپ میں تھیں۔ اب ورشہ کو فارغ پھرتے اور خولہ کو جاب کرتے ایک سال ہو چکا تھا۔ پچھلے چار ماہ سے ورشہ اس سے راہ رسم بڑھا رہی تھی تو وہ جینئس لڑکی بے وقوف نہیں تھی۔

اتنا علم تو رکھتی تھی کہ وہ بہترین لڑکی اس کے پیچھے کس وجہ سے بھاگ رہی ہے وہ ایاز بشارت کی فرسٹ کزن بھی ورشہ کو یہ بات گروپ کی ایک انگلی جنس ٹائپ کی لڑکی سے پتا چلی تھی۔

سامنے لونگ روم خالی تھا مگر باتوں کی آواز باہر تک آرہی تھی جس سے ظاہر تھا کہ اندر دو آدمی تھے وہ دونوں ایک ساتھ ڈرائنگ روم تک آئیں تو دونوں آدمی انہیں دیکھ کر نا صرف خاموش ہوئے بلکہ اپنی جگہ سے کھڑے بھی ہو گئے۔

وہ اندازہ تک نہیں لگا سکتی تھی کہ ان دونوں میں سے ایاز بشارت کون تھا وہ دونوں سیم ڈریس میں تھے وہ ہلکا سا نروس ہوئی۔

''یہ ورشہ تیمور ہیں۔'' خولہ نے اس کا تعارف کروانے کے بعد دیکھا۔

''آئی ایم ایاز بشارت۔'' وہ ایک بے تکلف قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ متعارف ہوا۔ خولہ حیران ہوئی۔ ایاز نے آج پہلی بار کسی فی میل سے متعارف ہونے کے بعد ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ وہ چاروں بیٹھ چکے تھے تو اگلا مرحلہ حال احوال دریافت کرنے کا تھا۔

'ایاز کے پاس صرف چند منٹ ہیں اور یہ وقت بھی میں نے بہت مشکل سے لیا ہے۔''

خولہ نے اس کے سر پر احسان رکھا۔ ورشہ اس کی بات پر یقین نہیں کر سکتی تھی اگر وہ آفس ٹائمنگ میں اس کے لیے وقت نکال سکتا تھا تو پوری چھان پھٹک کے بعد آیا تھا کہ ورشہ تیمور کون ہے اور وہ اس کے ساتھ گھنٹوں ضائع کر سکتا تھا پھر اس نے دوسرے آدمی کو باہر جاتے دیکھا تو خولہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

اب وہ اور ایاز بشارت وہاں اکیلے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

وہ عید سے دو روز قبل اپنے باپ کی قبر پر گیا تھا اس نے آخری بار اس لڑکی کو چھ ماہ پہلے قسام اور اس کی ممی کے ساتھ قبرستان میں دیکھا تھا اس سے پہلے ایاز اسے پاکستان لاء کالج کی پارکنگ میں کئی بار دیکھ چکا تھا کبھی کبھار جب ڈرائیور قسام کو پک کرنے آتا تو اس کے ساتھ اکثر کیمیلی ہوتی تھی مگر اس وقت اور اب کی ورشہ میں

''خولہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے اگر ایسا ہے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔''

اس نے مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے بات کی، شاید اسے اندازہ تھا کہ وہ اس انداز میں کس قدر خوبرو دکھتا ہے۔

ورشہ نے ادھر ادھر دیکھا تو نگاہ اندر آتی خولہ پر پڑی جس کے ہاتھ میں ڈرنک کین تھے وہ ایاز کو دیکھ رہی تھی جس کا انداز نشست آرام دہ تھا لیکن اس کی باڈی لینگویج اس کے برعکس سائن دے رہی تھی۔

آج پہلی بار وہ خولہ کو بار بار چونکا رہا تھا ورشہ اب اپنے نروس اعصاب پر قابو پا چکی تھی وہ اس سے اپنا کیس ڈسکس کرتے ہوئے جب بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی اس کا وہ عام قسم کا کیس اس قدر عجیب نوعیت کا تھا کہ سننے والے کا چہرہ ہزار رنگ بدل چکا تھا اور اس کی حیران آنکھیں وہ چہرہ رنگ بدل بدل کے دیکھ رہی تھیں اگر اس لڑکی نے وہ سنہرے بندے اس لیے پہنے تھے کہ وہ اس پہ سوٹ کرتے تھے تو کچھ غلط نہ تھا وہ بے یقینی کے عالم میں تھا کہ اس کے سامنے بے تکان بولتی وہ لڑکی کیا واقعی دیوان ہاؤس میں رہتی تھی۔

☆☆☆

وہ دو دن سے اسکول نہیں جا رہی تھی لیکن وہ ایک دن کے ناغہ کے بعد ٹیوشن پر آ گئی تھی مگر اتنا لیٹ آئی جب ٹیوشن ٹائم ختم ہونے کے قریب تھا اس کی توجہ پڑھائی پر نہیں تھی۔ وہ اس ماحول سے غیر حاضر تھی ٹیوٹر کے ٹوکنے سے قبل قسام یہ بات نوٹ کر چکا تھا۔

''اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو تمہیں آج بھی ریسٹ کرنا چاہیے تھا۔''

ٹیوٹر نے اس سے کچھ سوال کیا تھا وہ جواب میں خاموش رہی تو اس کی بک واپس رکھتے ہوئے ٹیوٹر اسے یہ مشورہ دیتے ساتھ ہی اٹھ گیا تھا۔

ان سب کے جانے کے بعد بھی وہ یونہی گم صم بیٹھی رہی اس نے نہ ہی ڈرائنگ کا پلی نکالی نہ ہی ٹیبل پر سے اپنی کتابوں کو سمیٹا۔ یہ بھی عجب تھا کہ قسام ٹھٹک کے رہ گیا کبھی وہ ڈرائنگ نہیں بھی کرتی تھی لیکن ٹیوٹر کے اٹھتے

''ممن بتا رہی تھی تم آج کل اسکول سے غیر حاضر ہو، تمہاری طبیعت خراب نہیں تو پھر کیا مسئلہ ہے۔''

اس نے نرمی کے ساتھ پوچھا اس کے پوچھنے کی دیر تھی وہ آنسوؤں پر اختیار نہیں رکھ پائی۔ وہ اس کے یوں رونے پر بوکھلا سا گیا۔ وہ ایسے کب روتی تھی۔

''اگر تمہیں دادی یا رعنا بھابھی نے ڈانٹا ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے۔'' یہ سب سے آسان اندازہ تھا۔

''اسکول میں عارب سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔'' وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ بولی۔ وہ پریشان ہوا ورشہ میں برداشت کی کمی تھی مگر وہ اس قسم کے جھگڑے نہیں کرتی تھی۔

''کم آن ورشہ! اسٹوڈنٹ میں تو تکرار ہوتی رہتی ہے اس کا مطلب نہیں کہ تم اسکول جانا چھوڑ دو۔ پھر اس بات پر رونا شروع ہو جاؤ۔'' اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔ اس نے فائل اٹھائی اور کھڑا ہو گیا۔ وہ رونا دھونا بھول گئی۔ وہ اس کی پوری بات سنے بغیر ہی جا رہا تھا۔

''ت..... تکرار نہیں ہوئی تھی اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا اور.....'' وہ لمحہ بھر کو ہکلائی۔ ''تو کیا میں اس کو تھپڑ نہ مارتی؟'' قسام جیسے دم بخود ہوا۔

اس نے اسے یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ کیا وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی اور اتنی باشعور کہ اسے آگاہی تھی کون سی بات نگاہ جھکا کے کرنا ہے اس سے آگے بھی کچھ تھا۔ کیا تھا، قسام کا دماغ سلگا۔

''اور تم مجھے دو دن پہلے کی بات اب بتا رہی ہو۔'' وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ دبی آواز میں چیخا۔

''مجھے دادی اور بھابھی نے منع کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملے کو ختم کرو۔ ہم اسکول بدل لیں گے۔'' اب وہ آنسو صاف کر رہی تھی۔

''اس نے تم سے اور کیا کہا تھا۔'' اس نے اپنی برداشت مجتمع کرتے ہوئے پوچھا تو آواز دھیمی پڑ گئی۔

''اس نے..... اس نے کہا تھا کہ.....'' پندرہ سال کی وہ لڑکی ہچکچائی۔ ''میں اسے اچھی لگتی ہوں اور اس..... نے میرے فگر کی تعریف کی۔'' اب وہ کتابیں بیگ میں رکھ رہی تھی اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی وہ اپنی جگہ

پر جیسے پتھر ہوا۔ اس نے ورشہ کو کیا سمجھا تھا۔

''اسے تو میں دیکھ لوں گا اور تم بھی کل سے اسکول جاؤ گی۔'' وہ اس وقت اتنے غصے میں تھا کہ اس نے ڈر کے مارے فوری سر ہلایا۔

مگر وہ اگلے دن بھی اسکول نہیں گئی۔ وہ ناشتہ کرنے کے بعد کافی دیر تک پڑھتی رہی۔ پھر دوپہر میں وہ سوگئی۔ جانے کتنی دیر گزری جب بھابھی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا وہ اٹھ بیٹھی مگر گھبرا گئی۔ ایک تو رعنا نے اسے مختلف انداز میں جگایا تھا دوسرا وہ اب اسے سرد نظروں سے گھورے جارہی تھیں۔

''جب تمہیں منع کیا تھا تو پھر یہ سب قسام کے علم میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔'' ان کی سخت آواز گونجی۔

ورشہ بات کو سمجھی تو اس کی گھبراہٹ کم ہوئی۔

''مجھے اسکول نہیں بدلنا صرف ایک سال تو رہ گیا ہے (وہ او لیول کے فرسٹ ایئر میں تھی) میں نے قسام کو بھی اس لیے بتایا تھا کہ وہ اس اسکول میں تمام ٹیچر کا فیورٹ رہا ہے۔ وہ ان سے بات کرے گا تو۔''

''اب ان باتوں کو چھوڑ دو ورشہ!''

بھابھی نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم منہ ہاتھ دھو کے بال باندھو۔ بڑے پورشن میں عارب کے والدین آئے بیٹھے ہیں۔''

ورشہ کا دل بیٹھا۔

''کتنی بار سمجھایا ہے، اب بڑی ہوچکی ہو۔ برداشت کرنا سیکھو نہ تم اسے تھپڑ مارتیں نہ یہ تماشا لگتا۔'' اسے دادی کی اس بات پر غصہ آیا تو دل نے خود بخود ہمت پکڑی۔

''اگر وہ اس تھپڑ کی شکایت لگانے آئے ہیں تو وہ میں نے اس کی بدتمیزی کے نتیجے میں مارا تھا۔'' وہ گھر میں خاص کر دادی کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کرسکتی تھی۔ پھر اسے یقین تھا کہ اب قسام کوئی حل نکال لے گا۔

''تم اٹھو اور میرے ساتھ چلو، بات اب ایک تھپڑ سے آگے بڑھ چکی ہے۔ قسام آج تمہارے اسکول گیا تھا۔ اس نے عارب کو بہت پیٹا ہے اور اس مار پیٹ میں وہ خود بھی زخمی ہوا ہے۔''

اس کا رنگ فق ہوا۔ وہ بھابھی کی تیکھی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی۔ قسام کو تو صرف ٹیچرز سے بات کرنا تھی۔ وہ خود یہ سب بھی کرسکتا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ ٹھنڈی ٹھار ہوئی۔ جبکہ یہ سب سننے کے بعد دادی کا حال اس سے بھی برا تھا۔

''تم جا کر کہہ دو، بچی کو بخار ہے۔ وہ سو رہی ہے۔'' دادی نے بیڈ کے سرے پر ٹکتے ہوئے رعنا بھابھی کا ہاتھ پکڑا۔

''پھر غلط بات پھر غلط بیانی۔'' وہ آج دوسری بار ضبط کی حد سے گزری۔ آج دوسری بار اس کی بھنوؤں کے بیچ ایک موٹی سلوٹ ابھری۔

''ہر مسئلے کا حل فرار نہیں ہوتا ام میرات!'' وہ کہہ نہ سکی۔

وہ ایک بار اپنی خودداری کا خمیازہ بھگت چکی تھی اب دوبارہ کبھی نہیں۔

''اگر ورشہ وہاں نہ گئی تو سب یہی سمجھیں گے کہ یہ جھوٹی ہے اور وہ لڑکا جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔'' رعنا نے اپنی کمزور جیٹھانی کے سر دباتھوں کو تھپکی دی۔

''وہاں سب کے سامنے بے عزت ہونے سے یہاں جھوٹی ثابت ہونا بہتر ہے، یہ دوبارہ اس اسکول میں نہیں جائے گی۔ تو یہ قصہ ہی ختم ہوجائے گا۔''

غم و غصے کی ایک شدید کیفیت نے ورشہ کو بستر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دادی ہمیشہ ہمایوں کی نسل کو غلط راہ دکھاتی تھی۔

''اگر نئے اسکول میں بھی کوئی عارب جیسا ہوا۔ تو میں کیا ساری عمر بھاگتی رہوں گی اور میں بڑے پورشن میں ضرور جاؤں گی۔ سچ انسان کو بے عزت ہونے سے بچالیتا ہے۔''

وہ دادی کے متعجب چہرے سے نگاہ ہٹا کر اب جوتا پہن رہی تھی۔

اگر قسام جھوٹ کی داستان سے پردہ نہ ہٹاتا تو وہ اس بستر میں دبکی رہتی۔ وہ اسکول بدل لیتی۔ اسے پھر باقی کی زندگی بچی ہوکر بھی کمزور اور جھوٹے لوگوں کی طرح گزارنی پڑتی۔ منہ دھونے کے دوران، پھر پونی

میں بال جکڑتے ہوئے ان کے رہائشی حصے کے طویل کوریڈیور کے آخری سرے تک ان آنکھوں کا گیلا پن اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اگر وہ پریشان تھی بھی تو اس بات پر کہ عارب کی حرکت اور اس کی باتیں کیا اس کے پیرنٹس یا مانک انکل کے سامنے دہرا سکتی تھی۔

☆☆☆

''اتنے جذباتی کیسے ہو سکتے ہو قسام؟ یوں برائے معاملوں میں الجھ کر مار پیٹ کرنا ہمارے خاندان کے بچوں کو زیب نہیں دیتا۔'' یہ آواز قسام کی پھوپھو کی تھی۔

اس نے حواس باختہ سی ہو کے رعنا بھابھی کو دیکھا۔ وہ اب آگے کیسے بڑھتی۔

''میں بھی اسے یہیں سمجھا رہا تھا کہ اسے خیال کرنا چاہیے تھا۔ اس نے دو دن بعد کورٹ کمپیٹیشن کے لیے انگلینڈ جانا ہے۔ اب اس زخمی حالت میں جائے گا تو ہم یہاں پریشان ہوتے رہیں گے۔''

یہ آواز جبار انکل کی تھی۔ وہ کوریڈور کے سرے پر سن ہوئی۔ اب وہاں اور لوگ بھی بول رہے تھے۔

''اب خدا جانے اصل معاملہ کیا ہے؟'' جانے یہ کس نے کہا تھا اس کا ماتھا ٹھنڈا ٹھار ہوا۔

لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کے درمیان سے سر جھکا کے نہیں گزرے گی۔

''پلیز آپ سب یہ ڈسکشن بند کریں۔ میں آپ سب کو کس طرح سمجھاؤں کہ عارب جس قسم کا ہے، فرض کریں کل کو وہ لڑکا ثمن کے ساتھ بدتمیزی کرتا تو.....'' قسام کی اس بات پر وہاں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی بالکل ویسی ہی جیسی کوریڈور میں تھی۔

''تم ورشہ کو ثمن کے ساتھ کیسے ملا سکتے ہو۔ ثمن کی اور حیثیت ہے وہ تمہاری کزن ہے تمہارا خونی رشتہ ہے جبکہ ورشہ.....!''

وہ اس آواز کو پہچانتی تھی، یہ زرش بی کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ اپنے ساتھ کھڑی رعنا کو بھی پہچانتی تھی۔ وہ اس کے باپ کی چچی تھی جسے دادی کی دیکھا دیکھی یہاں سب رعنا بھابھی کہتے تھے بس وہ خود کو نہیں پہچان پا رہی تھی ورشہ کون تھی وہ یہاں کیوں رہتی تھی۔

''آپ سب جو بھی کہیں مگر میرے لیے ثمن اور ورشہ ایک جیسی حیثیت کی حامل ہیں۔''

اس بردبار اور دل آشنا آواز نے ایک کچی، خستہ، بدحال دیوار پر جیسے اپنا قیمتی اور باوقار ہاتھ رکھا تھا۔ وہ کچی دیوار بلند بخت ہوئی۔ کوریڈور کی خاموشی سانس لینے کے قابل ہوئی۔ اب وہ اندر جا سکتی تھی۔

قسام کے سارے فرسٹ اور سیکنڈ کزنز اسی اسکول میں پڑھتے تھے تب ہی اس وقت وہ سارا خاندان یہاں جمع تھا۔ وہ دونوں اس ادھ کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد وہاں آئیں تو وہاں موجود ہر چہرے نے انہیں دیکھا۔

ورشہ کی نگاہ اس چھوٹے سے مجمع میں جگہ بناتی اس چہرے پر ٹھہری وہ وہاں موجود تھا تو اسے یقین تھا وہ ان تمام لوگوں کے درمیان سے سر جھکا کے نہیں گزرے گی۔ اسی لمحے قسام نے بھی اسے دیکھا۔

''مالی بابا نے ہمیں کشتیاں بنا کر دی ہیں لیکن وہ سب بچے مجھے کھیلنے نہیں دے رہے۔'' ڈھیلی پونیوں کے ساتھ منہ بسورتی دس سال کی ورشہ شکایت لگانے کے بعد اب اس سے پوچھ رہی تھی۔

''بڑے جھرنے کے پاس جو تالاب ہے کیا وہ صرف ولید لوگوں کا ہے؟''

دونوں ہاتھوں میں کشتیاں پکڑے وہ اس سے کیا سننا چاہتی تھی۔ قسام نے فٹ بال نیچے پھینکتے ہوئے گردن موڑی اور تالاب میں کشتیاں چلاتے ان کزنز کو دیکھا جو یہاں عید کے دوسرے دن لنچ پر مدعو تھے وہ تالاب کی طرف بڑھا تو وہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔

''اس تالاب کا آدھا حصہ ہمارا ہے تو ورشہ یہاں کشتیاں چلا سکتی ہے۔'' اس نے اپنے خونی رشتوں کو حکم دیا تھا یا انہیں بتایا تھا، وہ ہمیشہ اس کا بھرم رکھتا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے سے یک بیک نگاہ چرائی، اس کے چہرے پر نیلے اور سرخ نشان تھے۔ وہ وہاں ٹھہر کے اس کا حال تک نہیں پوچھ سکتی تھی پھر وہ رعنا بھابھی کے ہمراہ ڈرائنگ روم کی

وہ سب اسے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے سالوں پہلے آدھے تالاب میں درجن بھر کشتیاں چلاتے، وہ بچے باقی آدھے تالاب میں تیرتی دو کشتیوں کو حسد اور رشک سے دیکھتے رہے تھے۔

☆☆☆

''آپ ایسے ہی ڈر رہی تھیں، ورشہ نے اچھا کیا جو چلی گئی۔ عارب کے والدین یہاں ہم سب سے اور خاص طور پر ورشہ سے معافی مانگنے آئے تھے۔''

اس نے صرف اتنا ہی سنا۔ اسے یہ سننے میں دلچسپی نہیں تھی کہ اس بات کے جواب میں دادی نے کیا کہا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے الماری کی طرف آئی۔

اب وہ الماری کا نچلا خانہ کھولے اس میں سے وہ فائل نکال رہی تھی، جس میں اس کی پرانی ڈرائنگز تھیں جب وہ بہت چھوٹی تھی اور اسے کچھ غلط بناتے دیکھ کر وہ اس کے ہاتھ سے پنسل پکڑ کر ان اسکیچز کے مناظر بدل دیا کرتا تھا۔ وہ آج دیکھنا چاہتی تھی کہ قسام نے اس کی زندگی میں تب کیا کچھ ٹھیک کیا تھا۔ وہ دوزانو ہوئی اور البم میں پہلا صفحہ سیدھا کیا۔

کچھ ٹنڈ منڈ درخت تھے جو ورشہ نے بنائے تھے ان شاخوں پر جو رنگ برنگے پھول تھے، وہ قسام نے بنائے تھے تو ان درختوں کی شاخوں سے ویرانی بھاگ گئی تھی۔

وہ مسکرائی، اس نے ایک اور صفحہ پلٹا۔

''بابا نے بتایا تھا، آج وہ چھوٹی دادی کو صرف میرے لیے لے آئیں گے۔'' وہ اسے بتانے کے بعد کاغذ پر ایک پری بنا رہی تھی۔

''یہ مجھے روز کہانیاں سنایا کرے گی۔'' وہ پروں میں رنگ بھرنے لگی۔

''تمہاری چھوٹی دادی بھی یوں ہی ایک بیچ پر ننھی سی پری بنا رہی ہوں گی کہ میں اب اس کے ساتھ رہوں گی اور وہ مجھے کہانیاں سنایا کرے گی۔'' ورشہ کا ہاتھ رکا۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

''لیکن میں پری نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے کہانیاں آتی ہیں۔'' وہ پریشان ہوئی۔

نہیں آتی ہوں گی۔'' وہ اس کی بات کتنا سمجھی تھی، کتنا نہیں لیکن اس نے پروں میں رنگ نہیں بھرے۔

وہ جب رعنا کے ساتھ رہنے لگی تو اسے پتا چلا کہ انہیں کہانیاں نہیں آتی تھیں، وہ اس وقت رعنا کی ہری گھیر دار میکسی کو چھو کر ایک دم ہنس دی۔ وہ آگے بڑھی پھر اداس ہوئی۔ بابا کی ڈیتھ کے بعد یہ اس کی پہلی ڈرائنگ تھی، ایک روتی ہوئی بچی جو اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ تب قسام نے پینسلو کے ڈھیر میں سے ایک پنسل اٹھا کر اس بچی کے خالی ہاتھ میں ڈور تھمائی۔ اس نے کچھ اور کلر اٹھائے اور اس ڈور کے سرے پر ایک چار رنگی پتنگ بنائی تو وہ اپنے ہاتھ میں ڈور اور پتنگ دیکھ کر مسکرا پڑی تھی۔

ہر صفحہ اسے نئے زاویے سے خوش کر رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں الہ دین کا چراغ تھا، وہ اب اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی، اس کا حال پوچھنا چاہتی تھی۔ جو اس البم کی آخری ڈرائنگ میں اک خالی پیڑ کو تکتی نوعمر لڑکی کو کچھ کیسری پھول دے رہا تھا۔

☆☆☆

''ورشہ لاعلم ہوگی مگر یہ تو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اسکول میں اس کے ماموؤں اور پھوپھیوں کے ہی بچے نہیں پڑھتے، وہاں خاندان بھر کے بچے تھے۔ ہمارے تعلق داروں کے بچے تھے۔ اب تک ہزار فون آچکے ہیں اور ایک ہی سوال کہ تمہارے نواسے کا جھگڑا کس لڑکی کی وجہ سے ہوا ہے؟''

اس وقت زرش بی قسام کے روم میں اس کی پیکنگ کر رہی تھیں، ان کی باں بھی وہیں چلی آئیں۔ ان کی مخاطب ان کی اپنی بیٹی تھی لیکن قسام بھی وہیں موجود تھا، وہ نانو کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔ جب وہ دونوں ہاتھا پائی کر رہے تھے تو اولیول کا پورا گروپ وہیں جمع تھا۔

''بس چھوڑیں اماں! شکر ہے کہ یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا ہے۔'' کچھ آخری چیزیں سمیٹتی ہوئی زرش بی اس موضوع کو اب دوبارہ سے ڈسکس کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

''ٹھیک ہے، یہ معاملہ ایک بار حل ہو چکا ہے مگر یہ ایشو آئندہ سر اٹھائے تو ذہن نشین کرلو ورشہ اب کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے۔ آئندہ اس کی فیملی کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ تمہارے بیٹے کو بیچ میں لائے بغیر ورشہ کے ہر معاملے کو خود ہینڈل کیا کریں اور اسے بھی سمجھا دو کہ خود ہیرو بننے کے بجائے ان کے معاملات اپنے باپ کے سامنے رکھا کرے۔''

قسام کا منہ کھلا، اسے لفظ ہیرو پہ دھچکا سا لگا۔ اب وہ نانو کو خفگی سے دیکھ رہا تھا۔

''اس میں ہیرو بننے والی کیا بات ہے اماں! دونوں ایک ہی گھر میں کزنز کی طرح پلے بڑھے ہیں۔'' زرش اس قصے سے بے زار ہو رہی تھیں۔

''یہ بات اس گھر کے رہائشی تو سمجھ سکتے ہیں زرش! مگر تمہاری بھابھیاں، نندیں اور باقی کا خاندان سب سو طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔''

''ہائیں..... کیسی باتیں؟'' انہوں نے ہڑبڑا کے پہلے ماں کا چہرہ دیکھا پھر بیٹے کا۔ جو آنکھیں پھاڑے نانو کو دیکھ رہا تھا، وہ بری طرح زخمی تھا اور اس کا یہ پورا دن ٹینشن میں گزر رہا تھا۔

''اماں پلیز، ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' وہ قسام کے چہرے پر چھائے تاثرات سمجھتے ہوئے مدھم آواز میں بولیں۔

''بے وقوف! بچوں کو معاشرتی اونچ نیچ اور ٹین ایج کی نزاکتیں مائیں سمجھاتی ہیں۔ میں شروع سے دیکھتی آرہی ہوں کہ وہ لڑکی اپنے ہر کام کے لیے قسام کے ہی آگے پیچھے چکراتی رہتی ہے اور تم اب بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہو، جبکہ اتنا کچھ ہو چکا ہے۔''

وہ بیٹی کو آنکھیں دکھاتی اب باہر جا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی حرکت تھمی، انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور بیٹے کو کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اس کا سرخ چہرہ اور خفا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی آنکھیں فون پر مگر ذہن نانو کی گفتگو کی طرف تھا۔ اس کی ماں نے جو کہا تھا، وہ حرف حرف سچ تھا۔ غلطی یہ تھی کہ انہیں یہ سب بیٹی کو تنہائی میں سمجھانا چاہیے تھا، قسام نے جو کیا، وہ اپنے گھر کی لڑکی کے لیے ایک فطری غیرت کا تقاضا تھا مگر اس کی نانو اسے اور رنگ میں خبردار کر گئی تھیں چونکہ ورشہ اب بڑی ہو چکی ہے تو تم نے جو کیا وہ ایک ہیرو کے طور پر کیا۔

اب اگر رات بھر بدلتی کروٹوں کے ساتھ دکھتے جسم میں ابھرنے والی ٹیسوں کو ایک غیرت مند کے بجائے وہ ہیرو کے طور پر محسوس کرتا رہا تھا تو اس رنگ بدلتی سوچ میں اس انیس سالہ لڑکے کا کوئی قصور نہیں تھا۔

☆☆☆

چھوٹے پورشن کی طرف آتے ہوئے زرش بی نے کوریڈور کی کھلی قد آور کھڑکیوں سے باہر جھانکا تو آج پھر سے حیران ہوئیں۔ یہ ان کے مالی کی غفلت کا نتیجہ تھا یا کچھ اور تھا کہ اس موسم بہار میں دیوان ہاؤس کے ہر چھوٹے بڑے لان میں پیلے پھولوں کی کثرت نے عجیب سا فسوں پھیلا رکھا تھا، شاید اسی وجہ سے دوپہر کی تازگی میں زرد پن نمایاں تھا۔

وہ پورشن کے لونگ روم میں آئیں تو سامنے ہی ماں بیٹی سر جوڑے موبائل پر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ پہلے فاخرہ کی نگاہ اٹھی۔ وہ خوش گواری سے مسکرائی۔

''اللہ خیر، آج چھوٹے پورشن کو بڑے لوگوں نے بھی رونق بخشی۔'' وہ استقبال کے لیے آگے بڑھی تو گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ گلہ کرنا بھی نہیں بھولی کہ وہ ماں بیٹی ہفتے میں بڑے پورشن کے چار چکر لگا لیتی ہوں گی مگر زرش بی کبھی مہینوں بعد ہی ادھر آتی تھیں۔ انہوں نے آج بھی بہن کے اس شکوے کا جواب ایک مسکراہٹ سے دیا پھر وہ اس صوفے کی طرف آئیں جہاں تمکن بیٹھی تھی۔

وہ جانتی تھیں کہ تمکن ان سے ناراض ہے۔ وہ اپنی بھانجی کے اصرار پر اس فریم کے فوٹو کو وہاں سے ہٹا سکتی تھیں مگر اس کا فائدہ کچھ نہیں تھا۔

''اچھا ہوا، آپ آگئیں، ورنہ آج ہم نے بطور خاص آپ کو ایک سرپرائز دینے آنا تھا۔'' ہنستی مسکراتی فاخرہ بیٹی کے دوسری طرف آ بیٹھی۔ ان دونوں کے درمیان بیٹھی زرش بی بس لمحہ بھر کو الجھیں۔ اگلے لمحے ان پر

ولید جس لڑکی کو پسند کرتا تھا اس لڑکی نے ولید کی فرمائش پر ثمن کو اپنی پلس واٹس ایپ کی تھیں۔ اب وہاں دونوں بہنیں ایک ایک پک کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھیں۔ درمیان میں چھیڑتی ثمن ان دونوں کے تبصرے انجوائے کر رہی تھی۔

"کوئی تو متاثر کن چیز ہوگی اس میں، جو ولید نے اسے پسند کیا ہے۔" ایسا کہتے ہوئے انہوں نے فاخرہ کو دیکھا پھر اس کے منہ کا زاویہ دیکھ کر انہوں نے بات بدلی۔

"میرا مطلب ہے، تصویروں میں تو صرف اسٹائل ڈیزائنر اور برانڈز ہی نمایاں ہے، اوپر سے آدھا چہرہ تو بالوں نے ڈھک رکھا ہے۔ شکل وصورت کا پتا ہی نہیں چل رہا۔" انہوں نے عجیب سی آہ بھری۔

"آنی! اب تو سب ہی لڑکیاں اپنی ہونے والی سسرال کو اسی قسم کی پکس دکھاتی ہیں تاکہ وہ ان کا شاپنگ اسٹائل چیک کر سکیں۔" ثمن آنٹی کی بات پر اپنی ہنسی کو سمیٹنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ فاخرہ نے بیٹی کو خفگی سے گھورا اور اسکرین پر انگلیاں چلاتے ہوئے ایک تصویر پر ہاتھ رکھا۔

"آپا! ذرا دیکھیں، اس تصویر میں ایمان نے بال سمیٹے ہوئے ہیں تو چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا ہے اور یہ لباس بھی خاصا ڈھنگ کا ہے۔"

آپا اس تصویر کے متعلق کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ تب ہی انہوں نے ولید کو اندر آتے دیکھا۔

"ارے، ماشاء اللہ۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" فاخرہ کے انداز اور لب ولہجے میں خوشی جھلکی۔

"اچھا!" ایک مختصر سا ہنکارا بھرتے ہوئے وہ رسمی دعا سلام کے بعد وہاں اس انداز میں ٹھہرا جیسے آگے جانے کی جلدی ہو۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کا ذکر کس وجہ سے ہو رہا تھا۔

"ہم ابھی آنٹی کو ایمان کی پکس دکھا رہے تھے۔" ثمن کی آواز میں ایک والہانہ پن تھا۔ جوایسے موقعوں پر ایک بہن کی باتوں میں چھلکتا ہے۔ وہ ثمن کی بات پر ٹھٹکا، پھر دو قدم پیچھے آیا۔

"تو پھر آنی کو ایمان پسند آئی؟" اس کے استفسار میں کچھ تھا کہ زرش بی چونکیں۔

"مطلب ایمان آپ سب کے معیار پر پورا اترتی ہے یا پھر مجھ سے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے۔" یہ ایک غیر متوقع اور حیران کن سوال تھا جیسے وہ ایمان سے شادی کا فیصلہ ان کے اختیار میں دے سکتا تھا۔ وہ تینوں اسے دیکھتی رہ گئیں مگر وہ سنجیدہ تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ دل اور جذبات کی بھی ویلیوز ہوتی ہیں مگر ہمیں اپنے خاندان اور فیملی ویلیوز کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔"

وہ بات کے اختتام پر جس انداز میں مسکرایا تو زرش بی کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ یہ فیملی ویلیوز کا سبق اور اس گفتگو کی گہرائی تک اترنے میں انہیں بس ایک پل لگا تھا۔

"اب وہ وقت نہیں، جب بڑوں کی پسند ناپسند کو اہمیت دی جاتی تھی۔" زرش بی نے اپنے تاثرات محفوظ رکھتے ہوئے حقیقت پر مبنی بات کی۔

"اب ایسا اندھیر بھی نہیں مچا آنٹی جی! آپ اپنے بیٹے سے ناامید ہوں گی مگر مجھے آزما کے دیکھ لیں۔" وہ بنا کسی لحاظ کے تڑاخ سے گویا ہوا۔

زرش بی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا۔ وہ انہیں کیا جتا رہا تھا، وہ ابھی تک وہیں اپنے کمرے کے رخ راہ داری پر کھڑا تھا۔

"تم نے لنچ آورز میں گھر آنا تھا تو فون پر بتا دیتے، میں تمہاری پسند کا کچھ بنوا لیتی۔" ولید جس طرح اس کی بہن سے مخاطب تھا تو فاخرہ کو بہت آکورڈ لگ رہا تھا، سو اس نے ٹاپک بدلا۔

"میں یہاں سے کچھ فائلز اٹھانے آیا تھا۔ لنچ تک نہیں رکوں گا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے ایک دم واپس پلٹا، جیسے کوئی ضروری بات رہ گئی تھی پھر وہ زرش بی کے سامنے آ کر رکا۔

"آپ جانتی ہوں گی کہ جو گاڑی قسام صاحب نے ورشہ بی بی کے لیے خریدی تھی، وہ گاڑی تو سیاہ برقعہ پہنے گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں کھڑی ہے اور

گاڑی کی ماتھن سی بھر دوپٹا گلے میں ڈالے جانے کس وجہ سے رکشوں اور ٹیکسیوں میں پھرتی ہے۔'' وہ استہزاء سے ہنسا تو زرش بی نے اسے نہایت تحمل کے ساتھ دیکھا، وہ اس سے وہ بات سننے کی منتظر تھیں جس کی وہ تمہید باندھ رہا تھا۔

''ہمیں ورشہ کے حلیے یا اس کی ریپوٹیشن سے کچھ سروکار نہیں۔'' فاخرہ نے بیٹے کو دبے لفظوں میں ٹوکا کہ زرش بی آج ان کی مہمان تھیں۔

''ٹھیک ہے، اس کی ریپوٹیشن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس انعم کا تو اس سے تعلق ہے جو ہماری محنت کی کمائی ہے اور اس پر لٹائی جارہی ہے۔'' اس نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فاخرہ نے سپاٹ انداز میں بیٹھی بہن کو بے بسی سے دیکھا۔

''آپ اسے سمجھا سکتی ہیں تو سمجھائیں کہ ہم دن رات ایک کرکے اس کے لیے نہیں کماتے، یہ جو سارے شہر میں اس کی ٹیکسیوں کے پیچھے ہماری گاڑیوں میں گارڈز پھرتے ہیں، وہ اس کی خالہ کے بیٹے ہیں نہ وہ گاڑیاں ہوا سے چلتی ہیں۔'' اس کے لہجے کی برہمی اور آواز کی تیزی ناقابل برداشت ہی نہیں قابل اعتراض بھی تھی۔

ثمن اور فاخرہ نے اسے تحیر کے ساتھ دیکھا جو اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا۔ زرش بی نے ایک گہرا سانس لیا۔

''اب چلتی ہوں، ظہر قضا ہوجائے گی۔'' وہ اتنا کہہ کر ہی رخصت ہوگئیں۔

وہ دونوں ماں بیٹی اپنی نشست سے ہل بھی نہیں سکیں۔ کچھ دیر پہلے وہ تینوں خوش باش موڈ میں باتیں کررہی تھیں پھر ورشہ کے تذکرے نے ماحول کی خوش گواریت کو کسی عفریت کی طرح نگل لیا تھا۔ کاش ان کے پاس کوئی جادو منتر ہوتا وہ دیوان ہاؤس سے اس گیسٹ روم کو لمحوں میں غائب کرسکتیں۔

☆☆☆

قسام انگلینڈ سے وہ مقابلہ جیت کر آیا تھا، اسی وجہ سے اس کی واپسی کی پہلی شام ہی بڑے پورشن میں رونق قابل دید تھی۔ اس وقت یہاں اس کا پورا ننھیال جمع تھا۔ آج مالک صاحب بھی صبح سویرے ہی شکار گاہ سے واپس آگئے تھے۔

ڈنر کے بعد سب چائے کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ شاپنگ دیکھ رہے تھے جس کی انہوں نے قسام سے خود فرمائش کی تھی۔ بڑے ایک طرف بیٹھے تھے جو ایک دوسرے کے معاملات ڈسکس کرنے کے بعد اب ورشہ سمیت سبھی لوگوں کو ڈسکس کررہے تھے۔ دوسری طرف ینگ پارٹی ان تحائف پر تعریف اور تنقید کررہی تھی جو قسام نے ان کے لیے اپنی جیب سے خریدے تھے۔ وہ ثمن کے فرمائشی تحائف کے علاوہ بھی اس کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔ ثمن نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اچانک پوچھا۔

''تم ورشہ کے لیے کیا لائے ہو؟''

''یہ ثمن اسے ہر بات میں کیوں یاد رکھتی ہے۔'' وہ جھنجلایا۔ پھر ثمن کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چار مگ تھا پھر اس پیپر وائٹ مگ میں سے ایک رنگ سا جھلکا، اگر دس روز قبل وہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو وہ ہمیشہ کی طرح جھوٹ سے کہہ سکتا تھا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں؟'' مگر پہلی بار ایسا تھا کہ وہ اس کے ذکر پر محتاط سا تھا۔

''وہ اس طرح کی چیزیں نہیں ہیں۔''

''تو پھر وہ کیا ہے؟'' اس نے جیسے ضد کی۔ وہ خاموش رہا۔ جیسے وہاں سب ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

''اب صرف نانو کا گفٹ رہ گیا ہے۔'' اس نے بات بدلی اور اپنی جگہ سے اٹھا۔

ثمن بس فلس کے رہ گئی، اس اجنبی ملک میں وہ ان سب سے رابطے میں رہا تھا۔ وہ سب اس سے روز بات کرتے تھے۔ اس اجنبی جگہ پر کسی بھی قسم کا رابطہ نہ ہونے کے باوجود اگر اس کا دھیان کسی جگہ سے جڑا رہا تھا تو وہ جگہ دیوان ہاؤس کا وہ حصہ تھا جہاں اک جادو گر پیڑ تھا جس پر پھوٹنے والی کونپلوں کی باس سمندر پار جانے والوں کو بھی اپنی اسیری میں مبتلا رکھتی تھی۔

☆☆☆

ورشہ نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ برآمدے

قدموں کھوئی، ایسا کیوں تھا کہ وہ اسے دیکھ کر آج آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہی تھی۔

جب وہ برآمدے میں تھا تو رعنا بھابھی نے اسے دیکھ لیا اور اس کے ساتھ رعنا کا وہی بے تکلف، اپنائیت بھرا انداز دیکھ کے وہ حیران ہوئی۔ یعنی جو تبدیلی بھی تھی، اس کے اندر تھی۔

وہ بھی بھابھی سے پہلے کی طرح ہنستے مسکراتے بات کر رہا تھا۔ ان سے دادی اور ورثہ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

بھابھی کو، قسام کو یا کسی کو بھی اس واقعے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ تو فرق کہاں تھا، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ جب وہ اس سے کچھ گز کے فاصلے پر تھا تو وہ اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس کے بالمقابل آئی۔

اس نے رعنا بھابھی سے بات کرتے ہوئے اسے دیکھا، وہ اپنا دوپٹا ٹھیک کر رہی تھی تو کیا وہ نہ ٹھٹکتا۔ وہ اس سے سامنا ہونے پر آج پہلی بار ایسی احتیاط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"تم آج آؤ گے، میں جانتی تھی۔" وہ اس جملے کا منتظر تھا اور اس نے آج یہ بھی نہیں کہا، بس خیر مقدمی طور پر آگے بڑھی پھر خیریت دریافت کرنے کے بعد کہیں غائب ہوگئی نہ کوئی گلہ، نہ کسی انتظار کا تذکرہ۔

وہ اس تبدیلی پر چونکا، پھر وہ بھابھی کے ساتھ ہی دادی کے کمرے میں آ گیا۔ اسے وہاں بیٹھے دس منٹ گزر گئے وہ پھر بھی نہیں آئی تو اس کی طمانیت میں کچھ بکھرا۔ کیا وہ ٹھیک تھی، وہ اس سے جاننا چاہ رہا تھا کہ اب اسکول میں عارب کا رویہ اس کے ساتھ کیسا تھا۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے باہر آ گیا۔

سامنے لاؤنج خالی تھا مگر اس نے محسوس کیا، وہ برآمدے میں تھی۔

"تمہارے زخم کب ٹھیک ہوئے؟" مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد یہ اس کا پہلا سوال تھا حالانکہ وہ توقع کر رہا تھا کہ وہ اس سے حسب معمول اپنے کفلٹس کے بارے میں پوچھے گی۔ اب وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، وہاں چوٹوں کے نشان اب غائب تھے۔

اچکائے اور جیب سے موبائل نکال کے شاید ٹائم دیکھا تھا۔

"مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا لیکن موقع ہی نہیں ملا اور تم چلے گئے۔" وہ اب اس کے سامنے آئی۔ یہ ہمیشہ سے نہیں تھا کہ اس نے صرف چند لمحوں کے لیے نگاہ اٹھائی ہو۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" قسام نے اس پر شاکی نگاہ ڈالی۔ "میں کل تمہارے اسکول آؤں گا۔" وہ قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مگر کیوں؟" وہ چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد سرعت سے بولی۔

"ڈونٹ وری، بس ایسے....." وہ ہلکا سا ہنسا۔

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم آؤ۔" وہ اچھی خاصی پریشان ہو کے بولی تو اس نے اسے تحیر کے ساتھ دیکھا۔

"کیا بات ہے، کیا پھر کوئی مسئلہ ہوا ہے؟" اس کی گھبرائی ہوئی شکل سے وہ اور کیا اخذ کرتا۔

"نہیں..... نہیں....." وہ ایک دم بوکھلائی۔

"کیونکہ....." اس نے لب کاٹے۔ "وہ اسکول میں میری کلاس فیلوز عجیب عجیب باتیں کرتی ہیں تو....." اس نے نگاہ جھکائی۔

"تو کیا؟" وہ اس کی طرف گھوما۔ "ورثہ! مجھے سچ بتاؤ۔"

"وہ تم سے پوچھیں گی....." وہ ہکلا کے رہ گئی۔

"ڈیولا لنک ورثہ؟ تو تم کہہ دینا..... نہیں..... بالکل نہیں۔"

وہ ایک دم ششدر ہوا اور اس نے بے تحاشا حیرت کے ساتھ اسے دیکھا، ان دس دنوں میں ان کی عمر جیسے دس سال آگے چلی گئی تھی۔ ان جھکی پلکوں کا جنگل اب صرف سیاہ نہیں تھا، وہاں ایک چاند سا ٹانکا ہوا تھا، ایک پھول سا کھلا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ آفس میں بیٹھا کچھ کاغذات چیک کر رہا تھا، جب اس کے سیل پر میسج ٹون بجی۔ اس نے فون اٹھا کے دیکھا، یہ اکبر کا میسج تھا۔

"سر! میں آپ کے آفس کے سامنے ہوں، کیا

وہ جو ایک فائل پر جھکا تھا، یہ پیغام پڑھنے کے بعد اس کے انداز نشست میں ایک آرام دہ تبدیلی آئی۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ بہت بڑی۔ کہہ سکتا تھا پلیز ابھی نہیں، وہ اسے کل پہ ٹال دیتا تو اگلے کئی گھنٹے وہ یوں ہی مسکرا سکتا تھا مگر اس سے سنگین غلطی ہوئی اس نے اکبر کو ملاقات پر بلالیا۔

ابھی کل ہی کورٹ میں ایک کانٹے دار مقابلے کے بعد اس نے اپنے ازلی حریف سے ایک مشکل کیس جیتا تھا جس کی خوشی میں آج اس کے آفس ورکرز نے ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کی تھی تو آفس کے ماحول میں ابھی تک چائے، کافی، مٹھائی، پھولوں کی اور جیت کی مہک تازہ تھی۔

کمرے میں اس قدر پھول تھے، جیسے کوئی باغ اگ آیا تھا۔

اکبر وہاں صرف دس منٹ تک بیٹھا تھا اور چند جملوں کی گفتگو کے بعد وہ اب جا چکا تھا۔ ان چند جملوں میں کوئی بگولا پھوٹا تھا کہ وہ آفس، آفس کا مالک اس کا اطمینان سب کچھ درہم برہم ہو چکا تھا اور اس توڑ پھوڑ کے نتیجے میں، ماحول پر چھائی، چائے کی، پھولوں کی اور جیت کی مہک نے وہ آفس چھوڑنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا تھا۔

وہاں قیمتی ٹیبل پر اوندھا پڑا، وہ فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس کے آفس فون پر آپریٹر کسی آفیسر کو کال پر لے چکی تھی۔

"سر! آپ فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟" کئی منٹوں بعد وہ حواس باختہ سی اندر آئی۔ "فلاں صاحب کال پر ہیں اور آپ کو مبارک باد دینا چاہتے ہیں۔"

"کس بات کی مبارک باد؟" وہ اس قدر تیز اور سرد لہجے میں بولا کہ حق دق سی آپریٹر ہراساں ہوئی۔

"سر..... وہ....." اس نے ماتھے کو چھوا۔

"پلیز، میں اس وقت کسی سے بات نہیں کر پاؤں گا۔" آخر وہ کس بات کی مبارک باد وصول کرتا۔

کل کورٹ میں اس نے جس پراسیکیوٹر کو بری مذاق لگ رہی تھی۔ ایک ریت کے گھر جیسا مذاق۔ وہ اسی وقت آفس سے اٹھ آیا۔ فی الوقت وہ گھر بھی نہیں جانا چاہتا تھا، اسے اس وقت جس چیز کی اشد ضرورت تھی وہ چیز برداشت تھی، یوں ہی سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتے ہوئے جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔

☆☆☆

مجھ میں کتنی کہانیاں تھیں تیری
کتنی شامیں نشانیاں تھیں تیری

وہ اندر آئی تو سامنے بیٹھے اس شخص کا چہرہ اس لڑکی کے لباس میں نمایاں ہوتے رنگ کی طرح ہوا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی تو وہ اسے دیکھ کے خوش ہوا تھا یا نہیں مگر وہ اس پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکا۔ ایسا کیا تھا اس میں جو کسی اور میں نہیں تھا۔ شاید محبت میں یہ سوال کبھی بھی حل شدہ نہیں تھا اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔

وہ اندر آئی تو وہاں مکمل خاموشی تھی لیکن ویرانی نہیں تھی کہ وہ سامنے ہی موجود تھا۔ وہ آگے آئی اور اس کے قریب رکی مگر اس کا حال پوچھنے کے بجائے اس سے رزش بی کے متعلق پوچھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کمی کے بلانے پر یہاں آئی تھی مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ کمی اس وقت آنٹی لوگوں کے ساتھ ایمان کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ وہ طاقت اور اختیار کے استعمال سے پہلے ایک موقعہ محبت کو دینا چاہتا تھا۔

قسام نے اپنی نشست چھوڑی اور اس کے سامنے آیا۔

"کیسی ہو تم؟" اس کا دل اب بھی نہیں مان رہا تھا کہ وہ جو قدم قدم پر اسے پکارتی تھی، وہ اس کا نام کیسے بھول سکتی تھی۔

"جیسی ہمیشہ سے تھی۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"تم ہمیشہ ایسی نہیں تھیں۔" وہ اسے یوں ہی یک ٹک تکتے ہوئے بولا۔

وہ ابھی اس پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا جلد یا بدیر وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا کہ وہ اس شخص

سے کیوں مل رہی ہے۔

"اچھا، مجھے تو یاد نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ وہ زرش بی کے کمرے میں جانے کی غرض سے کچھ اور آگے بڑھی۔

"مگر مجھے یاد ہے اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔" وہ بھی چند قدم آگے آیا۔

"مثلاً....." اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ ذرا سا ہنسی..... وہ ہنسی ریت کے گھر جیسی تھی، جیسے وہ سب مذاق تھا۔ وہ متوحش نظروں سے اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا اور وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔

"مجھے یاد ہے، جب میں یوں ارتکاز کے ساتھ تمہاری جانب دیکھتا تھا تو تم شرما جاتی تھیں، نظر جھکا لیتی تھیں۔"

وہ کہہ سکتی تھی اگر دنیا میں کسی کو محبت مطلوب تھی تو اس وقت انہیں اس شخص کا لہجہ چرا لینا چاہیے تھا۔

"اوہ..... میرے خدا! کیا واقعی ایسا تھا۔" اس نے ایک مصنوعی تحیر کے ساتھ آنکھیں پھیلائیں، پھر اس کی آنکھوں میں نمی اتری۔

"اگر ایسا تھا تو میں اپنی کمزور یادداشت پر خوش ہوں۔" اس نے یہ بات کرتے ہوئے اپنا چہرہ موڑا اور نہ ہی آنکھ میں اتری نمی کو چھپانے کی کوشش کی۔ وہ بس اسے پیچھے چھوڑ کے آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔

"مگر تمہاری یہ کمزور یادداشت میرے لیے تکلیف کا باعث بنتی جا رہی ہے ورثہ!" وہ طاقت اور اختیار کا استعمال کرنے سے پہلے ایک موقعہ تو محبت کو دے سکتا تھا۔ عاجزی سے، نرمی سے، منت کرتے ہوئے۔

"ان گزرے ماہ و سال میں ہمارے بیچ بہت کچھ تھا کہ ان گزرے ماہ و سال میں کوئی واقعہ ایسا گزرا ہوگا جب ورثہ تیمور کی آواز کو شناخت کرنا تمہارے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ تب تمہاری کمزور یادداشت بھی میرے لیے ایسی ہی تکلیف کا باعث ثابت ہوئی تھی۔"

اس نے ایک بار پھر چہرہ موڑا نہ ہی آنکھوں میں اتری نمی کو چھپانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے بکھرتے لہجے کو کہیں سے بھی سمیٹ نہیں پائی۔ آج سالوں بعد بھی قسام نے ہی ایک صحیح ترین بے بسی لمحوں کی تھی اور آج بھی اس نے ہی جانے کیوں اس بھید کو پھر سے چھپایا تھا۔ وہ اس کے زرد چہرے پر ایک چبھتی نگاہ ڈالنے کے بعد اب سٹنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی۔

پھر اس کی نگاہ اطراف میں اٹھی اور لائٹ پنک دیوار پر سجے ایک فریم میں فوٹو سے الجھی۔ وہ وہیں ساکن ہوئی۔ اب وہاں کوئی تیسرا فرد ہوتا تو وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ان دونوں نفوس میں سے کس کا چہرہ زیادہ زرد تھا۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت ڈاؤن تھی۔ اس لیے وہ کالج سے آتے ہی بنا چینج کیے بنا کھانا کھائے ہی سو گئی تھی، جانے کتنی دیر گزری ہوگی کہ اس کی نیند ٹوٹی، کچھ سیکنڈ تک اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ پھر اس نے کسل مندی سے ذرا سی آنکھ کھولی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کی نیند روشنی کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ سو رہی ہوتی اور رعنا بھابھی اس کے کمرے کی لائٹ آن کرتیں پھر آج تو وہ جانتی تھیں کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ صرف لائٹ ہی آن نہیں ہوئی تھی، اب وہاں گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ سو رہی ہوتی اور رعنا بھابھی مہمانوں کو اس کے روم میں لے آئیں۔ اب وہ مشکوک ہوئی۔

کیا وہ دادی کے کمرے میں تھی۔

"یہاں پہلے ہی دو اچھے خاصے بیڈ روم تھے۔ اس ماسٹر بیڈ روم کی کچھ خاص ضرورت تو نہیں تھی۔"

"لیکن یہ میرے داماد صاحب بھی بس جن کا ہاتھ تھام لیا، انہیں بادشاہ بنا دیتے ہیں۔"

اس کے لہجے میں کیسی تحقیر تھی جیسے وہ تو ازل سے کنگلے تھے (گیسٹ روم کا یہ بیڈ روم ابھی حال ہی میں تعمیر ہوا تھا)

اس خاتون کے ان جملوں پر اس کے سوئے حواس ایک دم الرٹ ہوئے۔

"لو دیکھو ذرا، اب ایک فرد کے لیے یہ ماسٹر بیڈ بھی غیر ضروری ہی سمجھو۔" اس نے بیڈ کے کنارے

پر یقینی نازک سی ورشہ پر سرد مہری کی نگاہ ڈالی۔

وہ جو کروٹ کے بل لیٹی تھی، چونک کے سیدھی ہوئی اور گردن موڑ کے بے یقینی کے ساتھ قسام کی نانو کو دیکھا جو اس کمرے کے کافی آئٹمز کو بلا ضرورت کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے اب باہر جا رہی تھیں۔ مزید کچھ دیر تک وہ گھر میں گونجتی، ان خاتون کی جی جلانی آواز سے اپنا جی جلاتی رہی۔ ساتھ ہی اس کی ناک میں اضافہ ہوتا رہا کہ اس گھر میں اور کون، کون سی چیز تھی جو بلا ضرورت تھی۔

وہ غصے سے لال پیلی ہوتی کمرے کے ادھ کھلے دروازے تک آئی۔ اس نے باہر جھانکا تو صد شکر کہ وہ اب جا رہی تھیں، ان کے اوجھل ہوتے ہی وہ باہر آئی تو ننگے پاؤں تھی۔

بھابھی نے اسے پلٹ کے دیکھا پھر اس کی طرف گھومیں۔

''انہوں نے مجھے موقعہ ہی نہیں دیا، وہ یوں آنا فانا تمہارے کمرے میں گھسیں جیسے وہ بطور خاص یہی دیکھنے آئی تھیں۔''

رعنا پھیکی پڑتی رنگت کے ساتھ اس سے معذرت خواہ سی ہوئیں جو آنکھوں میں ناگواری لیے جانے کس طرف گھور رہی تھی۔ اس نے رخ بدلا اور نہایت بگڑے تاثرات کے ساتھ اس ٹی سیٹ کو دیکھا جو نہایت نفیس اور قیمتی تھا اور خاص مہمانوں کی آمد پر استعمال ہوتا تھا یعنی رعنا بھابھی سے اس مہمان کی پہچان میں غلطی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر چائے کے لوازمات جوں کے توں پڑے تھے۔

''تو یہ ہے ہماری حیثیت کہ کوئی بھی منہ اٹھا کر آئے اور ہمیں بتانا ضروری سمجھے کہ ہم ایسا لائف اسٹائل ڈیزرو نہیں کرتے۔'' وہ ادھر سے ادھر تن، فن کرتی ابھی تک کالج یونیفارم میں تھی۔

''قسام کی نانو کے علم میں نہیں ہوگا کہ دیوان صاحب کے کاروبار میں تمہارے دادا کا بھی حصہ تھا۔ ان کی شکارگاہ کے ساتھ جو رقبہ خالی پڑا ہے وہ بھی ہمایوں بھائی نے خریدا تھا۔'' اس کے تاریک پڑتے ذہن کو رعنا نے روشن کرنا چاہا۔

''یعنی واقعی ہمایوں خان اپنی وراثت اور اپنا گھر بار تج کر یہاں وہ ہاتھ تھامنے آیا تھا جو اسے بادشاہ اور اس کی بیوی کو ملکہ بنا سکتا تھا۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔ رعنا کا چہرہ ایک بار پھر پھیکا پڑا۔

''غلطی ہو جاتی ہے ورشہ! ان سے بھی ہوئی ورنہ تمہارا دادا کسی کا ہاتھ تھامے بنا بھی اپنے علاقے کا بادشاہ تھا۔''

رعنا بھابھی کی اس بات کے بعد وہاں ان تین عورتوں نے یک بیک کئی ٹکڑوں میں بٹی آہ بھری تھی۔

''غلطی ہو جاتی ہے مان لیا مگر انہوں نے غلطی نہیں غلطیاں کیں۔ ٹھیک ہے رشتہ داروں میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں جیسے زرش بی کے چھوٹے بہنوئی کا جبار انکل کے ساتھ ہوا تھا پھر باقی فیملی نے بیچ میں پڑ کے صلح کروا دی تھی۔ ایسے ہی دادا بھی اپنے سسرال والوں سے صلح کر لیتے تو واپس جا سکتے تھے۔''

اس کے لہجے میں حسرت چمکی تو آس پاس موجود ان دونوں عورتوں کے دل میں اس بجھی صورت نے قیامت مچائی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ واپسی ناممکن تھی۔

''صرف جھگڑا ہوتا تو وہ واپس چلا جاتا مگر اس پر قتل کا الزام لگ گیا تھا۔ وہ واپس جاتا تو۔'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی کہ گلے میں کچھ اٹکا تھا، ام میرات کو یقین تھا اگر رعنا یہاں نہ ہوتیں تو ورشہ کے سوال جواب پر ان کا دل کب کا بند ہو چکا ہوتا۔

''تو یوں کہیں نا..... کہ ام میرات کا پورا خاندان ہی ظالم تھا۔'' اس کا تیز لہجہ چیخا۔

''نہیں ام میرات ان سب سے زیادہ ظالم تھی۔'' دیوار کے دوسری جانب ٹھنڈی چائے کو تکتی ام میرات کو پوتی کی اس بات سے اختلاف ہوا۔

''اگر اس جھگڑے میں صلح کی گنجائش نہیں تھی تو پھر ہمایوں خان اپنی بیوی کو ساتھ لانے کے بجائے اس کے باپ کے حوالے کر کے آتا۔ پھر یہاں نہ کوئی تیمور ہوتا نہ کوئی ورشہ تیمور۔'' وہ جب غصے میں ہوتی تو ہر رشتے کو ان کے ناموں سے پکارتی تھی۔ رعنا نے اسے افسوس کے ساتھ دیکھا یا حیرت کے ساتھ، مگر یہ لمحہ ادراک کا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ورشہ کا غصہ ام میرات کے غصے کا

اپنے ہر انداز میں ام میرات کی محبت کی ہم شکل تھی۔

☆☆☆

وہ ہر آنے جانے والے کا کندھا پکڑ کر اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس گھر میں ان کے عیش و آرام ان کے اپنے روپے پیسے کی بدولت ہیں نہ ہی وہ ہر آنے جانے والے کو یہ وضاحت پیش کر سکتی تھی کہ ہم یہاں ان کے غلام نہیں اور نہ ہی ان کا دیا کھاتے ہیں۔ مگر وہ اس ایک شخص سے تو شکوہ کر سکتی تھی جو ہر دوسری بات پر اس کو احساس دلاتا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے مقابل انہیں برابری کی سطح پر رکھتا ہے۔

اور اگلے ہی دن اسے بات کرنے کا موقع مل گیا جب قسام انہیں کالج سے پک کرنے آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے سے انکار نہیں کر سکتی تھی مگر اسے اپنے موڈ پر اختیار تھا۔ ثمن اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ اپنے جواب صرف ہوں ہاں تک محدود رکھ رہی تھی وہ ان پر لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے گاڑی کے کلرڈ شیشوں سے باہر جھانک رہی تھی جیسے وہ ان دونوں کو جانتی ہی نہیں تھی۔

وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے، سامنے، دائیں، بائیں جہاں بھی دیکھ رہا تھا مگر ہنوز اسی کی طرف متوجہ تھا وہ اس سے پوچھتا کہ تم خاموش کیوں ہو تو یہ ایسا ہی سوال تھا کہ مقابل پوچھے تمہاری آنکھوں کا رنگ کیا ہے۔ وہ جس موڈ کے ساتھ جتنا بھی خاموش ہوتی جیسے وہ بات نہ کرتے ہوئے بھی اس سے بات کرتی تھی تو اس کا بات کرنا یا خاموش رہنا قسام کے لیے ایک برابر تھا۔

اس وقت وہ اس کی گہری چپ پر حیران یا پریشان نہیں تھا وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت دل گرفتہ، اداس یا پریشان نہیں تھی۔ وہ جان سکتا تھا کہ وہ بس غصے میں تھی مگر ورثہ کے برابر بیٹھی ثمن کو اس کے موڈ کی اتنی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ لہٰذا ثمن اس سے پوچھ سکتی تھی کہ ایسے منہ بنا کر کیوں بیٹھی ہو، اور اس نے پوچھا بھی پھر وہ ہکا بکا ہوئی کہ ورثہ اس کی بات پر بھڑک اٹھی

''میرا اپنا منہ ہے، بنا کے بیٹھوں یا بگاڑ کر۔ اس بات پر تو تم لوگوں کی دولت خرچ نہیں ہوتی نا.....'' وہ تلخی سے بولی۔

وہ دائیں، بائیں جہاں بھی دیکھ رہا تھا مبہم سا مسکرایا، وہ جانتا تھا کہ وہ بس غصے میں تھی۔

''یہ کل سے ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ میں تم سے جو بات بھی کرتی ہوں، تم بیچ میں دولت کو گھسیٹ لاتی ہو۔'' وہ اس کے گلابی پڑتے چہرے کو گھور کے بولی۔

''یہ بات تم اپنی نانو سے پوچھو نا۔ ورنہ میں انہیں بتاؤں گی کہ اگر عزت صرف دولت کی بنا پر کی جاتی ہے تو میرا دادا بھی اپنے علاقے کا بادشاہ تھا۔''

اس نے گردن اکڑائی، ثمن لاجواب ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی نانو ان سے کیا کہہ کے آئی تھیں مگر وہ اس کے دادا کو بادشاہ ماننے پر بھی تیار نہیں تھی۔

''نانو نے تم سے کیا کہا تھا؟'' قسام نے گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے پلٹ کے سوال کیا۔ گرے شرٹ اور بلیک ٹائی میں ملبوس وہ جیسا بھی لگ رہا تھا اس کی گاڑی جس قدر بھی قیمتی تھی مگر وہ اسے ان ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے بادشاہ کی پوتی کو دیکھتے ہیں۔

''انہوں نے جو بھی کہا تھا مگر انہیں بتا دینا، ہم یہاں غلام ہیں نہ کسی کا دیا کھاتے ہیں بلکہ تم لوگوں کے کئی عیش و آرام تو میرے باپ دادا کی دولت و جاگیر کی بدولت ہی ہیں۔''

وہ یوں وثوق کے ساتھ بولی کہ ثمن اسے دیکھتی رہ گئی جبکہ قسام کے تھکے چہرے پہ تازہ مسکراہٹ رینگی۔

''سیریسلی!'' وہ ابرو چڑھا کے محظوظ سے انداز میں ہنسا۔

گاڑی اب بنگلے کے سامنے تھی اور گیٹ پر بجی نیم پلیٹ نے اس کے ماتھے کا بل ڈھیلا کیا۔ بادشاہ کی پوتی کے پاس سب کچھ تھا مگر اس کا ٹھکانا پرایا تھا۔ وہ اس بنگلے میں ایسے ہی رہ رہی تھی۔ جیسے فاختہ اس پیڑ

پر رہ رہی تھی وہ اسے تنگ کرتی تھی کبھی شاخ ہلا کر۔ کبھی اس کے گھونسلے کا تنکا توڑ کر، تو وہ چاہتی تھی کہ فاختہ اڑ جائے۔ وہ لمحہ بھر کو تنگ ہوتی غصے سے چوں، چوں کرتی، اڑ جاتی، مگر پھر سے آجاتی، وہ اس پیڑ پر پیلے پھولوں کی محبت میں رہ رہی تھی۔

''میں نانو سے بات کروں گا کہ وہ آئندہ۔''

''نہیں۔ تم بات نہیں کرو گے، میں اپنی وجہ سے اب کوئی تماشا نہیں لگانا چاہتی۔'' وہ ایک دم سے اس کا جملہ کاٹ کے بولی۔ گاڑی اب بنگلے کے دروازے پر تھی گو وہ اسے سمجھتا تھا لیکن وہ اکثر اسے حیران کر جاتی تھی۔ ورثہ نے اس حیران نگاہ سے نظر چرائی۔

پھر دوسرے لمحے جھکالی اسے فاختہ کی محبت نے چونکا دیا تھا۔ وہ غصے سے اڑ جاتی۔ مگر پھر سے آجاتی کہ اتنے ماہ وسال تو اسیری میں گزر گئے اب رہائی کہاں ممکن تھی۔

☆☆☆

وہ سٹنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی جب اس کی نگاہ اطراف میں اٹھی اور لائٹ پنک دیوار پر ایک فریم میں قید فوٹو سے الجھی۔ وہ وہیں ساکن ہوئی۔ اب شام کہیں بہت پیچھے رہ چکی تھی اور رات کے اس حصے میں جیسے وہ اسی منظر کا ایک حصہ تھی جہاں وہ ہر رشتے۔ ہر منظر سے نگاہ ہٹا کر صرف اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کے غصے اور حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔

''تم اس تصویر کو یہاں کیسے لگا سکتے ہو۔'' وہ شدید غصے کے ساتھ تڑخ کے بولی۔

''کیا مطلب کیسے لگا سکتے ہو۔'' اس کے شدید ردعمل پر اسے بھی غصہ آیا۔ بھلے وہ ریت ثابت ہو رہی تھی۔ بھلے وہ کسی آندھی کی طرف گامزن تھی مگر وہ اپنے تئیں اسے محبت کے حصار میں لیے کھڑا تھا۔

''اسے ابھی کے ابھی ہٹاؤ۔'' اس وقت وہ جتنا کلس سکتی تھی اتنا کلس رہی تھی۔

''یہ میرا فیملی فوٹو ہے میں اسے تمہاری یا کسی کی بھی خواہش پر کیوں ہٹاؤں گا۔'' وہ اب سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

''مگر میں تمہاری فیملی کا حصہ نہیں ہوں۔'' وہ پہلے سے زیادہ تپی.....

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' وہ آرام سے بولا اور اس کے پہلو سے ہٹ کر اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس کا رنگ لمحوں میں اڑا، بالکل ویسے ہی جیسے اس پہر کو اس شخص نے اس پیڑ پہ کھلنے والی پہلی کلی کو توڑا تھا۔ جیسے کل ہی کی بات تھی۔ جیسے وہاں موجود سب نابینا تھے صرف وہ بینا تھا اس کے عقب میں اس کی ممی تھیں اور زرش بی کے سامنے مالک صاحب اور اس بینا شخص کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ اس طرح اڑی رنگت کے ساتھ۔

محبت کیا ہے ایک بہار سے دوسری بہار تک ایک سوکھے پیڑ کی شاخوں میں کسی نئی کونپل کو تلاشنا پھر اس کونپل کو سانس کے ساتھ باندھ کے کسی کو پیش کرنا ہی محبت ہے۔ وہ آج بھی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اس مسکراتی نگاہ سے نظر چرائی۔

''میں تمہاری فیملی کا حصہ تھی، نہ بننا چاہوں گی۔''

گویا کہ اسیری کے سارے ماہ وسال گزر گئے تھے۔ اب ٹھکانا بدلا جا سکتا تھا۔ وہ اس شناسا آواز پر چونکا۔ اگرچہ وہ اسے سمجھتا تھا لیکن وہ اکثر اسے حیران کر جاتی تھی۔

''یہ زندگی ہے تمہاری ڈرائنگ کاپی نہیں ہے کہ تم مجھے اپنے راستے سے ہٹا دو گی۔ امپاسبل۔'' اس نے سر دائیں بائیں جھٹکا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب محبت کو موقعہ نہیں دے گا۔

''میں اب وہ اسٹوپڈ لڑکی نہیں ہوں جو سادہ کاغذ پر زندگی کو اتار کر اسے ہی حقیقت سمجھتی تھی۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔ ''ایسا سوچنا بھی مت کہ تم میرا راستہ

وہ اس نوخیز کونپل کو وہیں پھینک کر اس سحر سے نکل گئی تھی۔

وہ وہیں کھڑا تھا حیران سا۔ متعجب سا، مٹھیوں کو بھینچے اپنے غصے کو کنٹرول کرتا ہوا۔ بہت کچھ سوچتا ہوا۔ اسے اپنے اختیار پر بھروسا تھا۔

ایسے میں وہ بھول چکا تھا کہ اس کے باپ نے کہا تھا۔

''میرے بعد تمہیں بہت سارے مسائل کا سامنا ہوگا جنہیں تم نے طاقت اور پیسے سے نہیں عقل اور ذہانت سے حل کرنا ہے۔''

وہ کتنی ہی دیر اس آفس کے داخلی دروازے پر کھڑی رہی، وہ سوچ رہی تھی کاش کوئی ایسی گنتی ہوتی کہ وہ گنتا شروع کرتی اور وہ سارے ماہ و سال اس کی یادداشت سے کم ہونے لگتے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس مقام پہ رک کے قسام کے مقابلے میں خود کو عاجز یا کمزور سمجھ رہی تھی لیکن اس مقابلے بازی میں کہیں تو ہیر پھیر تھا کہ حساب برابر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے اندر اٹھارہ بیس سال کی چودرشہ تھی، وہ کانپی پینسل اٹھا کے اس کے سامنے آ گئی تھی۔

وہ جو حساب کتاب کر رہی تھی وہاں ایک دن کو نکال کر اسی شخص کا پلڑا بھاری ہو رہا تھا۔

بس ایک دن کو نکال کر..... مگر وہ اس دن کو اپنی زندگی سے نکال سکتی تھی نہ جھٹلا سکتی تھی۔ تو پھر اسے آگے بڑھنا ہی تھا۔

اس کا آفس اتنا ہی شان دار تھا جس قدر وہ ہائی پروفائل کیس لیتا تھا، اس نے ورشہ کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے۔ خیر خیریت دریافت کی۔

''پلیز، تشریف رکھیے۔'' اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ اپنی سیٹ پر آیا تو کے انداز میں ہم کلام ہوا۔

''میں آپ کو داخلی دروازے پر ہی ویلکم کرنا چاہتا تھا لیکن ایک مسئلہ تھا کہ ابھی جو شخص یہاں سے سیکریٹری سے ضرور پوچھتا کہ ایاز صاحب جن کو اس قدر پروٹوکول دے رہے ہیں، وہ لڑکی کون ہے۔''

ورشہ کے چہرے پہ بس ایک پل کو گھبراہٹ اتری، اس نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا جو بات آگے بڑھا رہا تھا۔

''یہاں آنے والوں کے پاس اپنی کہانیاں ہوتی ہیں اور کچھ لوگ صرف یہاں سے کوئی خبر، کوئی افواہ کوئی کہانی چرانے کی غرض سے آتے ہیں۔''

اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے اسے وہ حقیقت بتائی جو شاید اس سے مخفی تھی پھر اس نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''مس ورشہ! آپ کیا لیں گی؟''

''آپ مجھے اتنا بتا ئیں کہ ہم بنا تشہیر کے یہ کیس جیت سکتے ہیں یا نہیں؟'' وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سنبھل کے بولی۔

وہ بغور اس کے چہرے کے تاثرات جانچ رہا تھا یعنی اس کا اندازہ درست تھا وہ یہ کیس دیوان فیملی کو رسوا یا ذلیل کیے بنا جیتنا چاہتی تھی۔

''آف کورس آپ یقین رکھیں۔ یہ میرا پہلا کیس ہوگا کہ جس کی تشہیر صرف کورٹ کی حد تک محدود ہوگی۔''

قسام کے مقابل ایاز جیسے کھلے حریف کے لیے صاف، شفاف شہرت کی حامل دیوان فیملی کا یہ تماشہ کورٹ کچہری کی حد تک بھی بہت دلچسپ تھا۔

''میں نے یہاں آپ کو اسی لیے زحمت دی ہے کہ ہم نے جن پوائنٹس کی بنا پر یہ کیس فائل کرنا ہے وہ آپ کے ساتھ ڈسکس کر سکوں۔''

وہ اس پہ ایک گہری نگاہ ڈالتا اپنے سامنے کھلی فائل کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کے بیان کے مطابق آپ کے دادا اور دیوان صاحب میں گہری دوستی تھی وہ اپنے ایک ترکے کے کیس کے سلسلے میں یہاں آتے تو اکثر یہ قیام طویل ہو جاتا، اس طرح بیرسٹر دیوان نے انہیں

اور کچھ سبز باغ دکھا کر اس طرح مجبور کر دیا تھا۔''

''ایکسکیوزمی۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ انہوں نے میرے دادا کو کوئی جال بچھا کر یا پھر سبز باغ دکھا کر روک لیا تھا۔''

وہ اپنے فطری ترش پن سے بولی۔ ''بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ انہوں نے ہمایوں صاحب کو ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بنا پر اس شہر میں سیٹلڈ ہونے پر زور دیا تھا، بعد میں دادا جب اپنی فیملی کے ساتھ ان ہی کے بنگلے میں سیٹ ہو گئے تو اپنی جاگیر وغیرہ بیچ کر ان کے بزنس میں بھی حصہ دار بن گئے۔''

اس نے ورشہ کی پوری بات سننے کے بعد ذرا سا سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے ہم اس پوائنٹ کو ان الفاظ میں بھی واضح کر سکتے ہیں۔'' وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''کہ ہمایوں خان جیسے سادہ لوح انسان کا ایک پیچیدہ کیس جیت کر اپنی طاقت اور ذہانت کی بنا پر انہیں ایک طرح سے اپنا غلام بنا لیا تھا تو ان کی مجبوریوں کی بنا پر۔''

وہ ایک دم ٹھٹکی، اس نے یہ کیسا سو فیصد درست نکتہ نکالا تھا، مگر کورٹ میں اس پوائنٹ کو بحث بنا کر وہ اپنے باپ اور دادا کو کسی طور بھی غلام ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''یہ بات بھی غلط ہے وکیل صاحب! وہ میرے باپ اور دادا کو برابری کی سطح پر رکھتے تھے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی کے ساتھ بولی۔

اب کے وہ صرف چونکا ہی نہیں، وہ ایک دم سیدھا ہوا۔ اور ایک سپاٹ سی نگاہ کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ اس لڑکی کا ابتدائی تاثر اسے شدید ناپسند ثابت کرتا تھا مگر وہ تو اچھی خاصی مفاہمت پسند تھی۔

''دیکھیے مس ورشہ! ہمیں اس کیس میں یہ بات ثابت کرنی ہے یا نہیں کہ انہوں نے آپ کی پراپرٹی پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' وہ اپنی جھنجھلاہٹ چھپاتے ہوئے اپنی مخصوص پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا

وہ اس کی بات پر متحیر ہوئی اور اس نے سر کو دائیں، بائیں جھٹکا۔

''میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے میری پراپرٹی پہ قبضہ کر رکھا ہے۔''

وہ اس یقین اور روانی کے ساتھ بولی کہ اس نامور وکیل کا منہ ہونقوں کی طرح کھلا۔ وہ صرف اس کی کلائنٹ ہوتی تو وہ اس عجیب و غریب سچویشن میں ایسے گڈبائے کہنے میں ایک سیکنڈ تک نہ لگاتا، مگر خوش قسمتی سے وہ دیوان ہاؤس کی رہائشی تھی لہٰذا وہ اپنی اس انوکھی مؤکل کو منہ پھاڑ کے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بی بی!

میرا مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ تشریف لے جا سکتی ہیں، ایک گہرے توقف کے بعد جب وہ بولا تو صرف اتنا کہا۔

''جب ان لوگوں کی نیت میں کچھ بے ایمانی ہی نہیں تو پھر کورٹ کچہری جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' اس کا سرد انداز محض جان چھڑانے والا تھا۔

''ضرورت ہے وکیل صاحب! کیونکہ میرا حصہ تو مجھے ہر حال میں مل جائے گا مگر۔'' وہ لمحہ بھر کو رکی۔ ''مجھے وہاں سے رہائی بھی چاہیے، جو کیس کیے بنا ناممکن ہے۔''

وہ ماتھے پر ابھرنے والی موٹی سلوٹ کے ساتھ بولی تو ایاز بشارت کے جانے کتنے طبق روشن ہوئے تھے کہ وہ گھومتے دماغ کے ساتھ اس کی پیشانی پہ الف کی صورت ابھرنے والی اس موٹی سلوٹ کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

نماز مغرب کے بعد تسبیح پڑھتی زرش بی کی نگاہ گاہے بہ گاہے اس ایکوریم کی جانب اٹھتی تو وہ اسے الجھ کے دیکھتیں۔ اس ایکوریم میں اک عجیب رنگ کی مچھلی قید تھی اور ایسے شوق قسام کے مزاج کا حصہ نہیں تھے، پچھلے کئی دنوں سے اس پورشن کی دیواروں پہ سابقہ آرائش ہٹا کر روزنئی اور عجیب و غریب پینٹنگز کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے بیٹے کے مزاج میں یہ

وہ مچھلی اپنے مسکن میں بے چین تھی یا خوش مگر اکوریم کے سامنے اس کو خوراک ڈالتی ثمن اپنے پھولے منہ کے ساتھ شدید ناخوش نظر آتی تھی۔ انہوں نے نگاہ ہٹا کے ایک گہرا سانس لیا، اسی پل ثمن نے بھی رخ بدلا اور تسبیح پڑھتی زرش بی کی جانب آئی۔

''ابھی بیچ میں دو تین دن ہیں اگر آپ مجھے قسام سے اجازت دلوا سکتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر مجھے ان سے خود بات کرنا ہوگی۔'' اس نے ان کے گھٹنے سے لگ کر ایک آخری کوشش کی۔

''دیکھو، قسام سے اس طرح کی فضول گوئی کا سوچنا بھی مت۔'' وہ اس کے منت بھرے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے سختی کے ساتھ بولیں۔ ''تم کیا بھول چکی ہو کہ میں نے چند سال پہلے گھریلو طور پر بھی اس سالگرہ جیسے ہلے گلے کی اجازت کافی مشکلوں سے لی تھی ورنہ تو اسے تم لڑکیوں کا اس طرح سے مل جل کر تصویریں بنانا اور یہ تماشے لگانا بھی پسند نہیں اور سچ کہوں تو یہ ہوٹلوں میں سالگرہ منانا مجھے بھی قطعاً پسند نہیں۔''

انہوں نے معمول کے سرسری اور بے تاثر انداز کے ساتھ گویا بات ہی ختم کردی۔ وہ کچھ دیر انہیں نم آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں کی نمی زرش بی کا دل موم کردیتی تھی۔

''دو دن بعد ولید کی منگنی کا فنکشن ہے تو اپنی دوستوں کو بلا کر جتنا دل چاہے رونق لگا لینا۔'' وہ اسے کن انکھیوں سے دیکھتی پچکار کے بولیں۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

''میں بچی نہیں ہوں خالہ بی! سب جانتی ہوں کہ اس گھر میں مجھ پہ یہ پابندیاں اسی واقعہ کی وجہ سے لاگو ہیں اور جو ان واقعات وحالات کی ذمہ دار ہے اسے تو کچھ پروا ہی نہیں۔ مشکلات تو ہم جھیل رہے ہیں آزادی تو ہماری سلب ہوئی ہے (ورنہ بھی قید کی حق دار نہیں، وہ بھائی کو کیسے بتاتیں) اوپر سے قسام

رہی ہے۔'' وہ متنفر اور غصے کے ساتھ بولتی، پیر پٹختی جب دروازے کی طرف بڑھی تو مچھلی کی باقی ماندہ خوراک اس کی مٹھی میں ہی تھی۔

''ارے رکو ثمن! اس کو پوری خوراک تو ڈالتی جاؤ۔'' زرش بی نے اسے متفکر سا ہو کے پکارا، لیکن وہ ان سنی کر گئی۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر پہلے جب گھر آیا تو ممی کے ساتھ فاخرہ اس کی چھوٹی خالہ بھی وہیں موجود تھیں وہ ان کے بگڑے تاثرات پر اس لیے چونکا نہ الجھا کہ وہ اس ارجنٹ میٹنگ سے سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے شام سے قبل نانو سے بات کی تھی اور اس وقت عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں، اب وہ ان کے سامنے بیٹھا انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم نے اماں کو کال کی تھی؟'' اس کی ماں نے یہ سوال بیٹے کے نارمل موڈ کے برعکس خاصا تپ کر کیا۔

''میں نے صرف ان سے پوچھا تھا کہ آپ وہاں۔''

''تمہیں بڑوں سے باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔'' اس کی ماں اس کا جملہ کاٹتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ بولیں۔

''میری ماں سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے میرے گھر کبھی نہ آنے کی قسم اٹھا رہی ہیں اور اس سب کا ذمہ دار نہایت آرام سے کہہ رہا ہے کہ میں نے صرف ایک بات کی ہے۔'' اس نے ماں کے تمتماتے چہرے کو بے یقینی سے دیکھا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس کی پوری بات سنے بغیر اسے جھوٹا ثابت کر رہی تھیں۔

''اس لڑکی کو اماں سے جو بھی شکایات تھیں تو اسے تمہارے بجائے یہ بات آپا سے کرنی چاہیے تھی مگر نہیں، وہ تو تمہیں جیسے مٹھی میں لے کے بیٹھی ہے۔'' چھوٹی خالہ کا چبھتا ہوا لہجہ بات کو غلط رخ پہ

''اس نے نانو کے متعلق جو کچھ بھی بتایا وہ تمن کو بتایا تھا بلکہ اس نے تو مجھے یہ بات بڑھانے سے منع کیا تھا۔'' وہ ان کا ہر اعتراض رد کرتے ہوئے ان ہی کے لہجے میں بولا۔

زرش بی اس کے جواب پہ چونکیں، ان کے بیٹے کا تلخ لہجہ صرف ورشہ کے لیے مدافعانہ تھا، وہ اپنی خالہ سے بدتمیزی کر رہا تھا۔ اسے نانو کی ناراضی کی پرواہ تک نہیں تھی تو ان کا بھڑکنا بے اختیاری تھا۔

''بھلے وہ تمن ہو یا کوئی بھی اور ہو مگر ورشہ میرے فیملی ممبرز پر کسی بھی قسم کی الزام تراشی کا کوئی حق، کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اگر وہ ایسا کر رہی ہے تو تمہارے باپ اور تمہاری شہ پر کر رہی ہے۔'' وہ اس بات پہ پلکیں نہیں جھپک سکا۔

اس کی خالہ نے اس کی فیلنگز عیاں اور بیاں کرتے ہوئے صرف دیوار پہ لکھی تھیں مگر اس کی کمی نے بیٹے کی وہ فیلنگز اس کے منہ پر ماری تھیں، محبت اور زمانے میں جو شیفون کے پردے جیسی آڑ ہوتی ہے، یہاں صرف وہ ماں بیٹا ہوتے تو اور بات تھی مگر یوں کسی دوسرے تیسرے رشتے کی موجودگی میں اسے اپنی ماں کا رویہ برا لگا۔ اس کے چہرے پہ سرخی چھائی۔

''یہ الزام تراشی نہیں ہے ممی! نانو وہاں صرف ان کی انسلٹ کی غرض سے گئی تھیں اور یہ سب غلط تھا۔'' وہ ان کی جارحانہ کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل ٹاپک کی طرف آیا۔ ''اکثر بزرگوں سے بھی غلطی ہو جاتی ہے تو آپ سب کو مان لینا چاہیے کہ نانو نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''ہاں بالکل ٹھیک کہا تم نے، باقی سب غلط ہیں اور بس ایک ورشہ ہی پرفیکٹ ہے جو جان بوجھ کے تمن سے یہ بات تمہاری موجودگی میں کرتی ہے، دوسری طرف تمہاری نظر میں اچھا بننے کے لیے وہ تمہیں یہ بات بڑھانے سے بھی منع کرتی ہے۔'' اس نے فاخرہ آنٹی کی یہ بات جانے کس طرح برداشت کی تھی۔

دو بزرگ خواتین بھی رہتی ہیں، اس دن نانو اور ورشہ نے تو شاید آپس میں بات بھی نہیں کی ہوگی پھر اس معاملے میں صرف اسی کا ذکر کیوں ہو رہا ہے۔'' وہ تلملا کے گویا ہوا تو اس کی مخاطب اس کی ماں تھیں اور وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''تو کیا تم ہر معاملے میں اسے فیور نہیں دیتے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولیں۔ قسام کا چہرہ لمحہ بھر کو سرخ پڑا کہ وہ تاسف اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں گویا ہوا۔

''میں صرف ورشہ کو فیور نہیں دیتا بلکہ میں تیمور انکل کی پوری فیملی کی عزت کرتا ہوں اور آپ سب کے علم میں ہونا چاہیے۔ اس فیملی کو بھی اپنی عزت نفس برقرار رکھنے کا پورا حق ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولتا ہوا، ان سب کو متحیر کر گیا۔

''تم اور تمہارا باپ کچھ بھی کہو قسام! لیکن ہم نے تو صرف اتنا ہی سنا ہے نا جو ہمیں بتایا گیا ہے۔'' ہمیں نہیں پتا وہ لوگ صاحب حیثیت تھے یا خانہ بدوش تھے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اپنا پتا ٹھکانہ چھوڑ دینے والوں کی حیثیت دنیا کو ہمیشہ شک و پنج میں مبتلا رکھتی ہے۔''

فاخرہ آنٹی نے اس پہ ایک جتاتی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے تئیں اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا تھا لیکن اس کے نزدیک ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

☆☆☆

مالک جب بیٹے کے پاس آ کر بیٹھے تو ان کا چہرہ سپاٹ تھا مگر ان کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ قسام نے ان آنکھوں کو پڑھتے ہوئے ایک پرغور قسم کا سانس لیا اسے یاد آیا۔

ایک بار پہلے بھی اس کے بابا یونہی اس کے سامنے بیٹھے تھے تب ان کی آنکھوں میں ایک داستان تھی۔ آج وہ داستان غائب تھی کیونکہ سالوں پہلے اس کا باپ اسے ہمایوں خان کی زندگی کی وہ کہانی سنا چکا تھا پھر بعد میں وہ اسے تیمور انکل کے قتل کے کیس

ے ہر پہلو سے آگاہ کر چکے تھے۔

ابھی کل شام ہی وہ اسے یہ بھی سمجھا چکے تھے کہ ''ورثہ نے تمہارے سامنے جو باتیں بھی کی تھیں تو ڈائریکٹ نانو کے بجائے تمہیں وہ سب ماں کو بتانا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اسے متنبہ بھی کیا تھا کہ آئندہ تیمور فیملی کے کسی بھی مسئلے میں تمہارا نام نہیں آنا چاہیے۔''

مگر آج پھر اس کے بابا کی سنجیدہ آنکھوں میں بہت کچھ تھا، تو قسام محسوس کر رہا تھا کہ آج اس بہت کچھ میں صرف ورثہ تیمور ہی نہیں تو جب باپ نے ایک ذرا دھیان سے اسے دیکھا تو وہی سب کچھ جیسے قسام کے چہرے پہ چمک اٹھا کہ مالک دیوان کئی ثانیے کو بیٹے کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد آواز کے ایک عجیب تاثر کے ساتھ ہمکلام ہوئے۔

''جب ہم چھوٹے تھے تو دادی ہمیں شہزادی اور سوداگر کی کہانی سنایا کرتی تھیں کہ کس طرح وہ شہزادی جنگل کے سفر کے دوران ایک شب اپنے شاہی کارواں سے بچھڑ جاتی ہے وہاں قریب ہی ایک وجیہہ اور بہادر سوداگر کی سرائے تھی، وہ بیش قیمت لکڑیوں کا بہت بڑا سوداگر تھا، وہ بھٹکتی ہوئی شہزادی کو دیکھتا ہے تو اسے اپنی سرائے لے آتا ہے اگلی شام وہ سرائے سے نکل کر واپسی کا راستہ ڈھونڈتے ہوئے پھر بھٹک جاتی ہے تو وہ سوداگر اسے بھیڑیوں کے غول سے بچا کر دوبارہ اپنے ساتھ لے آتا ہے۔

اب وہ روزانہ جنگل سے باہر جاتے راستوں پر سوداگر کے ساتھ گھنٹوں چہل قدمی کرتے ہوئے شاہی فوج کا انتظار کرتی ہے، وہ سوداگر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے ایک دن وہ شاہی فوج کی آمد سے مایوس ہو کر محل واپس جانے میں اس کی مدد مانگتی ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے کہ وہ ان راستوں سے ناواقف ہے اور ایسی کسی بھی کوشش میں وہ دونوں جنگلی جانوروں کا شکار بن سکتے ہیں پھر وہ شہزادی کو ناامید پا کر اسے شادی کی پیشکش کرتا ہے ایک طرف وہ اس خوب صورت اور بہادر سوداگر کی پیشکش پہ خوش ہوتی ہے لیکن حقیقتاً وہ اپنا محل اور ریاست چھوڑ کر اس سرائے میں پوری زندگی بسر کرنے کی بھی خواہش مند نہیں تھی۔

اسے وہ مہربان سوداگر اچھا لگنے لگا تھا مگر سوداگر کے گھر والے اور عزیز و اقارب اسے شہزادی ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کیونکہ اس کے شاہی گہنے کہیں جنگل میں ہی کھو چکے تھے۔ اس کا قیمتی لباس جگہ، جگہ سے خراب ہو چکا تھا۔ ان کی نظر میں وہ صرف ایک راستہ بھٹکی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کے محل منارے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کے پاس شہزادی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔

وہ تجارت کے سلسلے میں کہیں جاتا تو اس کی ماں بہنیں شہزادی کو ہر وقت کام میں لگائے رکھتیں وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ سوداگر کی مرضی کے بغیر وہاں سے رہائی ممکن نہیں تھی تو بہت سوچنے سمجھنے کے بعد وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ.....

''میری شادی تم سے نہیں ہو سکتی کیونکہ تمہارے گھر والے تمہارے لیے ایک امیر و کبیر ملاح کی بیٹی منتخب کر چکے ہیں، مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے مگر سوچو، تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے گھر والے اگر مجھے جنگل میں تنہا چھوڑ کے آجائیں تو میرا انجام کتنا بھیانک ہوگا ہاں اگر تم کوشش کرو تو ایک صورت میں میں تمہاری ہو سکتی ہوں اگر کسی نہ کسی طور محل تک رسائی حاصل کر و اگر تم محل سے میرا تاج چرانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو شاہی فوج تمہارے تعاقب میں آئے گی، یوں تمہارے گھر والوں کو میرے شہزادی ہونے کا یقین آجائے گا پھر ہم شادی کر کے محل میں ایک ساتھ زندگی گزار سکیں گے۔''

سوداگر جذباتی ہونے کے ساتھ بہت بہادر بھی تھا۔ وہ اس کی باتوں پہ یقین کر کے سفر پہ روانہ ہو جاتا ہے اس کے پاس اعلا سامان تجارت تھا اس نے محل کی کنیزوں سے ساز باز کر کے کچھ عرصے بعد وہ تاج چرا لیا، محل میں تاج کی گمشدگی کی خبر پھیلنے کے بعد

شاہی فوج اس تاج چور کی چند نشانیوں کی بنا پر ہر طرف پھیل جاتی ہے سوداگر ابھی جنگل میں ہی تھا اور فوج سرائے تک آجاتی ہے۔ وہ اپنی شہزادی کو زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

سوداگر جب سرائے آتا ہے تو وہ شاہی سپاہیوں میں گھری خوش باش شہزادی کو دیکھ کر اچانک پریشان اور حیران رہ جاتا ہے۔''

قسام کے سامنے بیٹھے مالک ایک دم خاموش ہوئے جیسے کہانی ختم ہوگئی ہو پھر انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلتے بیٹے پہ مسکرائی نگاہ ڈالی، داستان کے اس حصے میں دادی بھی خاموش ہو کر ایک سوال کیا کرتی تھیں۔

''بھلا بتاؤ سوداگر تو کامیاب ہو کر لوٹا تھا پھر وہ پریشان کیوں ہوگیا تھا؟''

اس کے بابا کیا کہہ رہے تھے، وہ بند ہونٹوں پہ مٹھی جمائے ان کی آنکھوں میں دیکھے گیا۔ یہ کون سی داستان تھی جو ایک سوال پہ رک جاتی تھی اور سننے والوں کے جوابات سے مکمل ہوتی تھی۔

کچھ وہ باپ کی قصہ گوئی پر بھی متعجب تھا کہ جب وہ آئے تھے تو ان کی آنکھوں کی حکایت میں ورثہ تیمور تھی اور جب انہوں نے بات شروع کی تو ان کی زبان پہ ایک دوسرا قصہ آخر کیا معنی رکھتا تھا۔ وہ اپنے بابا سے اس الجھن کا اظہار کرتے کرتے رہ گیا کہ ذہن نے ایک دم سوداگر کی پریشانی کا جواب ڈھونڈ لیا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' سوداگر صرف جذباتی تھا مگر شہزادی واقعی ذہین تھی لیکن اس جواب کے پھسلنے سے قبل اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا کہ اس کے بابا کچھ کہہ رہے تھے۔

''کبھی میں بھی تمہاری طرح سوچتا تھا کہ اس شہزادی نے محبت کے نام پر ایک چال چلی تھی مگر۔''

کچھ دیر تک اس کے بابا یہ داستان چند جملوں میں مکمل کر چکے تھے۔ قسام کو افسوس ہوا کہ اس کے بابا نے محبت کی اس داستان میں اپنے ان ہی چند جملوں میں تنہزادی کو وفادار ثابت کر دیا تھا۔ داستان مکمل کرنے کے بعد اب وہ بیٹے سے پوچھ رہے تھے۔

''کہ اگر میں یہ داستان تمہارے سپرد کروں تو تم اسے کیا انجام دو گے؟''

پھر وہ بیٹے کے چہرے پہ پھیلتی مسکراہٹ میں وہ انجام تلاش کر کے سر ہلا رہے تھے کہ.....

''اگر واقعی یہ قصہ کبھی تمہارے زیر قلم آجائے تو تم اس راستہ بھٹکی ہوئی شہزادی کے ساتھ انصاف کرنا۔''

اور وہ بند ہونٹوں پہ مٹھی جمائے مالک دیوان کو بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

تین پہر میں کئی رنگ بدلنے کے بعد اس دن کا بچا کھچا سا حصہ اب زرد پڑ چکا تھا مگر گیسٹ ہاؤس کے صحن کا ایک حصہ ابھی بھی رنگین تھا۔ وہ اس وقت برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے، بالکل خاموش، دونوں کی نگاہ ان بھوری چیونٹیوں پہ جمی تھی جن کی چھوٹی سی قطار کچھ شریر چیونٹیاں بار بار بے ترتیب کر رہی تھیں۔

قسام اگلے دن اپنے لاسٹ کمپیشن کے لیے بیرون ملک جا رہا تھا، وہ ان شریر چیونٹیوں کو قطار سے نکالنے کی خواہش دبا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس بار صحن کی طرح تم بھی مجھے ایک فرمائشی لسٹ بنا کر دو۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر ہمیشہ کی طرح وہی پرانی فرمائش دہرائی۔

''یہ کیسا بچپنا ہے اور کیسا شوق ہے؟'' وہ اس کی فرمائش پہ ذرا سا چونکا اور ذرا سا ہی ہنسا۔

''تم اسے بچپنا نہیں کہہ سکتے ہاں مگر شوق کہہ سکتے ہو۔'' اس نے بھی قدرے جھینپ کے مسکراتے ہوئے ذرا سی وضاحت پیش کی۔

''اگر یہ شوق ہے پھر تو یہ دونوں آئٹم تمہارے پاس بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے۔'' اس نے کچھ ترچھے رخ ہو کر اسے دیکھا۔

''نہیں، میرے پاس وہی کشتیاں اور وہی جہاز

ہیں جو مجھے تم گفٹ کرتے رہے ہو کیونکہ میں خود سے اس قدر مہنگے گفٹ خریدنے کی کبھی ہمت ہی نہیں کر پائی اور جو مہنگے نہیں ہوتے، وہ نقلی، نقلی سے لگتے ہیں۔"

وہ دھیمی اور سنجیدہ آواز میں بولی، قسام نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"کم آن ورشہ.....!" وہ ہنسا۔ "جس قدر بھی مہنگے ہوں مگر ہیں تو جعلی۔" وہ اپنے چہرے پہ چمکی حیران کن مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

"پھر بھی قسام! جانے کیوں یہ مجھے اس حد تک رئیل لگتے ہیں کہ کبھی میں اپنی ذاتی خلا اور ذاتی سمندر ڈھونڈ سکوں تو میں وہ جہاز اور وہ کشتیاں چلا سکتی ہوں۔" وہ کچھ اس طرح پر یقین ہو کر بولی کہ اسے دلچسپی سے سنتا وہ شخص کئی لمحوں کو مسکرانا بھول گیا۔

یہ دونوں چیزیں سفر کی علامت تھیں اور بھوری چیونٹیوں کو گھورتی اس لڑکی کے شوق میں، اس کی خواہش میں سفر کہاں سے آ گیا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ خوش رہنے کے لیے کسی سمندر، کسی خلا کا ذاتی ہونا ضروری نہیں ہوتا ان چیونٹیوں کو دیکھو، یہ زندگی گزارنے کے لیے نہیں، بلکہ زندہ رہنے کے لیے ذخیرہ کرتی ہیں۔"

"تمہارے پاس ہر چیز ہے، ہر رشتہ ہے۔ تم اس لیے یہ سب کہہ سکتے ہو۔" وہ اس پر سے نگاہ ہٹا کر بولی۔

"تم ایک دن میری ہر ایک چیز اپنے نام لکھوا لینا اور میں زندہ رہنے کے لیے صرف محبت ذخیرہ کروں گا۔ تمہاری محبت۔"

شام کی مدھم پڑتی روشنی میں اس کی آواز اس پہلی بتی کی طرح چمکی جو اسٹریٹ کے نکڑ پہ ابھی آن ہوئی تھی۔ وہ اس طرز تخاطب پہ، محبت کے پہلے اظہار پہ ایک دم گلابی ہوئی۔ سامنے کیاری میں کھلے گلابی پھولوں سے بھی زیادہ۔

عین اسی وقت برآمدے میں آتی ام میرات کو اس کی گلابی پڑتی مسکراہٹ نے اس منظر سے اٹھا کے جیسے جاڑوں کی رات میں پھینکا۔ وہ یخ ٹھنڈی ہوئیں وہ اسے بتا سکتیں تو چیخ کر بتاتیں کہ اس رنگ کی مسکراہٹ کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔

☆☆☆

اس نے ابھی اکبر کا جو ٹیکسٹ پڑھا تھا۔ اس کے لیے وہ ٹیکسٹ ناقابل یقین تھا۔

اگر وہ اپنی اس کیفیت کو کسی سے شیئر کر سکتا تو کن الفاظ میں بتاتا کہ وہ اذیت کہاں تک اور کتنی جگہ گھیر رہی تھی، وہ کمرہ چھوڑ کر باہر ٹیرس پہ آ گیا۔

وہ پچھلے چار سالوں سے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار تو ضرور سوچتا تھا کہ وہ اس قیامت جیسے دن کو اپنی انسلٹ اور اپنی بے بسی کو کیا فراموش کر چکی تھی تو اس سوال پہ اس کا دل ٹھہر سا جاتا تھا، کیا وہ یہ سب فراموش کر سکتی تھی؟

وہ پچھلے چار سالوں سے ڈرائینگو بک خریدنا بھی ترک کر چکی تھی اور وہ اس بات پہ مطمئن تھا کہ وہ اب مشکل جگہوں سے راستے نکالنے کا ہنر بھول چکی ہوگی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں مسلسل ایک خلا اور ایک سمندر کھوجنے میں لگی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"تم مجھے بتا سکتی ہو کہ ورشہ تیمور! کس طرح کی ہے مطلب۔" وہ کچھ اٹکتے ہوئے پہلو بدل کے رہ گیا تو اس الکن کی وجہ خولہ کے چونکنے کا انداز تھا۔

ایاز بشارت کسی بھی لڑکی سے متعلق بولڈ ترین بات کرتے ہوئے بھی کب ہچکچاتا تھا۔

"مطلب تم اس کے متعلق جو کچھ بھی جانتی ہو کیا وہ سب تفصیل کے ساتھ بتا سکتی ہو؟" اس نے اپنی بات کو ٹھہر ٹھہر کے مکمل کیا۔

خولہ نے اسے عجیب جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ایاز کے لب و لہجے، اس کے چہرے پہ بس ایک الجھن بھری ٹوہ سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"کیا اس کے بارے میں تمہیں بھی ایسا محسوس ہوا کہ ہم اسے کسی حد تک ایب نارمل کہہ سکتے ہیں۔"

اس نے اپنے رتی بھر خدشات کے زیر اثر پوچھا تو وہ اس بات پہ ہکا بکا ہوئی۔

"وہ کبھی بھی ایب نارمل نہیں تھی نہ ہی بے چاری ٹائپ تھی ہاں مگر کچھ عجیب سی تھی جیسے پتھر، کانچ، پھول، پانی، آگ ان سب کی کیمسٹری ملانا چاہتی ہو۔ اس میں ایک خوبی تھی کہ وہ ہمیشہ نارمل رہی، بظاہر وہ سب میں جلدی گھل مل جاتی تھی چونکہ اس میں برداشت کی کمی تھی تو اس وجہ سے وہ اجنبیت ظاہر کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتی تھی اور تو مجھے ایسا کچھ یاد نہیں۔" وہ کندھے جھٹک کے بولی۔

پھر جیسے کچھ سوچ کے ٹھٹکی۔

"تم یہ سب اس لیے پوچھ رہے ہو کہ وہ قسام کی کزن ہے تو تمہیں انفارم کردوں کہ وہ اس کی کزن نہیں ہے۔"

"آئی نو، وہ اس کی کزن نہیں ہے بلکہ میں یہ سب اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ وہ میری کلائنٹ ہے۔"

وہ ہلکی سی برہمی کے ساتھ بولا جس شخص کے مقابل اس کی جیت ایک خواب بن چکی تھی اور ابھی نئی بات کا ذائقہ تازہ تھا۔ اسے اس بندے کا نام کرنٹ کی طرح لگا۔

خولہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے کندھے اچکائے اور لہجے کو سرسری سا ظاہر کیا۔

"بالآخر اس بد دماغ لڑکی نے کیس فائل کرنے کا فیصلہ نہیں بدلا حالانکہ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ باپ تمہارا فوت ہو چکا ہے۔ بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔ عزیز و اقارب لاپتا ہیں تو ایسی صورت میں تم دیوان فیملی سے الگ ہونے کی حماقت مت کرنا، مگر شاید وہ جانتی ہی نہیں کہ باہر کی دنیا میں اکیلی لڑکی سے لوگ پل، پل بھیس بدل کر ملتے ہیں۔"

وہ تاسف کے ساتھ بولتی کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ ایاز نے اس کی بات کاٹی۔

"تم شاید غلط اندازے لگا رہی ہو خولہ! اس اکیلی لڑکی کا کہیں نہ کہیں کوئی ٹھکانہ کوئی سہارا تو ہے ورنہ وہ قسام مالک پہ جس بے جا کا کیس کبھی دائر نہ کرتی۔" قسام مالک کے نام پر اس کے اندر کڑواہٹ بھری تھی۔

اس خبر پہ خولہ کا منہ کھلا، اس کے چہرے پہ حیرت پھیلی، وہ کیسے یقین کرتی کہ ورشہ یہ سب کچھ کر رہی ہے لیکن ایاز کے سنجیدہ تاثرات بتا رہے تھے کہ خبر جھوٹی نہیں۔

"اگر یہ سچ ہے تو یقیناً میں ایک عرصے بعد کچھ انوکھا سن رہی ہوں۔"

"اس میں انوکھا کیا ہے۔ ورشہ کے اس انتہائی قدم کے پیچھے کوئی تو ٹھوس وجہ ہوگی۔ کیا خبر وہ لوگ اس پر اپنی مرضی تھوپ رہے ہوں۔" وہ خولہ کی حیرت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میں اس خود پسند ورشہ کی بات نہ بھی کروں مگر قسام وہ اسے خود سے کبھی دور نہیں کرسکتا امپاسبل!" اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔ "میرا مشورہ مانو یہ کیس مت لو کیونکہ تم ایک بار پھر قسام سے ہار جاؤ گے ایاز بشارت!" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

اس نے سامنے بیٹھے شخص کا چہرہ بجھتے دیکھا مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"بقول تمہارے وہ لڑکی کچھ عجیب سی ہے تو ہو سکتا ہے، میں یہ کیس جیت جاؤں مائی ڈیئر!" وہ اسے دیکھتے ہوئے دلکشی سے مسکرایا۔

"تو پھر اس میں تمہارا کمال تو نہیں ہوگا نا کیونکہ وہ شہر بھر کے وکیل چھوڑ کر یہ کیس تمہارے پاس لائی ہے تو وہ واقعی اس شخص کو ہرانا چاہتی ہے۔" خولہ کے ہونٹوں پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ بکھری تو وہ شانے اچکا کے رہ گیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ ورثہ کا اس کے خلاف کیس دائر کرنا ہی قسام کی اصل ہار تھی۔

☆☆☆

اس نے دروازے تک جا کر چادر اوڑھنے سے قبل پلٹ کر انہیں دیکھا، وہ یونہی بے تاثر وجود کے ساتھ گم صم سی بیٹھی تھیں تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے

واپس آئی۔

''جو تم سوچتی ہو نا ام میرات! کبھی میں بھی ایسا ہی سوچتی تھی مگر محض سوچنے سمجھنے سے بات نہیں بنتی اگر ہماری یا ان کی اس خواہش کو عمل پذیر ہونا ہوتا تو ابھی پرسوں ہیں نے زرش بی سے اس رشتے سے متعلق رائے لی تھی مگر انہوں نے تو اشارتاً بھی کوئی پیغام نہیں دیا۔''

رعنا ان کا ہاتھ تھپتھپا کے بولیں تو ام میرات استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھے گئیں وہ خود سے ایسا کبھی بھی نہ سوچتیں مگر ایک زرد پڑتی شام میں ورشہ کے ہونٹوں پہ ابھرتی وہ گلابی سی مسکراہٹ انہیں بھولتی ہی نہیں تھی، جانے کیوں وہ محسوس کرتی تھیں کہ ان کی پوتی کے لبوں پر وہ مسکراہٹ اب پھیکی پڑتے پڑتے بدرنگ ہو چکی تھی اگر وہ محبت تھی تو پھر کہاں گئی۔

''جو بھی ہو رعنا! مگر ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے گویا ہوئیں کہ دل میں ابھی تک ایک امید سی تھی کہ پھیکی پڑتی چیزوں کو دوبارہ بھی تو رنگا جا سکتا ہے۔

''تم ہر لحاظ سے اطمینان رکھو، یہ رشتہ صفیہ آپا کے توسط سے آیا ہے تو ان کی گزارش پر ایک بار تو مجھے جانچ پرکھ کے لیے وہاں لازمی جانا ہوگا آگے پھر اللہ بہتر جانتا ہے۔'' وہ اسے تسلی دے کر چادر اوڑھتے ہوئے باہر آ گئیں۔

باہر آتے ہی وہ ورشہ کی تیاری دیکھ کر ٹھٹکیں۔

''ایک تو یہ تمہاری تیاریاں میری سمجھ سے باہر ہیں۔'' انہوں نے تیوری چڑھائی۔ ''بہر حال تم میری واپسی تک کہیں بھی نہیں جا رہی ہو سمجھیں۔''

رعنا کبھی کبھار اس پر حکم چلا لیا کرتی تھیں۔

''یہ سراسر ناانصافی ہے رعنا!'' وہ جب حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی تو سرنڈر کرنے سے قبل ہر ادب لحاظ بھول جاتی تھی۔ ''میرا کل کا دن بھی ان سرپرائز وزٹ پر آئے مہمانوں کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا (وہ سرپرائز صرف اس کے لیے تھا) ویسے بھی اتنی جلدی مت مچائیں کہ ہم لڑکی والوں کو سوچ بچار کی مہلت درکار ہوتی ہے یا نہیں؟''

مگر رعنا نے اپنے عقب میں پاؤں پٹختی لڑکی کو ان سنا کر دیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں اور وہ تلملاتی ہوئی دروازے کے اس پار ہی رک گئی کہ باہر قسام کھڑا تھا جو رعنا سے دعا سلام کرنے کے بعد اندر آ گیا۔

ورشہ نے اس کا ستا سا سپاٹ چہرہ بڑے دھیان سے دیکھا جیسے وہ کسی خبر کی تلاش میں تھی مگر وہ بھی یہ عقدہ کھلنے تک اسے کوئی خبر نہیں دینا چاہتا تھا۔

''اچھا ہوا تم آ گئے ورنہ میں تمہیں ابھی کال کرنے والی تھی۔'' وہ لاپروائی جتاتی چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی، مگر اسے خاموش پا کر وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکی۔

''مجھے اس ماہ کچھ بڑی رقم کی ضرورت ہے۔''

وہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایک دم رکا، وہ جو پچھلے دو دن سے سوچ، سوچ کے ہلکان ہو رہا تھا کہ وہ ایاز بشارت سے کیوں مل رہی ہے تو یہ عقدہ لمحوں میں کھلا کہ وہ ایک شخصیت سے نہیں بلکہ ایک وکیل سے مل رہی تھی اور کیوں مل رہی تھی، فی الوقت وہ یہ سوال اٹھانا نہیں چاہتا تھا اس نے لاپروائی جتاتی لڑکی کو نہایت غور سے دیکھا جو نہیں جانے کی غرض سے دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے اس بڑی رقم کا کیا کرنا ہے مگر یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ آج کل یہ شہر گردی کیوں ہو رہی ہے؟'' وہ اس کے مقابل ٹھہر کر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''آج کل اپنے لیے اچھا سا لڑکا ڈھونڈ رہی ہوں۔'' وہ بھی اسی سنجیدہ کیفیت میں آنکھوں کی بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ جوابدہ ہوئی۔

کیا وہ سنجیدہ تھی؟ وہ سمجھ نہیں پایا، وہ یونہی کچھ لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''مجھے لگتا تھا کہ تم نے لڑکا ڈھونڈ لیا ہے۔'' وہ تنی گردن اور تیقن بھری آواز کے ساتھ کچھ اور آگے آیا۔

Khawateen Digest August 2021

ہاں، جب اسے ضرورت تھی وہ میری حفاظت کرنے والا، مجھ پر مرمٹنے والا ایک لڑکا تھا پھر ایک دن اس نے میری وحشت زدہ دستک پر دروازہ نہیں کھولا تو میں نے اسی دن جان لیا تھا کہ مجھ پر مرمٹنے والا وہ لڑکا اب سود وزیاں کا حساب کتاب رکھنے والا مرد بن چکا ہے۔"

وہ اس وقت مسکرانا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ ایک تڑخ جیسی آواز پر مسکرانے پہ مجبور ہوئی، سامنے کھڑے شخص کی گردن میں پڑا سریا تڑاخ سے ٹوٹا، وہ سر جھکانے پر مجبور ہوا۔

"کون سا لمحہ ہوتا ہے جب مرد ایک عورت کے سامنے سر جھکا لیتا ہے قسام، عورت بھی وہ جسے وہ چاہنے کا دعوے دار بھی ہو؟" وہ بکھر بکھر کے بولی۔ پوٹی کی اس بات کا جواب کمرے میں حق دق بیٹھی ام میرات کے پاس تھا۔

"تم نے مرد ہو کر سر جھکا لیا ہے۔" بالکل یہی جملہ ام میرات نے بھی اسی طرح بکھر بکھر کے ادا کیا تھا مگر وہ حیران رہ گئی کہ اس سوال کا جواب ورشہ کے سامنے کھڑے اس شخص کے پاس بھی تھا۔

"مجھے باقی مردوں کا پتا نہیں اور اگر میں نے ایک جذباتی قسم کی لڑکی کے سامنے سر جھکایا ہے تو اس لیے کہ میں نے اس کی محبت کے بجائے اس کی عزت اس کے وقار کے سود وزیاں کا حساب کتاب رکھا تھا کیونکہ اس لڑکی کو کبھی اپنے نفع نقصان کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔"

"اس وقت تم نے صرف اپنے خاندان کے سود وزیاں کا حساب رکھا تھا۔" وہ تلخ ہو کر پوری قوت سے چلائی۔

"یہ بالکل غلط ہے مجھے اس دن صرف تمہاری پروا تھی۔ میں اس وقت بھی اپنے پورے خاندان کو انگلیوں پہ گن سکتا تھا اور میری زندگی میں تب بھی تمہارا شمار ایک زمانے جتنا تھا۔" اس کا شا کی لہجہ ہر تاثر کے ساتھ کھرا اور سچا تھا۔

"یہ سب جھوٹ ہے قسام! اس روز تمہیں میری میرے ساتھ جو سلوک بھی کیا گیا، وہ مجھے تنہا اور لاوارث سمجھ کے کیا گیا تھا، جبکہ مجھے اس وقت صرف تمہارے سہارے، تمہارے ساتھ کی ضرورت تھی۔"

وہ پیشانی پر ابھرنے والی موٹی سلوٹ کے ساتھ اپنا غصہ، اپنا کرب کچھ ضبط کرنے کی کوشش میں نہیں تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے چہروں کے مختلف تاثرات کے ساتھ چار سال کے اس عرصے میں آج پہلی بار اس حادثے کا غبار نکال رہے تھے جس نے ورشہ کی محبت کو پتھر کا کر دیا تھا۔

اس روز یہ جذباتی لڑکی قسام سے کیسا فیصلہ، کیسا ساتھ چاہتی تھی؟" اندر بیٹھی ام میرات کا کمزور دل کسی اتھاہ میں اترا، ان کے کان باہر یہ کس کی آواز سن رہے تھے۔ کیا باہر لاؤنج میں سولہ سترہ سال کی وہ جذباتی سی ام میرات تھی جو سیاہ شال اوڑھے اپنے سامنے کھڑے منگیتر کو یہ کہتے ہوئے صرف سر اٹھانے پر نہیں بلکہ ایک غلط قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"مجھے اس وقت صرف اور تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔"

اس جذباتی لڑکی کو اپنے نقصان کا اندازہ ہی نہیں تھا اور اس نے اس وقت اس لڑکی کی عزت، اس کے وقار کے بجائے صرف اس کی محبت کے سود وزیاں کا حساب رکھا، کاش وہ سر جھکائے رکھتا، اور ام میرات واپس لوٹ جاتی۔

گیسٹ ہاؤس میں اب گہری خاموشی تھی، وہ بوڑھی عورت اندازہ لگا سکتی تھی۔ وہ اسے اپنی سچائی کا یقین نہیں دلا سکا تو مایوس ہو کر جا چکا ہوگا اور وہ لڑکی جو یکتا ہو کر بھی کسی کے لیے زمانے جیسی تھی، وہ کہیں بیٹھی اپنا غصہ پی رہی ہوگی۔ واقعی وہ صوفے کے سرے پہ گنگ سی بیٹھی تھی کہ لونگ روم میں اس شخص کا آخری جملہ ابھی تک اودھم مچا رہا تھا۔

"تم مجھے جو مرضی کہہ لو اور مجھے جیسا بھی سمجھو مگر یاد رکھنا کہ قسام مالک، ورشہ تیمور سے کسی صورت بھی دست بردار نہیں ہوگا۔"

☆☆☆

وہ کچھ دیر پہلے جب گھر آیا تو ممی کے ساتھ اپنی چھوٹی خالہ کو انتہائی سنجیدہ موڈ میں دیکھ کر آج بھی چونکا نہ الجھا جیسے وہ جانتا تھا کہ وہ اسی کے انتظار میں تھیں۔

آج قسام نے ان کے غصے کا مظاہرہ دیکھنے سے قبل، ان کی اور ان کے صاحبزادوں کی خیریت دریافت کرنے پر جس محبت کا مظاہرہ کیا۔ تو جواب میں چھوٹی خالہ نے اسے تیوری چڑھا کے گھورا، بھانجے نے انہیں مصنوعی تعجب سے دیکھا۔

''اب مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟'' اس نے نشست پہ پھیلتے ہوئے زرش کی طرف دیکھا وہ ماں کی بے توجہی پہ چونکا پھر ان کی نگاہ کے تعاقب میں دیکھا تو فوری جان لیا کہ ان کی توجہ کا مرکز میٹل کا وہ پنجرہ تھا جس میں مقید چڑیا اپنے دو رنگے پر پھیلائے جیسے پنجرے سے اڑان بھرنے کی خواہاں تھی۔

لاؤنج کی اس نئی آرائش نے زرش بی کی سوچ کو ایک نئے اور حیرت انگیز رخ کی طرف موڑا انہوں نے سامنے بیٹھے بیٹے کا چہرہ نہایت دھیان سے جانچا، کچھ تو تھا جو ان کے بیٹے کی مٹھی میں پائی بن چکا تھا۔ وہ صرف ماں نہیں تھیں، وہ خاندان اور حسب، نسب کی پوچا پاٹ کرنے والی ایک عورت تھیں اگر صرف ماں ہوتیں تو بیٹے کی فنا ہوتی خوشی پہ ان کا دل تڑپ اٹھتا۔

ابھی دوپہر میں ان کی بہنیں ان کے بیٹے کی حرکتوں پر خفا ہو رہی تھیں۔ دبوار سے جڑی اس ایک تصویر کی وجہ سے ان کی بھانجیاں، ان کی نندیں آج ان کی تربیت پر انگلیاں اٹھا رہی تھیں وہ انہیں بتا رہی تھیں کہ ان کے خاندان میں یوں محبت جتانے کا عام رواج کب تھا۔

ان تمام باتوں پر ان کی نگاہ جھک گئی تھی۔

''ہمارے خاندان کا ایک نام ہے، ایک مقام ہے اگر قسام مالک اس گمنام قبیلے کی لڑکی کو اس خاندان کی بہو بنائے گا تو اسے اپنی اس خواہش کی بھاری قیمت چکانی ہوگی۔''

ولید کی اس گفتگو نے کل سے ان کا چین قرار سب حرام کر رکھا تھا، وہ جواب میں ولید سے یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ تم بھی تو اپنی مرضی سے شادی کر رہے ہو کیونکہ اس طرف ایمان کا ایک بھرا پرا خاندان تھا اس خاندان کا نام نسب روشن تھا، اس طرف صرف ایک تن تنہا لڑکی تھی جس کا نام نسب ڈوب چکا تھا اور دشمن اس کی بوسونگھتے پھر رہے تھے۔

وہ ماں ہونے کے ناتے اپنے بیٹے کو اس لڑکی سے بچانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بیٹے کا چہرہ دھیان سے جانچا، وہ اس کی بکھری کیفیت پہ ایک دم پرسکون ہوئیں۔

ولید کی گفتگو، بھابھیوں کے طعنے اور بہنوں کی باتوں کی تکلیف جیسے یک لخت ختم ہوئی وہ قسام کے ساتھ بحث کرتی ہوئی چھوٹی بہن کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ دیوان فیملی میں یہ ہو کیا رہا ہے، ولید ہے تو وہ بھی خاندان سے باہر رشتہ جوڑ رہا ہے اور تم ہو، جس نے یہ تماشا لگا کر گویا لوگوں کو جان بوجھ کر باتیں بنانے کا موقع دے رکھا ہے۔''

اس کی چھوٹی خالہ نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھانجے کو نہایت خفگی سے دیکھا تو قسام نے جانے کیوں ممی کی طرف دیکھا جو اس مسئلے پر بولتی ہی نہیں تھیں۔

''ایک بات تو بتائیں خالہ چلو! میں تو اس فوٹو، اس تماشے اور اس لڑکی کو پسند کرتا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا خاندان اس لڑکی کو کس حوالے سے یاد رکھتا ہے۔''

وہ ورثہ کی فیملی سے اپنے رشتے کی بات خود سے کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا اور زرش بی نے یہ معاملہ اب ولید کی انگیجمنٹ کے بعد پر ٹال دیا تھا، وہ ان دونوں پر انتہائی ناراض نظر ڈالتا وہاں سے اٹھ گیا تو اس کی ممی نے بیٹے کی متوحش حالت کو حلق سے نیچے اتارتے ہوئے جیسے کھل کر سانس لیا، اب وہ اس تصویر کے سامنے کھڑی تھیں جس میں کئی سالوں سے

بہار کا موسم دائمی تھا اور یہ بات انہیں پریشان کرتی تھی اس فیملی فوٹو میں زرش بی کی آنکھوں کی چبھن ان کے شوہر کی مسکراہٹ، ان کے بیٹے کے ہاتھ میں سانس لیتی وہ کیسری کلی، اس لڑکی کے خدوخال میں جھلکتی وہ محبت، وہ سب بے اختیاری تھا مگر آج بھی ان مٹ تھا اور دائمی تھا لیکن وہ محسوس کر رہی تھیں کہ اس لوک داستان میں لڑکی اس لڑکے کو اب وہ کیسری پھول واپس کر چکی تھی۔

☆☆☆

''ویسے تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے کسی لیگلی نوٹس کا اثر لیا جائے گا۔'' ایاز نے خولہ کی بات کے زیر اثر ورشہ سے اس سوال کو ضروری سمجھا تھا، کیونکہ کورٹ میں کیس کرنا آسان تھا مگر قسام مالک کے خلاف کیس کرنا کچھ معنی رکھتا تھا۔

ورشہ کو اس بات پہ حیرت ہوئی ایاز یہ سوال کس زمرے میں کر رہا تھا۔

''وہ اس لیگلی نوٹس کا اثر کیوں نہیں لے گا۔ قسام مالک کیا پھول کاشت کرتا ہے۔'' اس کے رخساروں پر لہجہ بھر کو کچھ جھلکا اور اس جھلک نے ایاز بشارت کو نا قابل فہم سی خبر دی۔

''وہ ایک وکیل ہے وہ قانون کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہے پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں، خصوصاً اس صورت میں جب اس کیس پر تمام ہوم ورک بھی مکمل ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولی۔ باوجود اس کے کہ اس نے ہمایوں خان کی تمام کہانی اپنے وکیل سے چھپالی تھی۔

''کچھ خاص نہیں، بس ایسے ہی خیال سا گزرا کہ شاید کسی مفاہمت کی بنا پر آپ کو یہ کیس جلد ہی واپس لینا پڑ جائے۔'' وہ اس کے خدوخال سے نگاہ بچا کر کچھ سنبھل کر بولا۔ یقیناً وہ اپنی کلائنٹ کی مستقل مزاجی پرکھنا چاہتا تھا۔

''ہرگز نہیں کیس واپس لینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ اپنے تمام خدشات تمام تر کمزوریاں چھپاتے ہوئے وثوق کے ساتھ بولی۔

(آخر قسام سے ایسی کیا دشمنی ہوئی تھی کہ ورشہ تیمور کو اس کے لیے ہر سز ابونی لگتی تھی)

''ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ قدرے آگے کو جھک کر کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی زندگی میں قسام کی کیا جگہ ہے؟'' ایاز بشارت نے یہ سوال کرنے سے قبل کوئی تمہید نہیں باندھی تھی۔

وہ اس بات پہ بری طرح ٹھٹکی یہ ایک ذاتی نوعیت کا سوال تھا، اس کے ماتھے کی شکن اور شکل پہ اتری ناگواری نے اس کے وکیل کو اپنا سوال بدلنے پہ مجبور کیا۔

''میرا مطلب تھا ایک تو آپ سنگل ہیں پھر اپنی فیملی کی سپورٹ کے بنا اور کسی بھی اثر و رسوخ کے بنا آپ قسام کی مخالفت افورڈ کر سکیں گی۔'' وہ اسے سچ بتا رہا تھا، سچ جو انسان کو بے عزت ہونے سے بچا لیتا ہے۔ وہ اس کی بات پہ مسکرائی پھر اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ''تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

وہ اس یقین کے ساتھ مسکرائی تھی کہ دیوان فیملی اور ان کی حیثیت کے دائرے سے باہر آ کر بھی وہ بادشاہ کی پوتی تھی مگر یہ خوش فہمی اس لڑکی کی سب سے بڑی بھول تھی۔

☆☆☆

بڑے پورشن کے مرکزی دروازے کے سامنے اس وقت وہ کسی الجھن یا گھبراہٹ کا شکار تھی تو اس کی وجہ اس کا اور قسام کا وہاں اتفاقیہ سامنا نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ زرش بی کی وہ کال تھی انہوں نے ورشہ سے کہا تھا۔

''کہ تم میرے پاس آنے سے قاصر ہو تو پھر میں گیسٹ ہاؤس آ جاتی ہوں۔''

زرش بی وہ خاتون تھیں کہ جن سے تیمور خان سر جھکا کے بات کیا کرتے تھے اور وہ اکثر باتوں میں اپنے باپ کو کاپی کرتی تھی۔

سوچ نے اسے مضطرب کر رکھا تھا کہ آخر وہ اس سے کیا بات کریں گی۔ ابھی چند ہفتے پہلے وہ دادی اور اپنے درمیان کشیدگی پر زرش بی سے خاصا طویل لیکچر سن چکی تھی، پھر عدالتی کیس والا معاملہ بھی ابھی راز میں تھا، اس راز کے کھل جانے پر بھی یہ باقی فیملی کا نہیں صرف اس کا اور قسام کا معاملہ تھا۔

زرش بی اس سے محبت کرتی تھیں یا نہیں، وہ نہیں جانتی تھی وہ ان سے فاصلہ یا تکلف برتتی تھیں تو یہ اپنی ٹیوڈ ان کی حیثیت کا حصہ تھا سو ورشہ کو ان سے کبھی کسی شکایت کا سامنا نہیں رہا تھا لاؤنج کا بھاری دروازہ کھولتے ہوئے وہ پرسوچ قسم کی سانس لے کر پلٹی۔

''کیا میں اس ارجنٹ میٹنگ کی وجہ جان سکتی ہوں۔'' وہ دونوں آگے پیچھے اندر آئے تو ورشہ برہمی کے ساتھ بولی، قسام نے اسے چونک کر دیکھا، ورشہ کا سوال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

''چند دنوں تک ولید کی منگنی کا فنکشن ہے تو ممکن ہے، ممی تم سے تمہاری تیاری کے متعلق کچھ ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اس کی طرف گھوما تو چہرے پر بڑی محفوظ قسم کی مسکراہٹ تھی۔

''قسام! میں واقعی سیریس ہوں۔'' وہ جیسے جل بھن کے بولی۔

''میں بھی سیریس ہی ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ تم اب بڑے بڑے معاملات ڈیل کر لیتی ہو پھر تمہیں کسی بھی مجھ جیسے سے یہ ننھے منے سوالات زیب نہیں دیتے۔'' ابھی تو کئی اور حقائق ضبط کر کے بولا تھا مگر ورشہ کا رنگ بدلا یعنی وہ اس کے ہر عمل کی خبر رکھتا تھا۔ اس بات کو ان سنا کر کے وہ نگاہ چرا کے بولی۔

''ہو سکتا ہے تم نے زرش بی سے میری شکایت لگائی ہو۔''

''کیا تم کچھ غلط کر رہی ہو۔ جو میں تمہاری شکایت لگاؤں گا۔''

اس شخص کا سپاٹ چہرہ، بھنچے ابرو، اور یہ چبھتا

''کیا میں ہی ہمیشہ غلط کرتی ہوں اور سب لوگ جو میرے ساتھ کرتے ہیں، وہ ٹھیک ہوتا ہے۔'' وہ لہجے کی نمی کے ساتھ آنکھوں میں خفگی بھرے اسے دیکھتی رہ گئی۔

اگلے لمحے قدموں کی آہٹ پہ چونکی، یہ قسمت کی بات تھی کہ وہ ان قدموں کی چاپ پہ مڑوب ہوئی اور یہ ظرف کی بات تھی کہ زرش بی اس کا شکوہ سن کر جامد ہوئیں۔

محبت ام میرات نے کی تھی، محبت میں ساتھ نبھانے کا وعدہ ہمایوں خان نے پورا کیا تھا اور اس تمام کہانی کا تاریک پہلو ورشہ کے حصے میں آیا تھا، ورشہ کے شکوے نے زرش بی کو آج پہلی بار بہت گہرائی تک جھنجھوڑا۔

انہوں نے اسے اندر تک جان لیا تھا۔ ایک زمانے سے اپنے لیے لڑتی بھڑتی وہ لڑکی بس اپنی پہچان کا علم لہرانا چاہتی تھی اور اسے وہ جگہ نہیں مل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ آج نئے سرے سے ورشہ کی فکر میں مبتلا ہوئیں۔ ان پہ منکشف ہوا کہ یونہی ادراک کے کسی لمحے میں دیوان صاحب بھی ہمایوں کی محبت میں ایسے ہی گرفتار ہوئے ہوں گے کہ پھر اسے راہ میں چھوڑنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کے سامنے بیٹھی اسے خاموش نظروں سے دیکھ رہی تھیں جس کی نگاہ ایک بلوریں ایکوریم پہ جمی تھی۔

''کیا پچھلے ایک سال سے قسام اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے۔'' انہوں نے آج بھی تمہید نہیں باندھی ـــــ وہ ہلکا سا کھنکار کے ہمکلام ہوئیں تو ان دونوں نے کسمسا کے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اگر تم دونوں کے بیچ کوئی مسئلہ کوئی ضد نہیں چل رہی تو پھر تمہارا ایوں پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟'' وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ ان

دونوں سے مخاطب تھیں۔ وہ ہر جھگڑے کی نئی کر چکے تھے مگر جانتے تھے کہ مسئلہ ہے سو ہے، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے چین ہوئے، وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے، وہ صرف ضد نہیں تھی۔ ایک فیصلہ تھا۔

''بہر حال جو ہو گیا سو گیا لیکن تم اسے میرا حکم سمجھو یا گزارش مگر اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ آئندہ تم ڈرائیور کے ساتھ اپنی گاڑی استعمال کرو گی۔''

وہ اسے تنبیہہ کرنے والے انداز میں بولیں، جلد یا بدیر وہ دیوان ہاؤس چھوڑنے والی تھی، وہ زرش بی کا یہ حکم ماننے کو تیار تھی۔ اس نے میٹل کے پنجرے سے نگاہ ہٹا کر گردن اثبات میں ہلائی۔

''اب میں جا سکتی ہوں؟'' وہ ان سے اجازت طلب کرتے ہی اٹھنے لگی تو زرش بی نے اسے روک لیا۔

''میں تمہارے ساتھ چائے ضرور پیتی، مگر فاخرہ نے گھر پر جیولر کو بلا رکھا ہے تو مجھے ذرا جلدی ہے مگر تم چائے پیے بغیر نہیں جاؤ گی۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں، زرش بی دیکھ رہی تھیں کہ قسام کی باڈی لینگویج میں لاپروائی کا اظہار تھا تو ورثہ سے کسی اختلاف کی بنا پر تھا مگر ورثہ کے انداز میں چھپی سنجیدگی اور سختی زرش بی کے لیے ناقابل فہم تھی۔ وہ چند قدم آگے جانے کے بعد رکیں۔ اب وہ ورثہ کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''کچھ لوگوں سے محبت کرنا آسان نہیں ہوتا ورثہ!''

مگر میں نے دیوان صاحب کو پھر مالک دیوان کو ان لوگوں سے محبت کرتے ہی نہیں محبت نبھاتے بھی دیکھا ہے۔''

وہ اس کے قریب ٹھہر کر ہلکا سا مسکرا کے بولیں۔ ورثہ کی آنکھوں میں نمی اتری اور وہ اس شخص کی وجہ سے آنکھیں رگڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی یہاں تک کہ دروازہ بند ہو گیا۔

وہ زرش بی کا حکم کیوں مانتی، وہ چائے کا انتظار کیے بنا پیر کی ہر دروازہ کھٹکھٹاتی ہوئی چلی جاتی تو یہ معمول کا رویہ ہوتا لیکن وہ لڑکی اسی جگہ پہ بیٹھی تھی۔ ملازمہ اسے چائے پیش کر رہی تھی۔ اس سارے منظر نے قسام کی بے نیازی میں دراڑ ڈالی۔ وہ اپنی نشست چھوڑتا ہوا ایک دم اس کی طرف آیا۔

''اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہاری کوشش بار آور ثابت ہو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں تمہیں اپنی زندگی سے بے دخل نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کی آواز ہموار نہیں تھی۔ اس کی سخت آواز میں ایک چیلنج تھا، ورثہ نے تیزی سے چہرہ اس کی طرف موڑا۔

''اپنا یہ زعم اپنے پاس ہی رکھو قسام، یہ کوئی جادو نگری نہیں ہے کہ تم ان منظروں کو چھوتے جاؤ گے تو یہ قفس، یہ پنجرہ یہ ایکسوریم ان میں جو کچھ بھی مقید ہے وہ سب ورثہ کا وجود اختیار کرتے جائیں گے۔''

وہ چائے سے بھرا کپ ٹیبل پہ پٹختے ہوئے اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ جواب دہ ہوئی۔

''میری فیملی کا فرد ہو کر جب تم میرے مخالفوں سے ملو گی تو پھر میں تمہارے لیے قید گاہیں ہی تعمیر کرواؤں گا ورثہ تیمور!'' وہ ٹھہر ٹھہر کے بولا۔

اس بات پہ ورثہ کے چہرے نے ہزار رنگ بدلے، چند لمحوں تک وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جیسے وہ مقابلہ ہو رہا تھا پھر اس نے استہزاء سے سر جھٹکا۔

''میں تمہاری فیملی کا فرد نہیں ہوں سو میرے لیے قید گاہیں بنوانا چھوڑ دو۔'' وہ اس پہ ایک تلخ نگاہ ڈالتی۔ باہر کو چل دی۔

بعض اوقات لوگ ہمارے ساتھ بہت برا کرتے ہیں، تب بطور ردعمل ہم اپنے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا کرتے ہیں جیسے وہ لڑکی اپنے ساتھ کر رہی تھی۔

☆☆☆

''مجھے گیسٹ ہاؤس میں کام کرنے والی ملازمہ

فاخرہ نے جیولری باکس سے ڈائمنڈ نیکلس نکالتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا، جیولر کے جانے کے بعد وہ اب ایک، ایک زیور دوبارہ دیکھ رہی تھی۔

یہ کیسی خوش کن خبر تھی کہ ملازمہ سے چائے کا کپ وصول کرتی ثمن کا ہاتھ ہلکا سا کپکپایا۔ اگلے لمحے وہ زرش بی کا چہرہ دیکھ رہی تھی کہ اس بریکنگ نیوز کے بعد بھی ان کی دلچسپی ہنوز زیورات پہ مرکوز تھی۔

''ہاں کچھ دن قبل مجھ سے رعنا نے ذکر کیا تھا مگر میں جانتی ہوں کہ رشتے اتنی جلدی طے نہیں ہوتے۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولیں، فاخرہ نے اس جواب پہ انہیں تعجب کے ساتھ دیکھا، پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، وہ ایک لمحے کی امید بھی ختم ہوتی تو ثمن، فون اور کپ اٹھائے وہاں سے اٹھ گئی۔

زرش بی نے اس کے یوں چلے جانے پہ ایک ٹھنڈی آہ بھری، ورشہ ایسی ہستی تھی جو ان کے بیٹے کی زندگی سے نکل بھی جاتی تو اسے وہ ساری زندگی اپنے ساتھ ہی رکھتا اور ثمن' ورشہ کو کسی ایسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

''فرض کریں، اس کا رشتہ کہیں طے ہو جاتا ہے تو پھر؟'' فاخرہ کی دھیمی آواز میں بہت کچھ تھا۔ وہ فاخرہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

''کیا تم نہیں جانتیں کہ اس خاندان کا مرد ہمیشہ بااختیار رہا ہے تو اب بھی وہی ہوگا جو قاسم چاہے گا۔'' وہ اس سے نگاہ چراتے ہوئے یقین کے ساتھ بولیں۔

اور اسی وقت ماں کے کمرے میں داخل ہوتے ولید نے زرش بی کی اس بات پر انہیں بے یقینی کے ساتھ دیکھا، دونوں بہنوں کی نظر اندر آتے ولید پر پڑی، جس کے چہرے پہ سختی اور ماتھے پر بل تھے۔

☆☆☆

''کل میں تمہاری طرف گئی تو پتا چلا کہ آج کل آنٹی تمہارے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔''

کو دبائی ہوئی خفیف سا مسکرائی، جب اس کی زندگی میں سب کچھ نارمل تھا تب کیا وہ سوچ سکتی تھی کہ وہ ایاز سے کبھی دوسری لڑکیوں کے حوالے سے ایک دن اس کے رشتے کی بات کر رہی ہوگی، وہ چندا بھی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اب اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''ہوں۔'' واقعی یار! مما آج کل یہ مہم کافی سنجیدگی سے چلا رہی ہیں۔'' وہ کنپٹی چھو کے بولا۔ وہ جب سے اس کے ساتھ تھا تو خولہ اس کی غائب دماغی محسوس کر رہی تھی۔ ان دونوں کے آفس تقریباً ساتھ تھے تو وہ لنچ آورز میں کہیں نا کہیں ایک ساتھ ہوتے تھے۔

''تم آنٹی کی اس مہم سے الجھے ہوئے ہو یا پھر کوئی اور بات ہے؟'' اسے کسی خوش گمانی نے چھوا کہ شاید اس شخص کو وہ لڑکی آج بھی یاد ہو جسے وہ بھی چاہتا تھا۔

''آج قاسم مالک میرے آفس آیا تھا۔'' اس نے پانی کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خولہ کی آنکھیں پھیلیں۔

''میں تب سے سوچ رہا ہوں اگر ورشہ نے اس پہ جس بے جا کا کیس کیا ہے تو کچھ غلط نہیں کیا۔''

''مطلب وہ اس لڑکی کو جیسے اپنی کوئی ذاتی شے سمجھتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ورشہ کے لیے ہمدردی تھی' ترحم تھا، وہ اس ترحم پہ جز بز ہوئی۔

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ قاسم اسے خود سے کبھی الگ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔'' وہ اپنی بات کے سچ ثابت ہونے پر اسے داد طلب نظروں سے دیکھتی مسکرائے چلی جا رہی تھی، ایاز کے چہرے پہ اک سوچ رقم تھی، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ بھی سوچو کہ ورشہ کو وہاں سے رہائی چاہیے یعنی وہ اسے پسند نہیں کرتی۔'' وہ پرزور الفاظ میں بولا۔

الجھ جاتی تھی۔ ”اب وہ یقیناً تمہیں دھمکا رہا ہوگا۔“ خولہ نے ایک گہرا سانس بھر کے پوچھا۔

”کوئی ایسا ویسا۔“ اس نے ابرو اچکائے ”اس کی طرف سے بس ایک فائر کی کسر رہ گئی تھی۔“ وہ سر جھٹک کے ہنسا جیسے قسام کی بے بسی کو انجوائے کر رہا ہو۔

”تو اب تم نے کیا سوچا ہے؟“ وہ اپنی نشست پہ ایک دم سیدھی ہوئی۔

”میں اب کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں، اس سے مما کی ٹینشن بھی ختم ہو جائے گی۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”یعنی؟“ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی خولہ کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ ”یعنی یہ کہ۔“ اس نے گھونٹ، گھونٹ پانی پیتے ہوئے ایک ایسی بات کی کہ خولہ کا چہرہ تاریک ہوا، اسے یاد نہیں کہ وہ کب مائنس ہوئی ہوگی، ایاز بشارت کہہ رہا تھا کہ وہ ورشہ کو پرپوز کرنا چاہتا ہے، وہ شاکڈ ہوئی مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

”یعنی تم قسام کو عدالت سے باہر ہرانا چاہتے ہو۔“ اس کے لہجے میں سادگی تھی، طنز تھا، کیا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی۔

”تم جو بھی سمجھو۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”جب کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے تو ورشہ بھی اچھی لڑکی ہے۔ خالص ہے، صاف شفاف ہے۔“

وہ اس کے بارے میں یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ سے تھی۔ وہ ایک انجان لڑکی کی شناخت کے بارے میں گارنٹی دے رہا تھا تو کیا وہ تکلیف میں مبتلا نہ ہوتی، وہ خولہ کی حالت بھانپ کے ہلکا سا گڑبڑایا۔ اس نے ماتھا چھوا، وہ کافی غلط بول گیا تھا۔ اس نے ایک دم موضوع بدلا۔

”تم بتاؤ، اب تمہارا کیا پلان ہے؟“ اس نے کسی کیفیت کو وجود سے جھٹکتے ہوئے نارمل سے لہجے میں پوچھا، اس مختصر سے سوال میں اس کی آواز کہیں سے تو لڑکھڑائی تھی کہ خولہ کے اندر مچلتی تکلیف یک

”تم میرے ماں باپ کے ٹھکانے کو جانتے ہو، جا کر ان سے پوچھ لو۔“ وہ آنکھوں کی چبھن چھپاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، وہ اسے جتا گئی تھی کہ وہ کبھی بھی اپنی زندگی کے پلان خود سیٹ نہیں کرتی تھی۔

”تم اپنے ساتھ کیا کر رہی ہو خولہ؟“ چند سال پہلے ایاز بشارت کا سرسراتا لہجہ جیسے آج بھی اس کے کان میں گونجتا تھا، اس سے بائیس سال اور کچھ دن پہلے وہ خالص تھی، صاف شفاف تھی۔

اس دن خولہ نے ایاز کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کو مرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد آج اس نے ورشہ کے لیے اس کی آنکھوں میں ویسی ہی پسندیدگی کو دوبارہ جنم لیتے دیکھا تو وہ تڑپ اٹھی تھی۔

☆☆☆

رعنا کو لڑکے والوں کی طرف سے کال آئی تھی۔ ان کی طرف سے ہاں تھی اور وہ دوبارہ آنے کے خواہاں تھے، جانے دل میں کیسی یاسیت تھی کہ رعنا نے یہ خبر ایسے گئے گزرے لہجے میں نشر کی کہ ورشہ نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے انہیں تعجب سے دیکھا۔ وہ تینوں دادی کے کمرے میں تھیں۔

”او ہیلو خاتون! ایسی خوشی کی خبر کیا ایسے نحس انداز میں بیان کرنے کی وجہ بتائیں گی۔“

وہ شولڈر بیگ کے کھلے دہانے میں ہاتھ ڈالے کچھ ڈھونڈ رہی تھی کہ ہاتھ روک کے ابرو چڑھائے۔ اس بات پہ رعنا کے چہرے نے تاثرات بدلے مگر ام میرات کی تسبیح کے دانے تواتر سے گرتے رہے۔

”میں جانتی تھی، مجھے کوئی ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔“ اس کے خوش باش لہجے میں اتراہٹ جھلکی۔ ”بس اب جلدی سے بات پکی کریں اور شادی کی تاریخ رکھیں۔“ وہ اپنے دل کو خاک کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

ام میرات کا ہاتھ کپکپایا۔ کئی دانے ایک ساتھ گرے۔

”جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے، پہلے صلاح

مشورہ ہوگا پھر بات چلی ہوگی۔" رعنا بھابھی اس کی خوش باش آواز سے چڑ کر بولیں۔

"ہاں تو ٹھیک ہے، ہم تینوں ابھی صلاح مشورہ کر لیتے ہیں۔" اس نے گود میں دھرا بیگ سائیڈ پہ رکھا اور پہلو کے بل لیٹی دادی کو کن انکھیوں سے دیکھا۔

"لڑکی! تم سٹھیا تو نہیں گئی ہو؟" رعنا بری طرح بدکیں۔ "یہاں جو فیصلہ بھی ہوگا وہ زرش بی اور قاسم کے صلاح مشورے کے بعد ہی ہوگا۔"

وہ ادھر ادھر کی مصروفیات ترک کرتے ہوئے اس کے پہلو میں آ بیٹھیں، بیگ سے برآمد شدہ ایک مڑا، تڑا سا کاغذ سیدھا کرتے ہوئے ورثہ پیش کرنے کی ضرور مگر خاموش رہی۔

رعنا بھابھی جوابی بات کے جواب میں اس کی طرف سے ایک کھلی جنگ اور کڑوی کسیلی گفتگو کی منتظر تھیں۔ انہیں ورثہ کی خاموشی پہ مایوسی ہوئی، وہ ورثہ تھی، پھر وہ کیسی تابعدار لڑکی کی طرح اس رشتے پہ کیسے راضی بہ رضا تھی۔ رعنا کو ٹوہ لگی، ام میرات جانتی تھیں کہ رعنا ساری عمر یونہی پاس بیٹھ کر اس کا چہرہ ٹٹولتی رہتیں لیکن وہ کبھی ورثہ کی خواہش کو ڈھونڈ نہ پائیں۔

☆☆☆

"کمال ہے، چوکیدار نے گیٹ نہیں کھولا کہ یہ صاحب کا آڈر ہے۔"

"مگر کیوں قاسم یہ سب کیوں کر رہا ہے۔"

دادی اور رعنا اس بات پہ حیران و پریشان تھیں۔ وہ ان کے استفسار پر خاموش رہی، مگر اس نے شولڈر بیگ زمین پہ پٹخا، بالوں سے کچر اتار کر دیوار پہ مارا، اپنی تمام تیاری نوچ کے پھینک دینے کے بعد اس کے سرخ چہرے نے رنگ بدلنا شروع کیا۔

"وہ قانون دان ہے، وہ ایک لیگل نوٹس کو لو لیٹر تو نہیں سمجھا ہوگا۔" اگلے چند سیکنڈز تک اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"تم ذرا فون ملا کے مجھے دو، میں اس سے پوچھتی ہوں کہ بچی نے سہیلی کی شادی پر جانا تھا۔" رعنا اس کی گھنٹہ بھر کی پریڈ کے بعد اس کا راستہ روک کے بولیں۔

بچی نے شادی پر جانا ہوتا تو نمبر ملانے میں متامل نہ ہوتی، اگر ان کی قسام سے بات ہو جاتی تو بھید کھل جاتا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی تھی، وہ نگاہ چراتے ہوئے ان کے پہلو سے نکل کر کمرے میں آ گئی، اب ایسے قسام کا انتظار تھا، وکیل سے رابطہ کرنا بعد کی بات تھی۔

☆☆☆

اس کی آزادی سلب ہوئے تین پہر گزر چکے تھے۔ اب دن ڈھلنے کے قریب تھا۔ جب موسم میں اچانک بدلاؤ آیا، ورنہ جون کی لُو نے ہر منظر کو ملگجا سا رکھا تھا، اب لو زدہ ہوا متوقع بارش کی خوشبو مٹھیوں میں بھر کے گھر گھر بانٹ رہی تھی۔ اس قفس نما دن سے اپنی بے بسی زائل کرنے کی خاطر وہ باہر برآمدے میں چلی آئی۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ وہ تیز اور تلخ آہٹوں کے ساتھ اس کے سامنے آیا۔

"تم مجھ پہ کیس کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟" وہ نوٹس ہوا میں لہرا کے اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت برآمدے کے وسطی ستون کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے پیش قدمی کی۔

"میں یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ تم نے مجھے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور یہ غلط نہیں ہے۔" وہ بے بسی بھرے غصے سے بولی۔

چند لمحے اسے تند نگاہی سے گھورنے کے بعد وہ دبی آواز میں غرایا۔

"دیوار کے ساتھ بیٹھی ہوئی اس لڑکی کے ہاتھ میں پتنگ میں نے اس لیے دی تھی کہ وہ مسکرا سکے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس پتنگ کے ساتھ اڑنا شروع کر دے۔"

اس غراتے ہوئے شخص نے فاصلہ کم کیا تو وہ ستون کے ساتھ لگ گئی۔

"اگر میں تمہیں اس جھوٹ موٹ کے کوہ قاف سے نہ نکالتا تو سوچو تم آج کس مقام پر ہوتیں۔"

شام کی مدھم پڑتی روشنی میں اس کا چہرہ گلی کے نکڑ پہ اس بتی کی طرح بجھا جو اچانک لائٹ کے جانے پر آف ہوئی تھی، جب لائٹ آئی تو وہاں اس عدالتی نوٹس کے پرزے بکھرے پڑے تھے وہ شخص جا چکا تھا۔

''تم بھول رہے ہو کہ تم نے میرے ہاتھ سے پتنگ چھین کر مجھے دیوار کے پاس سے بھی اٹھا دیا تھا۔'' وہ آنکھوں کو سختی سے رگڑتی ہوئی برآمدے کے دوسرے اسٹیپ پہ جیسے ڈھے سی گئی تھی۔

☆☆☆

عجیب حسرت پرواز مجھ میں ہوتی تھی
میں کاپیوں پہ پرندے بنایا کرتا تھا

جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا جب وہ بارش کی جھلتی بوندوں کو آنکھوں سے پونچھتی ہوئی الماری کی طرف آئی، اب وہ الماری کا نچلا خانہ کھول کر اس میں سے وہ فائل نکال رہی تھی جس میں اس کی ڈرائنگز تھیں۔ اس نے فائل میں لگے صفحات الٹنے چاہے مگر وہ سارے صفحات پرزہ پرزہ تھے، اس نے چار سال پہلے وہ تمام صفحات پھاڑ دیے تھے۔

اس دن اس نے جان لیا تھا کہ قسام کو اپنے رشتوں کی محبت، اپنے خاندان کی عزت سب سے بڑھ کر تھی۔ اس نے ورشہ کی زندگی میں جو کچھ ٹھیک کیا تھا، وہ سب ایک جھٹکے میں غلط کر دیا تھا، اس دن اسے لگا کہ قسام نے محبت کی ٹہنی کھول کر ورشہ کو نہیں پھینک دیا تھا۔ آج سے چار سال پہلے اس فائل میں لگی ایک ڈرائنگ پہ وہ رعنا کی گھیردار میکسی کو مٹھیوں میں بھینچ کر گھنٹوں کے حساب سے روئی تھی، آج چار سال بعد اسے ہر صفحہ نئے زاویے سے تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ کمرے کی طرف جاتی راہداری میں تھا جب اسے ڈائننگ ایریا میں ورشہ دکھائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے اس انداز میں بیٹھی تھی کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ نہیں پایا، وہ متعجب ہوا۔ نانو والے جھگڑے کے بعد وہ اسے آج بڑے پورشن میں دکھائی دی تھی وہ بے اختیار ہی اس کی جانب بڑھا کہ راہداری کے وسط میں اس کے بابا کی کال آئی۔

ورشہ نے اس کالنگ ٹون پہ جھٹکا کھا کے سر اٹھایا وہ اپنے باپ کو کال پہ لیتے ہوئے بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ اس کی آنکھوں کی وحشت اور چہرے پہ کھنڈی زردی سے پریشان ہوا۔

''قسام! کیا تم گھر پہنچ چکے ہو؟'' انہوں نے عجلت کے ساتھ گھبرائی آواز میں پوچھا کہ وہ ابھی تو شکارگاہ سے واپس آیا تھا۔ اپنے باپ کو اثبات کی صورت جواب دیتے ہوئے بھی اس کی نگاہ ورشہ پر تھی جو پلک جھپکنے تک اس کے قریب آ چکی تھی۔

''میرے پاس بری خبر ہے مگر باقیوں کی نسبت تمہیں تحمل سے کام لینا ہوگا۔ آج ورشہ بہن کے ساتھ نہیں تھی مگر کالج سے واپسی پر ام میرات کے بھتیجوں نے ورشہ کے مغالطے میں ثمن کو کڈنیپ کر لیا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ میں ان لوگوں سے رابطے میں ہوں۔''

''قسام پہلے میری بات سنو۔'' ورشہ نے اس کے کندھے کو چھوا۔

''میں اپنے طور پر ان سے معاملات طے کر رہا ہوں۔ جبکہ ولید اور تمہارے ماموؤں سے بھی میری بات ہو چکی ہے۔ امید ہے کچھ دیر تک سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن معاملہ سولو ہونے تک تمہیں گھر کا ماحول قابو میں رکھنا ہوگا۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ جبار انکل اور ولید غصے سے پاگل ہو رہے ہیں وہ مجھے ان کے حوالے کر دیں گے۔''

قسام نے فون بند کرتے ہوئے بدحواسی کے عالم میں ماتھا چھوا جو پسینے سے تر ہو رہا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے چکراتے دماغ کے ساتھ اسے بہلایا۔

''ایسا ہی ہوگا۔ بوا نے بتایا ہے کہ وہ چھوٹے پورشن میں، ایسا ہی پلان کر رہے ہیں۔ تم پلیز یہاں

سے مجھے نکال لے جاؤ۔ ہم کچھ دنوں کے لیے نہیں چھپ جاتے ہیں۔'' وہ حواس باختہ سی ہوکر اسے بازو سے کھینچ رہی تھی۔

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ تمہیں جلدی سے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' وہ اپنی جگہ پہ جامد ہوا، وہ جس کیفیت میں تھی تو سوچ سمجھ سے غافل ہوچکی تھی۔

''میں نے کہا نا کہ بابا معاملات کو دیکھ رہے ہیں، وہ سب سنبھال لیں گے۔'' اس نے ورشہ کا ہاتھ جھٹکا اگر اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی تو نرمی بھی نہیں تھی۔

اپنے سامنے زاروقطار روتی ہوئی وہ لڑکی اسے بہت عزیز تھی مگر اس وقت اس کے خاندان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ان ہی لمحات میں لاؤنج کا دروازہ کھلا تو ان دونوں نے زرش بی اور ولید پر ایک متوحش سی نگاہ ڈالی، وہ بے اختیار ہی اس کے کندھے سے لگی ولید اور ماں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا، لٹھے کی طرح سفید پڑتی زرش بی، اور ولید تو جیسے اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھا۔

''قسام! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' ممی نے قریب آنے پر اسے حکم دیا۔ قسام نے ایک ڈوبتی سانس لی اور ساتھ لگی ورشہ کو دیکھا جو پوری کی پوری تاریک پڑ چکی تھی۔

''ابھی بابا سے میری بات ہوئی ہے، کچھ دیر تک سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ شل پڑتے اعصاب کے ساتھ بھی بردباری کا مظاہرہ کررہا تھا۔

''اگر کچھ دیر تک سب ٹھیک ہوجائے گا تو تم تب تک اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو مگر ورشہ ہمارے ساتھ رہے گی۔'' ممی کا سرد ترین لہجہ اور اشتعالی انداز اسے جتا رہا تھا کہ تمہیں اس وقت اس لڑکی کے بجائے ثمن کی فکر کرنی چاہیے، وہ ان سب سے نظریں چراکر بھاری قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''ڈرائیور شدید زخمی ہے، گارڈ کی حالت نازک ہے۔ جانے ثمن کن حالوں میں ہے، ایسی سچویشن میں آپ کا شوہر اور آپ کا بیٹا فرمارہے ہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' ولید بدترین انداز میں پھنکارتا ہوا ورشہ کی جانب بڑھا، وہ ولید کے تیور دیکھ کر قسام کے پیچھے لگی۔

''ولید! مجھے مارڈالے گا پلیز۔'' وہ اس کے کمرے کا دروازہ بند ہونے پہ چلائی۔

''ولید! تم اپنے پورشن میں جاؤ۔ ورشہ میرے پاس رہے گی۔'' زرش بی نے راہداری میں لمبے ڈگ بھرتے ولید کو پشت سے پکڑنا چاہا۔

''میری بہن اغوا ہوچکی ہے آپ کو اس کی فکر کرنی چاہیے یہ لڑکی جائے بھاڑ میں۔''

''قسام! دروازہ کھولو پلیز۔'' وہ اس کے روم کا دروازہ پیٹ رہی تھی۔

''ثمن اس کی وجہ سے مصیبت میں پھنسی ہے اس کے ساتھ جو سلوک ہوگا یہ لڑکی بھی اسی کی مستحق ہوگی۔'' وہ اسے بازو سے پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے راہداری سے دور لے جارہا تھا۔

''ولید! میری بات سنو بچے!'' زرش بی اس کے پیچھے دوڑیں۔ ورشہ کی چیخ وپکار بند دروازے کے ساتھ پشت ٹکائے قسام کی ہڈیاں توڑ رہی تھی۔ اس وقت وہ باہر آجاتا تو ولید اور اس میں سے ایک کی موت یقینی تھی۔ ورشہ کا چلانا، ولید کا اشتعال، زرش بی کی منت سماجت، لاؤنج کا بھاری دروازہ بند ہوتے ساتھ ہی بڑے پورشن میں قبرستان جیسا سناٹا چھا گیا تھا۔

وہ کتنا بجا تھا اور کتنا ختم ہوا تھا۔ فی الحال اس کا اندازہ نہیں تھا مگر اسے اپنے بابا کی کال آنے تک خود کو اور دوسروں کو زندہ رکھنا تھا۔

☆☆☆

مالک صاحب کے پاس تیمور کے قتل کے ٹھوس ثبوت تھے۔ تیمور جب اپنی بچی رعنا کو لینے جارہا تھا تو اس کی اوپر گارڈز کی گاڑیوں کا ایک تیسری گاڑی پیچھا کررہی تھی، جب اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تو تیسری گاڑی میں موجود افراد اس کی مدد تو نہیں کرسکے مگر انہوں

نے اس کل کے تمام ثبوت محفوظ کر لیے تھے تب مالک صاحب نے قتل کی رپورٹ تو درج کروائی تھی مگر اس کیس کی پیروی کرنے کے بجائے اسے کلی طور پر قانون کے سپرد کر دیا تھا۔ خون بہایا جا چکا تھا، اب انہیں عدالت میں گھسیٹ کر سزا دلوانا ورثہ کے مستقبل کو بھی بدلے کی آگ میں جھونکنے کے مترادف تھا لیکن مالک نے وہ ثبوت اور ویڈیوز کسی ایسی ہی سچویشن کے خدشات کے تحت محفوظ رکھی ہوئی تھیں ان ہی ثبوت و شواہد کی بنا پر ورثہ کا حصول بھلاتے ہوئے اپنی جان بچانے کی، کی تھی اس لیے چند گھنٹوں بعد کچھ شرائط پر ان سے معاملات طے پا گئے جس کے مطابق ان سے حلفیہ بیان لیا گیا۔ معاہدہ کیا گیا کہ ان کا بدلہ پورا ہو چکا ہے اب تا عمر انہیں ہمایوں کی پوتی سے کسی کینہ، کسی بدلے کا کوئی حق نہیں تھا بصورت دیگر قتل کا وہ کیس دوبارہ اوپن ہوتا ان لوگوں کا بچنا ناممکن ہی تھا۔

☆☆☆

ثمن کے اغوا کی خبر پاتے ہی ان کا پورا خاندان وہاں جمع ہو گیا تھا، ان سب کو مالک سے یہی گلہ تھا کہ انہیں اس لڑکی کو وارثوں کے سپرد کر کے یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے تھا۔

ورثہ سمیت باقی سب پر بھی یہ بھید اسی روز کھلا کہ تیمور کی موت ایکسیڈنٹ میں نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا، اس خبر کے بعد ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس فیملی کو گیسٹ ہاؤس سے اٹھا کر کسی سڑک پہ پھینک دیا جاتا، وہ ذلت جو ورثہ نے اس پورے خاندان کے سامنے اٹھائی اور جن الفاظ میں ان کی تضحیک کی گئی تھی تو ممکن تھا کہ وہ اس رات خودکشی کر لیتی یا پھر وہ اس بنگلے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیتی، مگر مالک صاحب کے وہاں آتے ہی منظر بدل گیا وہ سہ پہر کا وقت تھا جب ثمن گھر آئی تھی وہ بالکل ٹھیک تھی۔ اس کے ماتھے پہ بس چوٹ کا ہلکا سا نشان تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب اسے ولید کے کمرے سے رہائی ملی۔ اس گھر میں مالک دیوان وہ پہلے فرد تھے جو اس کی حالت پہ شاکڈ رہ گئے انہوں نے ولید اور فاخرہ کو غضب ناکی سے دیکھا۔

''کیا تم بھول گئے تھے کہ اس خاندان میں پناہ لینے والوں کی حفاظت کی جاتی ہے، انہیں بے عزت نہیں کیا جاتا۔''

''اب یہ فیملی ہماری برداشت سے باہر ہے تایا ابو!'' ولید جب بولا تو اس کی آواز نیچی نہیں تھی۔

''جن کے لیے تیمور کی فیملی ناقابل برداشت ہے، وہ اس بنگلے سے کہیں بھی شفٹ کر سکتے ہیں۔''

اس جواب نے ولید کے منہ پہ گویا تھپڑ مارا تھا اور یہی وہ بات تھی جس نے ورثہ کے کچھ زخموں پہ مرہم رکھا اور یہی بات تھی جس نے دیوان فیملی کی نگاہ میں ورثہ کے خلاف نفرت کو ہوا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس رات اس نے خودکشی کی کوشش کی اور نہ ہی وہ مالک صاحب کی زندگی میں دیوان ہاؤس کو چھوڑنے کی کبھی ہمت پکڑ سکی۔

☆☆☆

وہ واقعی اسٹوپڈ تھی کہ سادہ کاغذوں پر زندگی اتار کے پھر اسے ہی زندگی سمجھتی تھی۔ زندگی تو کچھ اور شے تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے چہرے پر موجود ناخنوں اور تھپڑوں کے نشانات دیکھتے ہوئے اپنا رخ موڑا، نہ ہی آنکھ جھپکی۔

جب ولید اسے چھوٹے پورشن میں لے آیا تو فاخرہ اسے دیکھتے ہی اس پہ جھپٹی تھی۔

''اگر گارڈ اور ڈرائیور بری طرح زخمی ہیں تو پھر میری بیٹی بھی زخمی ہوئی ہوگی۔'' اس نے کس قدر وحشت سے اس کا چہرہ نوچا تھا اگر زرش بی درمیان میں نہ آتیں اور ولید اسے کمرے میں لاک نہ کرتا تو شاید فاخرہ اسے مار ہی ڈالتی۔

اپنے چہرے کو یک ٹک تکتی ورثہ کو آئینے میں دوسرا چہرہ دکھائی دیا، یہ رعنا تھیں جن کے ہاتھ میں کوئی مرہم تھا مگر زخمی ورثہ کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ مرہم ہاتھ میں لیے کھڑی رہ گئیں۔

''کیا یہ زخم مرہم سے بھرنے والے تھے؟''

دیا اس کا ہر زخم نئے سرے سے کھلا وہ ایک دم پلٹی، اس کا سارا خون چہرے پہ جھلکا۔

''ام میرات! تم نے ساری عمر اپنے بھائی کی موت کا سوگ منایا۔ کبھی میرے دادا اور میرے باپ سے سیدھے منہ بات نہ کی، حالانکہ تمہارے بھائی کو میرے دادا نے نہیں مارا تھا۔ مگر رعنا بھابھی سے پوچھ لو، یہ اس دن تیمور خان کے ساتھ ہی تھیں کہ میرے بابا کو گولی تمہارے بھائی کے ہاتھوں لگی تھی، حساب اسی دن برابر ہوگیا تھا اب تمہارے خاندان کو ورثہ تیمور کس حساب میں چاہیے؟'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کے بولی تو ام میرات تھرا کے رہ گئیں۔

رعنا بھابھی کی حالت بھی غیر ہوئی۔ گویا آج ورثہ نے باپ کی موت کا بھید پالیا تھا۔

''جواب دو ام میرات! انہیں ورثہ کس حساب میں چاہیے؟'' اس نے اپنی بات کڑک کے دہرائی۔

سامنے کھڑی ام میرات کی نظریں ویران اور زبان گنگ تھی حساب تو برابر ہوگیا تھا مگر ان ضدی قبیلوں کو عورت کے بدلے عورت چاہیے ہوتی ہے، وہ بھی کڑک کے کہنا چاہتی تھیں مگر کہہ نہ سکیں وہ بوڑھی ہوگئی تھیں مگر آج بھی اندر کہیں خلش، پچھتاوا اور ملال جوان تھے اور یہی وہ موڑ تھا جس پہ ورثہ ام میرات سے کوسوں دور ہوئی کہ کبھی قریب نہ آسکی۔

☆☆☆

وہ فوری طور پر اس تکلیف کا تجزیہ نہیں کرسکا تھا مگر جب رات ہوئی تو دل نے، جسم نے درد اگلنا شروع کردیا تھا۔ وہ کراہ، کراہ کے رہ گیا، کیا ضروری تھا کہ یہ سب آج ہی ہوتا، کاش وہ آج شکارگاہ سے واپس ہی نہ آتا، کاش وہ ابھی ملک سے باہر ہی ہوتا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز ختم ہو چکی ہے۔ وہ پہلے ہی اس سے ناراض تھی۔

اسے البانیہ سے آئے چوتھا روز تھا اور وہ چند گھڑیوں کو بھی گیسٹ ہاؤس نہیں جا سکتا تھا، اس کی سیاسی ڈنر ارینج کر رکھا تھا تو وہ واپسی کے بعد صرف چند گھنٹوں کے لیے بنگلے پہ رکا تھا۔

''ان چند گھنٹوں میں سے تم پندرہ منٹ گیسٹ ہاؤس میں بھی آسکتے تھے۔''

جب شکارگاہ جاتے ہوئے وہ راستے میں اسے بار، بار کال کر رہا تھا تو کوئی دسویں بار اس کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد ورثہ نے اسے میسج کیا تھا۔ وہ اس سے ہمیشہ اس بات پہ ناراض ہوتی تھی کہ تم اپنی فیملی کو مجھ پہ فوقیت دیتے ہو اور وہ ہر پارٹی میں سر ہلاتا رہ جاتا تھا پھر رات گئے قسام نے اسے کچھ فوٹو گراف سینڈ کی تھیں وہ خوب صورت ترین ساحل تھے۔

''تم کچھ دیر کے لیے یہاں آسکتی ہو؟'' وہ جب اس سے خفا ہوتی تھی تو وہ اسے یونہی پکارتا تھا، کبھی بہت بلند ترین عمارتوں کے جھروکے سینڈ کرتا، کبھی قدیم قلعوں کی وہ سرخ سیڑھیاں جن کے اوپری زینے پہ جانے کون سے پراسرار دروازے کھلتے تھے کبھی سبزہ زار طرز کے وہ مشکل راستے جن پہ لکھا ہوتا تھا، یہ شاہراہ عام نہیں۔ ورثہ ہمیشہ وہ فوٹو گراف سین کرتے ہی اسے کال پہ لیتی۔

''میں پلک نہیں جھپک سکی۔ تم یہ سب کہاں سے سرچ کرتے ہو۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پکارنے پہ ان بلند ترین جھروکوں میں، ان سرخ سیڑھیوں کی اوپری زینے پر اور وہ شاہراہ جو عام نہیں ہوتی تھی وہاں بھی آجاتی تھی، صوفے پہ آڑے ترچھے لیٹے ہوئے قسام نے فون اٹھایا اور اس کا میسج کھولا، ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ان ساحلوں کے فوٹو گراف دیکھنے کے بعد اس نے قسام کو کال نہیں کی تھی اس نے اس میسج کے جواب میں ایک نظم سینڈ کی تھی۔

سنو کب ساتھ دیتا ہے
یہ نیلا بے وفا پانی
تمہارے جیسا ہے بالکل
جو کشتی چھوڑ دوں

اور اس کے دامن سے لپٹ جاؤں
بدن سے سانس کا رشتہ
لمحوں میں توڑ دیتا ہے
تمہارے جیسا ہے بالکل
جو اس کا ہاتھ تھاموں تو
بھنور میں چھوڑ دیتا ہے
یہ نیلا بے وفا پانی
تمہارے جیسا ہے بالکل

چار روز پہلے اس نظم کو پڑھنے کے بعد وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ آج وہ اسے پڑھنے کے بعد سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا، اسے کیوں لگ رہا تھا کہ وہ اس کے بلانے پر جو شاہراہ عام نہیں ہوتی تھی وہاں بھی آجاتی تھی اب کبھی سیدھے راستوں پر بھی اس سے نہیں ملے گی۔

☆☆☆

خولہ نے ایک بات کی تھی۔ اس کی بات پہ ورشہ نے اسے کرنٹ کھا کے دیکھا۔

"کیا وہ خولہ سے ہر بات شیئر کرتا تھا؟" کچھ دیر پہلے خولہ اس سے اس نوٹس کی پیش رفت کے متعلق بات کر رہی تھی اور ورشہ اسے بتا رہی تھی کہ شاید آج اسی نوٹس کی وجہ سے اس کا راستہ نہیں روکا گیا دوسری بہت ساری باتوں کے دوران بھی انہوں نے ایاز کا ذکر نہیں چھیڑا تھا۔

"کیا ایاز نے تمہیں پرپوز کیا ہے؟" اس کے اس اچانک استفسار پہ وہ خولہ کے چہرے پہ چھائے تاثرات سے الجھی، وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ارد گرد بچھی کرسیوں پر ہنستے مسکراتے لوگوں کو بددلی سے دیکھ رہی تھی۔

"ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے صرف دو ماہ کا عرصہ گزرا ہے جبکہ میں اگلے چند سالوں تک بھی ایاز بشارت سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔" جب خولہ اس کی خاموشی سے مایوس ہو چلی تھی تو وہ دھیرے سے بولی۔

وہ قسام سے ہر صورت جدائی چاہتی تھی مگر وہ ایاز سے شادی کر کے قسام کو جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

"لیکن میں اس کے پرپوزل کی وجہ سمجھ سکتی ہوں۔" ورشہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کوئی آپ کو پرپوز کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے، وہ آپ کو پسند کرتا ہے۔" فیڈ کوٹے ہوئے لہجے میں کسی ملال میں گھر کے بولی تھی کہ ورشہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ضروری نہیں کہ ہر پرپوزل کے پیچھے پسندیدگی چھپی ہو مگر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میری تمام پراپرٹی میری دادی کے نام ہے، اب اتنا تو وہ جانتا ہی ہے کہ وہ پراپرٹی مجھے کب ٹرانسفر ہوگی۔"

خولہ کو اس کی سوچ پہ غصہ آیا۔ "کانٹنڈ یور انفارمیشن ایاز کوئی بھوکا ننگا نہیں ہے۔" اس کے ماتھے پہ تیکھی سلوٹ ابھری، ورشہ نے جیسے اس کے غصے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

"میں نے تو اس سے یہ بھی کہا کہ اگر اس نے مجھے قسام کی ضد میں آ کر پرپوز کیا ہے تو مجھے اس کے اس فیصلے پہ افسوس ہے۔"

"بخدا ایسا کچھ نہیں ہے ورشہ!" خولہ نے تیزی سے وضاحت دیتے ہوئے اسے تاسف کے ساتھ دیکھا۔

"تو پھر وہ مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتا ہے؟" اس کی آواز اونچی ہوئی۔ خولہ جانتی تھی کہ اس میں برداشت کی کمی ہے۔

"وہ واقعی تمہیں پسند کرتا ہے، لہٰذا تم اس پرپوزل پہ غور کر سکتی ہو۔" وہ آنکھوں میں چمکتی نمی کے ساتھ عادتاً مسکرائی۔

"اور میں جانے کب غور کروں۔" اس کے لہجے میں استہزاء تھا۔ "اتنا وقت کس کے پاس ہوتا ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے اور پھر اس کے جواب کے انتظار میں عمر گزار دے۔" اس نے ازلی بے نیازی سے شانوں کو جھٹکا۔

خولہ پہ اس کی بے نیازی نے ستم ڈھایا۔

قسام کے پاس ہوتا ہے۔

وہ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی، ایاز نے کبھی بھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا جیسے ورثہ کبھی قسام سے محبت کا اعتراف نہیں کرتی تھی پھر بھی اسے اتنا یقین کیوں تھا کہ خولہ عباس اور قسام مالک کی محبت یک طرفہ نہیں تھی۔

☆☆☆

''میرا ارادہ تو یہی ہے کہ منگنی کے فنکشن پر شادی کی ڈیٹ بھی فکس کرلیں گے۔''

فاخرہ نے مہمانوں کی لسٹ چیک کرتے ہوئے جیسے بڑی بہن سے مشورہ کیا تو زرش بی نے خوش گواری سے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔ اس وقت فاخرہ نے چھوٹے پورشن میں ایجنٹ سے متعلق باہمی مشاورت کے لیے بالخصوص ولید کے کہنے پر قسام اور زرش بی کو شام کی چائے پر مدعو کر رکھا تھا، چائے کا اہتمام لان میں کیا گیا تھا گو ولید کو ماں کی یہ پیشکش بڑی خوش کن محسوس ہوئی مگر وہ ثمن کے متعلق بھی ان ماں بیٹے سے دوٹوک فیصلہ چاہتا تھا۔

اس نے قسام کو کن انکھیوں سے دیکھا جو اپنے موبائل پر ایک سیاسی ٹاک دیکھ رہا تھا۔

''فی الحال میں منگنی پر ہی خوش ہوں۔ یہ شادی کا پروگرام بھی بعد پر اٹھا رکھیں گے اور یہ منگنی شادی کی بات صرف میرے بارے میں ہی ہو رہی ہے، قسام مجھ سے بڑا ہے۔ آپ لوگ اسے کس وجہ سے مہلت دے رہے ہیں۔''

ولید نے مسکراتے ہوئے ان کی توجہ اس کی جانب مبذول کروائی تو فاخرہ اور زرش بی کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرتی ثمن نے بھی بے ساختہ قسام کو دیکھا۔ جس نے چہرہ اٹھا کر ولید پر ایک تیز نظر ڈالی۔

''ذرا الیکشن سے فارغ ہولوں پھر منگنی کے بجائے ڈائریکٹ شادی کرنے کا پروگرام ہے۔''

اس کے اطمینان بھرے جواب نے ولید

ولید نے اضطراری کیفیت میں رخ موڑ کے زرش بی کی طرف دیکھا جو ساکن تاثرات کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کچھ رشتے دوسرے کنارے کی طرح ہوتے ہیں، ان کا وجود نہیں ہوتا مگر انہیں جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ انہیں خواہش سے باندھ لیا جائے تو پہلے کنارے پر کھڑے کھڑے عمریں بیت جاتی ہیں۔

☆☆☆

ورشہ اندر داخل ہوئی تو رعنا بھابھی سامنے ہی بیٹھی تھیں۔

آج یشا کی بات پکی ہوئی تھی اس وجہ سے آج اس سے ٹریٹ لی گئی تھی وہ رعنا سے گیارہ بجے تک کا کہہ کے گئی تھی مگر اب ٹائم خاصا اوپر جاچکا تھا۔ اسے رعنا کے انداز جز بز کررہے تھے مگر وہ ازلی ڈھیٹ تھی سو منہ پھلاتے ہوئے آگے آئی۔

''وہ لوگ بھی تو ہیں جو گھر آتے ہیں تو ان کا استقبال مسکرا کے کیا جاتا ہے۔'' اس نے ہینڈ بیگ صوفے پر اچھالتے ہوئے خود کو گھورتی رعنا سے شکوہ کیا۔

''آپ بھی تو کل ولید کی منگنی سے لیٹ آئی تھیں تو کیا میں نے آپ کو یوں گھورا تھا۔'' وہ ان کی غیر معمولی سنجیدگی سے یونہی چڑ جاتی تھی۔

''ویسے لوگوں کی ایک وہ قسم بھی ہے جو گھر میں آئیں تو گھر والے سہم جاتے ہیں۔''

جب رعنا کی نگاہ کا ارتکاز برقرار رہا تو ورشہ نے بات بدلتے ہوئے منہ بنایا پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

''آج زرش بی آئی تھیں۔'' رعنا کی سرسراتی آواز پر وہ ان ہی قدموں پر رکی۔ رعنا بھابھی گھوم کے اس کے سامنے آئیں۔

''ہم تو تمہیں کسی قابل نہیں لگتیں مگر تمہیں ان شریف لوگوں کا تو خیال کرنا چاہیے تھا، آخر کس قصور پر تم اپنے محسنوں کو عدالت تک لے جانا چاہتی ہو۔''

''ماں کو بھیجنے کے بجائے وہ خود آتا تو میں آپ ہتھے سے اکھڑی۔

''ماں کو اس نے نہیں بھیجا، زرش بی کو اس خبر کی بھنک کہیں اور سے ملی۔ سوچو جب یہ خبر پھیلے گی تو لوگ ہمارے منہ پر تھوتھو کریں گے۔''

وہ اس بات پر مشتعل ہوئی، یعنی ہر بار لوگ ان ہی کا منہ نوچا کریں گے۔

''مجھے تم سے اس نادانی کی توقع نہیں تھی۔ تم نے کون سا یہاں عمر قید کاٹنی تھی اور اس نے تمہیں کون سے زندان میں ڈالا ہوا ہے۔''

''یہاں عمر قید ہی کاٹنی تھی بھابھی! اس لیے کیس کرنا پڑا کہ وہ مجھے شادی کرنے کی بھی اجازت نہیں دے رہا تھا۔'' وہ دو قدم آگے کو ہو کر پھنکار کے بولی۔ اس کا لہجہ زیادہ سرد تھا یا اس کی آنکھیں۔ رعنا ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں لگا پائی تھیں۔

☆☆☆

مالک صاحب کے بعد اس فیملی کے کسی فرد کے لیے ورشہ کے پاس کچھ بچا تھا تو وہ زرش بی کا احترام اور لحاظ تھا یہی وجہ تھی کہ کل کی پوری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد وہ اپنے ارادوں کے متعلق انہیں صاف آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت وہ بنگلے میں زرش بی کے ساتھ بیٹھی تھی۔

اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تھا۔ وہ ندامت تھی نہ ملال تھا مگر زرش بی سمجھ رہی تھیں کہ اس کے چہرے پر ایک فیصلہ بول رہا تھا جیسے قسام کے بعد آج وہ اس گھر کی مالکہ کو بھی کیسری پھول واپس کرنے آئی ہو۔

اسے بات کرنے کی جلدی تھی مگر انتظار کا دورانیہ بڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہاں ایک مہمان خاتون موجود تھی جو گفتگو کا سلسلہ ٹوٹنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔

''میں تو یہاں خوش تھی اور شکار گاہ تو جسے میرے خوابوں کا نگر تھا مگر آپ تو جانتی ہیں کہ میرے شوہر پر کینیڈا جانے کا بھوت سوار تھا لیکن سچ کہوں تو

مجھے اپنے اس پرانے ملک میں کسی دیوان صاحب کی شکارگاہ جیسی خوب صورتی کہیں نظر نہ آئی۔"

ان خاتون کی گفتگو کا سلسلہ ولید کی آمد سے ٹوٹا وہ آگے آیا تو ورثہ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے نے رنگ بدلا۔ وہ ان مہمان خاتون سے مل کر جس طرح ان کا حال احوال پوچھ رہا تھا تو صاف ظاہر تھا کہ وہ وہاں ان ہی سے ملنے آیا ہے۔"

"منگنی بہت مبارک ہو ولید میاں! مگر سچ کہوں۔ مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر تمہارا رشتہ اپنے خاندان میں طے ہوتا۔" وہ محبت اور شکوے سے لبریز آواز میں بولیں۔

ورثہ اب زرش بی سے اجازت لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جہاں میرا رشتہ طے ہوا ہے۔ وہ بھی بڑا نامور خاندان ہے۔ افسوس آپ نے میری منگنی کا فنکشن مس کر دیا ورنہ آپ دیکھتیں کہ جب ہم عزت دار اور خاندانی لوگوں میں رشتہ طے کرتے ہیں تو کسی دیوار پر تصویر ٹانک کر نہیں کرتے بلکہ پروٹوکول کے ساتھ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں کرتے ہیں۔"

سٹنگ ایریا کے کوریڈور سے آگے بڑھتے قسام نے اس بات پر ورثہ کو ایک جھٹکے سے رکتے دیکھا۔ وہ ایک تکلیف کے عالم میں رکی تھی جیسے اس کی پشت پر کسی نے بھاری پتھر سے وار کیا تھا لوک داستان جیسی شہرت رکھتی اس تصویر میں اگر وہ لڑکی سسی تھی تو اس لمحے وہ زمین میں گڑ کر مر گئی تھی۔

☆☆☆

"میں وہاں اسی مہمان کی موجودگی کا لحاظ کر گیا ورنہ تمہاری اس بکواس پر تمہارا منہ توڑ دیتا۔" وہ ولید کے پیچھے ہی چھوٹے پورشن میں آیا تھا۔ وہ جس طرح خونی نگاہوں کے ساتھ ولید کی طرف لپکا تو فاخرہ اڑتے حواسوں کے ساتھ بیچ میں آئی۔

"جانتا ہوں کہ تم اس لڑکی کے لیے ہم سب کو جان سے بھی مار سکتے ہو مگر قسام مالک! ایک بات یاد رکھنا، تم دیوان فیملی کے ولی عہد ہو جو ہمارے علاقے کے پچھلے [illegible] ہے۔ ہمارا خاندان تمہیں اس سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتا، پہلے وہ تم سے جواب مانگیں گے ہمایوں کون تھا اس کی بیک کیا تھی۔ وہ کس وجہ سے قبیلہ بدر ہوئے تھے۔"

ولید مسکرایا۔

"شادی میرا ذاتی معاملہ ہے، لہٰذا کسی کو گڑے مردے اکھاڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

فاخرہ جو زرش بی کو کال کرنے کے بعد ان کی گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی وہ ایکدم ان کے قریب آئی اور قسام کی طرف دیکھا۔

"لیکن ہمارا خاندان گڑے مردے اکھاڑے گا۔ کیونکہ ہمارے ہاں رواج ہے، رشتہ طے ہوتے وقت لڑکی کے خاندان کے گڑے مردے اکھاڑے جاتے ہیں۔"

فاخرہ کے طنزیہ لہجے میں ایک کھلم کھلا تنفر تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ کئی سالوں سے وہ لڑکی ان کے چین وسکون کے لیے دیمک ثابت ہو رہی تھی۔ وہ شخص جو قبیلوں کے فیصلے کرتے ہوئے انہیں اعلا ظرفی کا درس دیتا تو کیا وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ان فرسودہ رسم ورواج کی نذر کر سکتا تھا۔ وہ لاپروائی سے دروازے کی جانب مڑا تو ہلکا سا گڑبڑایا کہ سامنے زرش بی کھڑی تھیں حسب عادت سپاٹ تاثر کے ساتھ بیٹے کو نظر انداز کرتی ہوئی وہ فاخرہ کی طرف آئیں اس نے بہن کو ملامتی نگاہ سے دیکھا۔

"تم لوگوں کو کسی کے ماضی میں جھانکنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ورثہ اس گھر سے اپنا ماضی اور حال سمیٹ کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔"

گو اس لمحے ان کا بیٹا پتھرا کے رہ گیا تھا یا کانچ کی طرح ٹوٹا تھا مگر اس لمحے زرش بی کی مضبوط آواز نے ورثہ کو اس سارے تماشے سے نکال کر معتبر کر دیا تھا۔

☆☆☆

پچھلے ایک ہفتہ سے وہ رونا دھونا وہ بھوک

ہر ناں، وہ پاس پن جیسے وہ تمام کیفیات ایک لباس کی طرح اتار کر اب پرسکون ہو چکی تھی۔ لگتا تھا اس نے کوئی بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب ام میرات اسے تکتی رہتیں جیسے اس کی ماں اسے گھنٹوں تکتی تھی۔

"تیری پیدائش کے ایک ہفتے بعد تیری ماں اس دنیا سے چلی گئی تھی پھر میں نے تجھے ماں بن کر پالا۔" وہ اس کے پاس آتیں اور یہ بات سوچتی رہ جاتیں۔

وہ یہ بات کس منہ سے کرتیں انہوں نے خود تو اس ماں کی لاج نہ رکھی جس نے اسے پیدا کیا تھا۔ وہ بے چین ہوتیں، روتی رہتیں تب ماں کہتی، رشتہ ٹوٹ گیا ہے اب تو اس کو بھلا دے۔"

ام میرات کی تو منگنی ٹوٹی تھی مگر اس کی پوتی نے وہ ایک ہفتہ جس اذیت میں گزارا تھا تو لگتا تھا اس کا بھی کوئی گہرا رشتہ ختم ہوا ہے۔ وہ اس کی سرخ سوجی آنکھوں کو دیکھ کے دن میں کئی بار یہ کہنے کی ہمت کرتیں "جب رشتہ ختم ہی کر لیا ہے۔ تو اب سب کچھ بھلا دے ورثہ!"

جب ام میرات خاموش ہو گئی تھی تو ماں آتے جاتے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتی۔

"کیا تم اس کو یاد کر رہی ہو۔"

"اماں! دس سال منگنی رہی ہے، اگلے دس سال تو اسے یاد کروں گی نا۔" سترہ سالہ ام میرات ایسے مسکراتی کہ اس کی ماں کو رونا آ جاتا۔

"پتا نہیں تو نے کیا فیصلہ کیا ہے، میرا دل تھا کہ تو یہیں اسی بنگلے میں میرے آس پاس زندگی گزارتی۔"

آج انہوں نے اپنی پوتی سے جیسے آخری التجا کی تھی جواب میں وہ یوں مسکرائی کہ ام میرات کو رونے کا بہانا مل گیا۔ آہ..... اس نے یہ بات کس منہ سے کی تھی۔ اس کی ماں کا یہ قصور تھا کہ اس نے ام میرات کو پیدا کیا تھا ماں جو اس کے رونے دھونے پر تڑپ اٹھتی تھی۔ اس کے جدا ہونے پر پتا نہیں اس نے کیا کیا ہوگا۔

اس سسکتی ہوئی بوڑھی عورت نے ایک جان لیوا آہ بھری، اس کے سامنے بیٹھی ورثہ نے بھی بالکل ویسی ہی آہ بھری۔ کیا وہ اندھیرے میں بیٹھ کر ان روشن ناموں کو تکتی رہتی۔ وہ اتنی بے بس نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایاز بشارت کا نمبر ملا رہی تھی مگر انسان بے بس ہی ہوتا ہے کہ جس کو جہاں رہنا ہوتا ہے۔ وہ جگہ اس کے لیے اللہ کی طرف سے مقرر ہوتی ہے۔

☆☆☆

بنگلے کے بیرونی گیٹ سے نکلتی ہوئی گاڑی سڑک تک پہنچی ہی تھی کہ اس کے فون پر ایاز کی کال آئی۔ ان کے درمیان صرف پانچ منٹ بات چیت ہوئی اس کے بعد وہ اردگرد سے بے نیاز ہو کر فون پر چہرہ جھکائے میسجز دیکھنے لگی۔

جب گاڑی مرکزی شاہراہ پر پہنچی تو ڈرائیور نے اچانک بریک لگائے کچھ دیر بعد جب ڈرائیونگ ڈور کھلا تو اس نے ایک خوشبو محسوس کرتے ہی چونک کے سر اٹھایا پھر اس نے شاک کے عالم میں اسے دیکھا جو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے گاڑی آگے بڑھا رہا تھا، وہ حواس کے ساتھ ساکت سی بیٹھی اسے دیکھے جا رہی تھی گاڑی جب مرکزی سڑک چھوڑ کر مصروف شاہراہ پر آئی تو وہ جیسے حواسوں میں لوٹی۔

"قسام! تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔"

اس نے زرد چہرے کے ساتھ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، وہ اس کی بات نظر انداز کرتا ہوا تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔ اگلے ہی پل اس کے فون پر کالنگ ٹون بجی، بس چند سیکنڈز کی غفلت تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے فون اچکتے ہوئے ایاز کی کال پک کر چکا تھا۔

"ورثہ! کیا آپ ٹریفک میں پھنس چکی ہیں۔ اب تک آپ کو آ جانا چاہیے تھا۔" قسام کی سماعتوں میں بجلی کڑکی تھی۔

وہ دوسری طرف ہیلو ہیلو کر رہا تھا..... گویا قسام کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ اسی سے ملنے جا رہی تھی۔ فون کے آف ہوتے ہی گاڑی کی رفتار میں تبدیلی آئی۔ اس نے سڑک کنارے بریک لگاتے ہوئے پلٹ کے اسے دیکھا۔

اور وہ لڑکی سوچ رہی تھی کہ اب اس سے آگے کیا ہوگا۔

☆☆☆

اس سے آگے یہ ہوا کہ بقول ولید کے جو رشتہ اس نے دیوار پر تصویر لگا کے جوڑا تھا، اگلے چند دنوں تک ایاز سے ورثہ کا رشتہ بطے ہونے کی صورت وہ خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔ اب کہانی ختم کرنے والا حیران تھا۔ متوحش تھا، ڈسٹرب تھا۔

لیکن یہ تو طے تھا کہ گیلی مٹی میں صحرا بونے والی اس لڑکی کے لیے وہ قبر تو کھود سکتا تھا مگر اسے کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جس جذباتی تباہی سے گزر رہا تھا تو جانے کیا کر گزرتا اس شام ولید کی آمد اور اس کی باتوں نے قسام کو اس جنگل میں دھکیلا، جہاں راستہ بھولی ہوئی ایک شہزادی سے ایک سوداگر کو محبت ہو گئی تھی اس شام پہلی بار بنا دستک کے جب ممی نے اس کے کمرے کا دروازہ غصے کے ساتھ دھکیلا تو ولید بھی ان کے ساتھ تھا۔

انتہائی شدید تاثرات کے ساتھ ممی کے کندھے سے لگ کے کھڑا اسے زہریلی نظروں سے دیکھتا ہوا۔ کمرے کے وسط میں انتہائی ضبط کے ساتھ کھڑا قسام جیسے ان کی آمد کا سبب جانتا تھا۔

''تم آج ایاز بشارت سے ملے تھے؟'' ممی نے سخت لہجے میں پوچھا تو اس نے آنکھ چرائی۔ زرش بی للھے کی مانند ہو میں گویا یہ سمجھ تھا کہ وہ جو کر رہا ہے یہ اس پر سوٹ نہیں کرتا تھا۔

''وہ آج میرے آفس میں آیا تھا۔ وہ میرے دوستوں اور میرے سسر کے سامنے صرف تمہاری دھمکیوں سے متعلق بات کرتا تو مجھے قطعاً پروا نہیں تھی مگر اس نے جب تمہارے خلاف ورثہ کے دائر کردہ کیس سے متعلق بات کی تو میں شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ میرے دوست، میرا سسر کیا سوچتا ہوگا کہ تم ایک ایسی لڑکی کے لیے اس کی جان لینا چاہتے ہو۔ جس نے آل ریڈی تم پر جس بے جا کا کیس کر رکھا تھا

[illegible] سیکھا۔'' گاڑی میں چھائی خاموشی کو توڑتی ''تم نے یہ سبق بھی سیکھا جو تم نے مجھے سکھایا۔'' وہ بھی بے نیازی کے عالم میں ہنسی۔

''میں نے تمہیں بے وفائی کا سبق نہیں سکھایا تھا۔'' وہ اس کی بات پر بھڑکا۔

''تم نے مجھے یہ سبق سکھایا تھا قسام!'' وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔ ''ایک اسی سبق میں تو میں تم پر بازی لے گئی۔'' اس کی آنکھوں میں پانی امڈا تو وہ گردن گھما کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

''وہ بے وفائی نہیں تھی۔ وہ میری بدقسمتی تھی۔'' اس نے اپنا دفاع مضبوط آواز میں کیا۔ اگر وہ بدقسمتی تو بدقسمتی کا یہ اعتراف ہی اس شخص کا عشق تھا ورنہ اس دن کون سی نعمت تھی جو اس شخص سے چھینی گئی تھی وہ کون سا عہدہ تھا جس سے وہ برخاست ہوا تھا۔

''تم مجھے جو بھی سمجھو مگر یہ طے ہے کہ اب میں تمہاری وجہ سے اپنی مزید انسلٹ افورڈ نہیں کر سکتی۔'' وہ ترخ کے بولی۔

''تمہارے ساتھ جو بھی برا ہوتا ہے، وہ میری وجہ سے نہیں ہوتا۔ تمہارے اس افیئر کو میں اب تک صرف دادی کی وجہ سے ٹالتا رہا ہوں مگر آج میں تمہیں آخری بار وارن کر رہا ہوں اگر آئندہ تم اس شخص سے ملیں تو میں تمہیں کسی ایسی جگہ رکھوں گا جہاں عمر بھر میرے سوا تم کسی دوسری شکل کو ترس جاؤ گی۔'' اس کے لہجے میں ایسا قطعی پن تھا کہ لفظ افیئر یہ تلملاتی ہوئی اس لڑکی کو قسام کی اس دھمکی نے مزید بپھایا۔

''ورنہ تم کیا کر لو گے؟'' اس نے خشک ترین لہجے میں پوچھا۔

''میں اپنے اور تمہارے لیے ایک ہی قبر کھودوں گا۔'' اس نے اس سے بھی زیادہ روکھے پن سے جواب دیا۔ وہ اپنی طرف سے کہانی ختم کر چکا تھا

وحید کے سرد انداز میں حیرت سے زیادہ تذلیل تھی کہ قسام کے چہرے پر سرخی چھائی۔

"میں یہاں تمہیں ممی کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم میرے معاملات سے دور رہو۔" اس کی تمام گفتگو کا جواب اس نے ایک دھاڑ کی صورت دیا۔

"ایک بات تم بھی ذہن نشین کرلو، تم اس معاملے میں اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ نہ پہلے نہ اب، نہ آئندہ کبھی۔ ورشہ دیوان فیملی کی بہو بننے کے لائق ہی نہیں۔ اور اب تو ایسا سوچنا بھی مت ورنہ۔" وہ جملہ مکمل کیے بغیر لب بھینچ گیا۔ شاید اسے زرش بی کا خیال مانع تھا۔

"ورنہ کیا.....؟" قسام نے تیوری چڑھائی۔

"تم الیکشن میں مجھے سپورٹ نہیں کرو گے یا پھر اس بنگلے اور بزنس کا بٹوارہ کرلو گے تو ٹھیک ہے جو مرضی میں آتا ہے کرو۔"

وہ بھی شاید ممی کی وجہ سے ہی برداشت کا مظاہرہ کر گیا۔ ولید نے اسے پاگلوں کی طرح دیکھا۔

"مطلب وہ تمہارے حریف کے ساتھ مل کر تمہیں عدالت میں گھسیٹ رہی ہے۔ کل کو وہ وکیل اگر تمہارے خلاف پریس کانفرنس بلاتا ہے تو وہ یقیناً اس کے ساتھ کھڑی ہوگی۔ تم پھر بھی اپنا کیریر، اپنا وقار بھلا کر اس کے لیے پاگل ہو رہے ہو۔"

قسام کے چہرے پہ کئی رنگ آئے۔ "اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔" اس کے فیصلہ کن انداز اور ٹھوس لہجے نے ان دونوں ماں بیٹے کو بے حس و حرکت کیا۔

ولید وہاں سے جا چکا تھا مگر اس کے آخری جملے کی بازگشت قسام کے کانوں کے پردے چھید رہی تھی جیسے وہ قسام نہیں جنگل میں کھڑا ایک سوداگر تھا۔ دولت، محبت و جاہت یہ سب تو سوداگر کے پاس بھی تھا شہزادی پھر بھی اس سرائے سے رہائی چاہتی تھی کیونکہ سوداگر کے گھر والے اسے شہزادی ماننے کو تیار نہیں تھے۔ جیسے کل اس پاس اس نے بابا آج پھر سے وہی داستان سنا رہے تھے۔

"کبھی میں بھی تمہاری طرح سوچتا تھا کہ شہزادی نے محبت کے نام پر ایک چال چلی تھی۔" اس کے بابا معنی خیزی سے مسکرائے تھے۔ "مگر راستہ بھٹک جانے والوں کو اپنی حیثیت بحال کرنے کے لیے وقت چاہیں نہیں سکھاتا۔ بلکہ سوداگر کے گھر والے سکھاتے ہیں۔" اسے اپنے باپ کی افسردگی اور مسکراہٹ سمیت وہ کہانی حرف بہ حرف یاد تھی۔

جب شہزادی اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس محل جا رہی تھی تو سوداگر نے اس کی پشت پر وار کرتے ہوئے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ اس اختتام پر سوداگر کو حق بجانب سمجھا تھا۔ مالک دیوان نے بیٹے کو تادیر دیکھنے کے بعد عجیب بات کی تھی۔

"اگر یہ قصہ تمہارے زیر قلم آجائے تو تم اس راستہ بھٹکی ہوئی شہزادی کے ساتھ انصاف کرنا۔"

دھیمی آواز کی اس نصیحت نے اسے آج پھر سے سن کر دیا تھا۔

اس روز اس نے سوچا تھا کہ جب اس کے بابا اس کے پاس آئے تھے تو ان کی آنکھوں کی حکایت میں ورشہ تیمور تھی مگر جب انہوں نے بات شروع کی تو ان کی گفتگو میں یہ دوسرا قصہ کیا معنی رکھتا تھا۔

اس وقت اپنے کمرے میں ساکت کھڑے قسام نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے تھے اس نے جان لیا تھا کہ اس روز بھی اس کے باپ کی گفتگو میں ورشہ تیمور ہی تھی۔

☆☆☆

آج خولہ نے اسے کال کی تھی کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اب وہ اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر اس کے گھر کے سامنے کھڑی تھی اگر عباس ولا خولہ کا ذاتی گھر تھا تو وہ خوش قسمت ترین لڑکی تھی اس نے بیل پر انگلی رکھتے ہوئے اپنی ازلی محرومی کے ساتھ اس شاندار عمارت کو جیسے آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے کوئی دسویں بار بیل بجائی مگر دوسری جانب کوئی

شاید ڈور بیل خراب ہوگی۔ اب وہ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی کہ ایک بھاری دستک پر گیٹ کا وہ چھوٹا پٹ کھلتا چلا گیا۔ وہ حیران ہوئی اتنے بڑے گھر کے گیٹ پر چوکیدار تھا نہ کوئی گارڈ اور دروازہ اندر سے بھی لاکڈ نہیں تھا وہ محتاط انداز میں اندر چلی آئی۔

رات کو بارش ہوئی تھی اور ابھی تک ہر چیز بھیگی ہوئی تھی اس نے اطراف میں دیکھا، ادھر ادھر مڑتی راہداریوں پر ایک ویران سی خاموشی طاری تھی وہ ابھی برآمدے کے پہلے اسٹیپ پر تھی کہ اس نے خولہ کو بوکھلاہٹ کے عالم میں باہر آتے دیکھا۔

''سوری یار! ہماری ڈور بیل شاید بارش کی وجہ سے گڑبڑ کر رہی ہے۔'' وہ بھرپور انداز میں معذرت کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ کچھ دیر بعد چائے کے دوران جب وہ ادھر ادھر کی خبریں ڈسکس کر رہی تھیں تو ورشہ کو اچانک سے یاد آیا۔

''باہر تمہارے گیٹ پر کوئی گارڈ وغیرہ بھی نہیں ہے پھر دروازہ اندر سے لاکڈ بھی نہیں تھا۔ تمہیں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے۔''

مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے گیٹ پر کبھی گارڈ ہوتا ہی نہیں اور دوسری بات یہ۔'' وہ ذرا دیر کو رکی۔ ''خولہ شاید ورشہ تیمور جتنی قیمتی نہیں کہ اس کی خاطر ہر جگہ ہر گھڑی سیکورٹی تعینات ہو۔'' وہ کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے ایک دم ہنس دی تھی۔

ورشہ ششدر سی ہوئی۔ وہ یہ سب کیسے جانتی تھی۔ خولہ اس کے چہرے کا تاثر بھانپ کر بھی اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ میشا سے مل چکی ہے۔

''شاید تم تمام تحفظات کی عادی ہو چکی ہو اگر تمہیں یاد ہو تو تمہاری کوئی بات، تمہارا کوئی کام قسام کے بنا مکمل ہی نہیں ہوتا تھا اور میں ہمیشہ سے من مانی کرنے والی اور ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد قسم کی لڑکی تھی۔'' خولہ کی آنکھیں ہنس رہی تھیں جبکہ ورشہ نے رخ موڑ کے ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے

''اگر تمہیں یاد ہو تو۔'' یہ جملہ اسے بے وفا ثابت کر رہا تھا۔

''تم تو پائلٹ بننے کے خواب دیکھتی تھیں پھر تم ماڈلنگ میں کیسے آئیں۔'' اس نے قسام کے ذکر سے بچنے کے لیے بات بدلی۔

''میری بدقسمتی تھی کہ میری مما اور پاپا بیک وقت ایک ساتھ کینسر جیسی بیماری کا شکار ہوئے تھے اور خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کی بیماری پہلی اسٹیج پر ہی ٹریس ہوگئی تھی اسی وجہ سے پاپا کا بزنس ڈوب گیا۔ کچھ ان کے بزنس پارٹنر ہڑپ کر گئے۔ گھر کی ہر قیمتی چیز بک گئی، ان کا علاج بیرون ملک ہو رہا تھا تو پیسہ پانی کی طرح چاہیے تھا اس دوران ہم بہت مقروض ہو چکے تھے مجھے اس وقت جس کے ساتھ کی ضرورت تھی جب اس نے میری آواز پر مڑ کے نہیں دیکھا تو بس پھر جو بھی ہوا، اس یقین، اس من کے ٹوٹنے پر ہوا۔''

اس کے خاموش ہو جانے پر افسوس میں گھری ورشہ کو اس کے آخری جملوں نے گہرائی تک کاٹا خولہ شاید سانس لینے کے لیے رکی تھی۔

''بعض اوقات لوگ ہمارے ساتھ غلط کرتے ہیں لیکن پھر ہم بطور ردعمل اپنے ساتھ اس سے بھی زیادہ غلط کرتے ہیں جیسے خولہ عباس نے کیا تھا۔'' اس کی آواز سرسرائی۔ ''جیسے ورشہ تیمور کر رہی ہے۔''

خولہ کی آنکھیں اب نم تھیں۔ اس کے سامنے بیٹھی ورشہ پلک تک نہیں جھپک سکی۔

''اس ضد کے نتیجے میں خولہ! اب قیمتی چیزوں میں شمار نہیں ہوتی۔'' یہ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر اس گھر کی راہداری جیسی ویرانی در آئی تھی۔

وہ جو متحیر سی ہو کے اسے سن رہی تھی ایک دم کھڑی ہوئی۔

''میں چلتی ہوں، گھر میں صرف تھوڑی دیر کا کہہ کے آئی تھی۔''

خولہ جانتی تھی کہ وہ اس کی باتوں سے بھاگ رہی ہے۔

یاد رکھنا ورثہ تیمور صرف قسام کے لیے اکنوں ہے۔ جب اس کا مقام بدلے گا تو وہ صرف مسز ایاز بشارت کے عہدے پر فائز ایک عام سی عورت رہ جائے گی۔"

مگر اس نے جیسے سننا ہی نہیں چاہا۔

"تمہاری زندگی مشکلات کا شکار ہے تو ایاز اتنا بہادر نہیں ہے۔ وہ تمہیں بھنور میں دیکھ کر تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"اونہہ! بھنور میں کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔" اس نے تیز رفتاری سے ڈرائنگ روم چھوڑا۔

"ایسی عورت کے لیے زندگی کہیں بھی سلک کا تھان ثابت نہیں ہوتی جس کے پاس پچھتاوے ہوتے ہیں۔ آہ۔"

"گویا میں قسام کو چھوڑ کے پچھتاؤں گی۔" وہ اس بات پر تپی۔

خولہ، ایاز کے خلاف بول رہی تھی یا پھر قسام کو فیور دے رہی تھی جو بھی تھا اس کی گفتگو عجیب تھی، شاید وہ اس کے کسی جملے پر گھبرائی تھی کہ ماتھے پر پسینہ اتر آیا۔ اس نے باہر آ کر گہرے سانس لیے۔

"میرا خیال تھا تمہیں رات کو ایاز کی فیملی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ کے بولی، اسے کچھ جتاتی ہوئی، جیسے اب ہر نصیحت بے فائدہ تھی۔ اس کی آواز نے خولہ کو منجمد کیا۔

رات کو ایاز کی فیملی اسے دیکھنے آئی تھی اور منگنی کی تاریخ طے کر کے گئی تھی۔

"اگر زندگی تمہیں دوبارہ سے کبھی موقع دے تو ایاز کو چھوڑ کر قسام کی قیدگاہ کا انتخاب کرنے میں دیر مت کرنا۔" اس نے اپنے عقب میں خولہ کو چلّاتے سنا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اسے اتنا پتا تھا کہ رات کو بارش ہوئی تھی اور ابھی تک ہر ایک چیز گیلی تھی۔

☆☆☆

تو جو شہر ہی میں مقیم ہے تو مسافرت کی فضا ہے کیوں
تیرا کارواں جو نہیں گیا تو ہوا میں گرد ہے کس لیے

نیم اندھیرا، خاموش ماحول، گیسٹ ہاؤس کے بی برآمدے میں بیٹھے وہ دونوں خاموشی سے ساتھ جانے کس شے کو دیکھ رہے تھے۔

"اور اگر تم جیت گئیں۔ اور اگر میں ہار گیا۔" قسام کے لبوں نے جنبش کی۔ ورثہ نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ "تو ہم دونوں ایک دوسرے کو معاف کر دیں گے۔" جانے کیوں وہ گردن پیچھے پھینک کر ایکدم ہنسی تھی۔

"کبھی بھی نہیں۔" اس نے دانت پیس کر اس کی ہنسی میں زہر گھولا کہ وہ دوبارہ سے سر جھکا کے رہ گئی۔" اس نے بالوں میں چبھتی ہیئر پن کو ہلکے سے کھینچا۔

وہ جہاز، وہ کشتیاں وہ پتنگ وہ سب مجھے واپس کر دو۔ میں تمہاری ڈرائنگز میں سے وہ تمام راستے مسدود کرتا ہوں کیا اس کے بعد تم کہیں جا سکو گی؟" وہ اس کے ساتھ بیٹھا وہاں چھائی خاموشی میں کبھی پتھر، کبھی پھول پھینک رہا تھا۔ اس لڑکی نے قریب بیٹھے شخص کو نظر اٹھا کے دیکھا۔

"بچپن بہت پیچھے رہ گیا ہے قسام! جو ہونے جا رہا ہے۔ وہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔"

اس نے اطراف سے، اس شخص سے، اپنے آپ سے ہر چیز سے نگاہ چرائی قسام نے آسمان پر جمع ہوتے کن من برساتے بادلوں کو دیکھا۔ پھر اس کے سیاہ لباس کو دیکھ کر ایک سلگتی ہوئی آہ بھری، واقعی بچپن بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آج اس لڑکی کا لباس سفید نہیں تھا۔ اس نے چہرہ موڑ کے ان جھکی پلکوں کو دیکھا۔ "تم مجھے ان چند گھنٹوں کی اتنی بڑی سزا کیسے دے سکتی ہو۔" وہ گلہ نہیں تھا، ایک کھلا کرب تھا، بارش کے پانی سے ہر جگہ پھیلتا ہوا۔

"پتا نہیں کیوں ان چند گھنٹوں کی اذیت میرا ہاتھ ہی نہیں چھوڑتی۔" وہ عجیب سا مسکراتی ہوئی ایک دم کھڑی ہوئی۔

"دشمنی نبھانے کے اور بھی سو طریقے ہیں یار!" اس متوحش آواز پر چونکتے سمٹے، سکڑے پرندوں نے اس سیاہ لباس والی کو اس کے پہلو سے اٹھتے دیکھا تو انہیں اپنی بینائی پر شک ہوا۔ وہ وہیں بیٹھا تھا۔ بارش

یونہی آگے بڑھتے ہوئے اس تنہا بیٹھے شخص کے چہرے کو شرارتاً چھوا تو وہیں ساکن ہوئی کہ اس چہرے پر بارش اور مزاج کے ساتھ برس رہی تھی بہت تیز اور بہت گرم۔

☆☆☆

زرش بی کتنی ہی دیر سے قسام کو اپنے سامنے متحرک اور مصروف دیکھ رہی تھیں۔ وہ آج بھی بیٹے کا مزاج سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ آج وہ نئے پرانے اخبارات کا پھیلاؤ بھی نہیں تھا پھر بھی اس سیٹ شدہ لیونگ روم میں سب کچھ اپ سیٹ تھا، ابھی کچھ دیر پہلے ان کا بیٹا ولید سے مل کر آیا تھا، وہ جو بات اس سے کہہ کے آیا تھا شاید زرش بی کو ڈسٹرب کر رہی تھی۔

انہوں نے بیٹے کو غور سے دیکھا جس کے چہرے پر باسی مسکراہٹ بھی نہیں تھی، وہ اب فولڈر میں چند پیپر سیٹ کر چکا تھا۔ وہ فولڈر آفس بیگ میں رکھنے کے بعد وہ ماں کی طرف آیا۔

وہ چند ثانیے اس کا بجھا سا چہرہ دیکھتی رہیں۔

''اب تم ایسا کیوں کر رہے ہو قسام؟'' جب وہ ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے دھیرے سے پوچھا، وہ کسی گہرے دھیان سے چونکا، پھر ان کی بات کا مطلب سمجھ کر شاکڈ رہ گیا۔ وہ اس بڑے خاندان کی بہو ہونے کے ساتھ ایک ماں بھی تو تھیں۔ وہ اس سے اتنا ہی پوچھ لیتیں کہ ہر حصار کا دروازہ کھولتے ہوئے تمہیں کتنی تکلیف ہوئی ہے لیکن اس کی ممی کو آج بھی شراکت داری کی فکر ستا رہی تھی۔

وہ آج بھی بیٹے کا درد محسوس کیے بنا دیوان ہاؤس کے بٹوارے سے ڈر رہی تھیں۔ اس نے ماں کو دھندلی نظروں سے دیکھا۔

''اب سے کیا مراد ہے آپ کی؟'' اس مختصر سوال کے ساتھ اس نے ایک کرب آمیز پہلو بدلتے ہوئے اپنی گفتگو بحال رکھی۔ ''آپ سب کی نظروں میں سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہوگا مگر آپ مجھ سے ماں بن کر پوچھیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میری زندگی کا ہر کونا ٹوٹ چکا ہے۔'' اس کے لہجے کی تڑپ نے زرش بی کو زرد کیا۔

جنبش کی۔

''شاید آپ بھول رہی ہیں کہ ولید اس شراکت کو اس رشتہ داری کو خود ہی شرطوں کی حد تک لایا تھا۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''وہ پہلے کی بات تھی۔'' وہ تیزی سے بولیں۔ ''مگر اب۔'' وہ ایک دم خاموش ہوئیں وہ کن الفاظ میں جملہ مکمل کرتیں کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔

''پہلے آپ کا بھانجا ایسا چاہتا تھا، اب میں یہ سب چاہتا ہوں۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''بات کو سمجھو بیٹا! تمہارا الیکشن سر پر کھڑا ہے اور.....''

''مجھے اب اس کی پروا نہیں ہے۔'' وہ ان کی بات کاٹتا ہوا قطعی پن سے بولا۔

''یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ولید کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے ہر صورت اب ہر چیز الگ ہوگی۔'' اس کے دوٹوک انداز نے زرش بی کو بے اختیار کیا۔

''یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ورثہ کی ایمپائر، اس کی رضا مندی سے ہو رہا ہے۔'' دروازے کی جانب بڑھتا قسام اسی قدم پر رکا کہ اس لڑکی کو اس الزام میں مبتلا رکھنا اس کے ساتھ ناانصافی تھی۔ وہ مڑا اس نے ماں پر ایک شاکی اور زخمی نگاہ ڈالی۔

وہ ایک ماں ہونے کے ساتھ دیوان ہاؤس کی ملکہ تھیں انہیں بہو کی صورت راستہ پھسلے ہوئے خاندان کی وہ لڑکی ہرگز بھی قابل قبول نہیں تھی۔ انہیں بہو کی صورت کسی ریاست کی شہزادی نہیں چاہیے تھی مگر وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو پرائی دشمنی میں بھی جوتنے کی خواہاں نہیں تھیں۔

☆☆☆

''ورثہ بی بی قسمت کی دھنی نکلی کہ اس کا رشتہ تو ایمان بی بی کے خاندان سے بھی بڑے خاندان میں طے ہوا ہے، ان کی لائی ہوئی سوغاتوں سے گیسٹ ہاؤس بھرا پڑا ہے۔ اب منگنی پر وہ لوگ جانے کون کون سے ہیرے جواہرات اٹھا لائیں گے۔'' گیسٹ ہاؤس میں قدم

وہ جب ورشہ کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ سامنے صوفے پر آلتی پالتی مارے ایک خوش رنگ جیولری باکس پر جھکی تھی۔ اس نے آہٹ پر سر اٹھایا۔

ایک ہیئر پن سے جڑی تتلی کے ایک پر میں جامنی موتیوں کو سیٹ کرتی وہ اتنے سکون سے مسکرائی تھی کہ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر ثمن کا چہرہ پھیکا پڑا۔

اس نے مسکراہٹ سنبھالتے ہوئے ثمن پر بڑی جتاتی نگاہ ڈالی جیسے وہ جانتی تھی کہ ثمن اس تتلی کا پر ٹھیک ہونے کی دعا کر رہی تھی۔ ثمن نے اسے برہمی سے دیکھا۔

"میں تم سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں یہ کیسی محبت تھی کہ تم نے قسام کو چھوڑ دیا ہے۔" بے قراری سے پوچھے گئے اس سوال پر تتلی کا پر ٹھیک کرتی اس لڑکی کے چہرے پر لمحہ بھر کو جامنی موتیوں کا عکس لہرایا۔ ثمن کے لہجے میں طنز تھا نہ حیرت تھی بس ایک لامحدود بے یقینی تھی۔

"محبت ہمیں پابند نہیں کرتی کہ محبوب کو اپنانا ہی محبت ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر ثمن جبار کے لیے بھی اس شخص کو حاصل کرنا لازم ہے۔" یہ کیسا جواب تھا کہ ثمن جبار کی سانس ریزہ ریزہ ہوئی۔

"ویسے بھی کسی سے محبت ہو جانا ایک بے اختیار کیفیت ہے لیکن اس شخص کو چھوڑ دینے پر آپ کو پورا اختیار ہے۔" اس نے یہ بات اس قدر بے نیازی اور سکون کے ساتھ ختم کی کہ ثمن کے اندر ایک عجیب انداز میں قیامت برپا ہوئی۔

"اگر بوا کہتی تھیں کہ ورشہ قسمت کی دھنی ہے تو وہ سچ کہتی تھیں کہ وہ قسام مالک کو چھوڑ دینے کے بعد بھی اترا رہی تھی، دمک رہی تھی۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ رک کر اور پلٹ کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ تم نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مگر قسام مالک تم سے دست بردار ہونے کے بعد اپنے رشتے سے بھی الگ ہو جانے کا اعلان کر چکا ہے۔

☆☆☆

میں منگنی کی یہ سادہ سی تقریب اب رسم ادا ہونے کی منتظر تھی اس خوب صورت سبزہ زار میں مختلف مقامات پر موجود وہ تینوں نفوس ایک دوسرے کو جس قدر بھی نظر انداز کر رہے تھے۔ مگر شعوری طور پر ایک دوسرے کی جانب ہی متوجہ تھے۔

سفید پھولوں سے آراستہ ۔۔ اسٹیج پر جامنی میکسی میں جگر، جگر کرتی وہ لڑکی زرش بی کی حالت پر حیران تھی اس کھلے لان میں وہ سہ پہر برسوں پہلے ڈھل چکی تھی لیکن زرش بی کے چہرے پر وہی کیفیت رقم تھی۔

وہ قسام اور ورشہ کو ایک ساتھ محبت زدہ دیکھ کر منجمد ہوئی تھیں۔

"میں کبھی ان پھولوں کا نام نہیں جان پائی۔" وہ پہلو میں کھڑے مسکراتے ہوئے شوہر سے اپنی اندرونی ناگواری چھپاتے ہوئے بے ساختہ ۔۔ بول اٹھی تھیں۔

ان ننھی سبز شاخوں میں بے شمار کونپلوں کے بیچ کھلتی ہوئی وہ کیسری کلی اس قدر انوکھی لگ رہی تھی کہ قسام نے ایک بے اختیار کیفیت میں توڑ کر ساتھ کھڑی لڑکی کے ۔۔ ہاتھ میں تھماتے ہوئے ماں پر ان پھولوں کا نام آشکار کیا تھا ساتھ ہی ان لمحات کو اپنے سیل فون میں قید کر لیا تھا۔

آج ایک عرصے بعد اسی سبزہ زار میں اپنی ہیئر پن کو بار بار سیٹ کرتی ورشہ حیران تھی کہ وہ پھول تو اس نے کب کا واپس کر دیا تھا پھر آج بھی زرش بی کی آنکھوں میں بے چینی کیوں تیر رہی تھی۔

☆☆☆

ہمیشہ اس شخص کی موجودگی میں ماحول عجیب سا سائن دے رہا ہوتا تھا جیسے وہ اسی کو دیکھ رہا ہو وہ اسے دیکھ کے مسکرایا ہو جیسے اس کے کلون کی مہک اس کا وجود چھوڑ کر ورشہ کے ساتھ لپٹ جاتی تھی مگر آج وہ اتنا خاموش اور سپاٹ تھا کہ اس مہک تک کو جیسے خود میں سینت کے بیٹھا تھا۔

"لیکن وہ اس وقت وہاں کیوں موجود تھا؟" وہ جی جان سے تلملائی۔ اس نے اپنے بالوں میں چھپی

''میں جانتی ہوں کہ تم اپنی روایت واقدار پر ثابت قدم رہتے ہوئے بطور ولی رات کی تقریب میں ضرور شرکت کروگے مگر یاد رکھنا کہ تمہارا نام میرے مہمانوں کی لسٹ میں نہیں ہے۔'' جب شام کو وہ اس کھلے سبزہ زار میں فنکشن کی ارینجمنٹ کا فائنلی جائزہ لے رہا تھا تو وہ اس کے پاس آکر اسے یہ فنکشن اٹینڈ کرنے سے منع کررہی تھی۔

وہ اسے اور اس کی بات کو نظر انداز کرتا یونہی چہرہ اٹھائے مصروف انداز میں وہاں متحرک ورکرز کو کچھ ہدایات جاری کرتا رہا۔ ورشہ کو اس دنیا میں جو بات اپنے حق میں سب سے زیادہ ہتک آمیز محسوس ہوتی تھی وہ اس شخص کی خاموشی تھی۔

''تم نے سنا کہ تم رات کی تقریب میں انوائیٹڈ نہیں ہو قسام!'' وہ پیر پٹختے ہوئے گھوم کے اس کے سامنے آئی۔

وہ اس کے اس حکم کے بعد بھی دوسری جانب متوجہ رہا جیسے وہ اس کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھی۔

اب رات کو اس وقت جب منگنی کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی جارہی تھی تو وہ ہنوز خاموش، کمبیر اور بے نیاز تاثر کے ساتھ جانے کس جانب دیکھ رہا تھا (اسے ایک راستہ بھٹکی ہوئی شہزادی کو انصاف دلانا تھا، بھلے ضبط کے کسی مقام پر دل بند ہوجاتا) وہ جانتی تھی کہ چاہے وہ کہیں بھی متوجہ تھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل ایک دم اتھاہ میں ڈوبا، مگر کیوں؟ اس نے بے تحاشہ چبھتی ہوئی ہیئر پن کو کھینچ کر نکالنا چاہا۔ تو اسے دل ڈوبنے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اس کی ہیئر پن سے جڑی تتلی مرچکی تھی اور یہ بدشگونی تھی۔ اس تھری سیٹر صوفے پر اس کے ساتھ بیٹھی ام میرات کا چہرہ سیاہ پڑا۔

''جب دلہن کے تن پر کوئی زیور مرجاتا ہے تو اسے یہ خبر چھپالینی چاہیے پھر کسی ایک سے بھی پرسہ لینے میں رسوائی ہوتی ہے۔'' انہوں نے ایک تڑپ اور محبت کے ساتھ یونی کا ہاتھ تھاما۔

کی تاریخ طے کررہے تھے ان میں ایک وہ بھی تھا جو اس کے مہمانوں کی لسٹ میں نہیں تھا۔

اب منگنی میں شرکت کرنے والے مختصر مہمان رخصت ہورہے تھے، وہ پھر بھی وہیں موجود تھا۔

وہ اب اس منظر سے غائب ہونے کو بے چین تھی مگر ایاز اسے بس دو منٹ کا کہہ کر گیٹ پر اپنے ایک خاص دوست کو پک کرنے گیا تھا، وہ بے یقین ہوئی کہ اس نے ایک دم قسام کو تیز رفتاری سے اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے پتھریلے انداز میں ایسی شدت تھی کہ وہ پریشان ہوئی لیکن اگلے لمحے وہ جان گئی کہ قسام کے ٹھوس تاثرات کی وجہ شاید ایاز کے ہمراہ آتا وہ شخص تھا جس کی ایک الگ قسم کی ڈریسنگ اور شخصیت اسے ایک قبائلی سردار ظاہر کررہی تھی۔

بالمقابل ہونے پر قسام اور وہ ایسی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے، یک لخت دادی نے جس کیفیت میں اس کا ہاتھ بھینچا تو یہ محبت نہیں ایک خوف تھا۔

''میں نہیں جانتا تھا کہ تمہاری منگنی کہاں اور کس سے ہورہی ہے۔'' وہ بلند آواز سے بولا جیسے وہ اعلان کررہا تھا کہ میں یہاں ایک سنگین اتفاق کے تحت موجود ہوں، اب اس کی نگاہ ورشہ سے پھسلتی ہوئی ایک دوسرے وجود پر ٹھہری۔

''کیا میں جانتا تھا کہ میں یہاں اس ہستی سے ملنے والا ہوں جس سے میں نے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری منگنی اپنی کزن خولہ عباس سے ہورہی ہے۔''

ام میرات کے خوف اور قسام کی بے بسی پر محظوظ ہوتے ہوئے اس بے رحم سردار نے ایاز کو بھی بھی نہیں بخشا تو ایاز کا مسکراتا چہرہ ایک دم تحیر زدہ ہوا۔

''تو نے شاید اسے اس کی ماڈلنگ کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ مگر بے خبری میں تو جہاں رشتہ جوڑ بیٹھا ہے تو اتفاق سے میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں یہاں تو نسلوں کا زیاں اور دشمنی مول لے رہا ہے ایاز

ساتھ دیکھے جارہی تھیں۔ ہو بہو وہی آواز، وہی شکل، وہ یقیناً ان کے بڑے بھائی کا ولی عہد تھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کنبل خاناں میں شروع سے ان سب کو جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمایوں خان کا اپنے سسرال کے ساتھ کوئی زمینی تنازعہ تھا تو۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ اس لڑکی کا باپ کیوں قتل ہوا تھا؟'' وہ ایاز کی بات کاٹ کر سفاکیت کے ساتھ مسکرایا۔

اس بات پر اس روشنی زدہ لان میں ہر ایک کے چہرے پر بدحواسی جھلکی۔

''میں تمہیں مہمان سمجھ کے برداشت کر رہا ہوں تم یہاں سے جتنی جلدی چلے جاؤ گے تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔'' قسام شدید ترین ضبط کے ساتھ گویا ہوا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری اس منگیتر کی دادی عین اپنے نکاح کے روز گھر سے بھاگ گئی تھی تو اس کے بھائیوں نے بدلے میں اس کا بیٹا قتل کر دیا تھا۔'' وہ ام میرات سے کوئی رشتہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ وہ صرف ان کی تذلیل کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ یہ کہانی ہمایوں کی باقی ماندہ نسل کو عزت دار زندگی سے محروم رکھنے کے لیے کھول رہا تھا۔

وہ شخص کس حیثیت سے ان کی عزت اچھال رہا تھا۔

ورشہ کو دادی کی خاموشی ہولا رہی تھی۔

''ام میرات کے ساتھ بہت برا ہوا تھا اس کے منگیتر کا گھوڑا ریس جیت گیا تھا تو اس کے بھائی نے بدلے کے طور پر بچپن کا وہ رشتہ ختم کر دیا، کیا یہ انسانی جذبات واحساسات کی توہین نہیں تھی۔

رعنا بھابھی کی اونچی آواز نے اس وقت اس عورت کی جھکی گردن کو ذرا سا سیدھا کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ ایک عورت کی عورت کے حق میں جذباتی اور نفسیاتی حمایت تھی۔

ایاز کے دوست نے رخ بدلا اور ام میرات کی

''جب تم لوگ ہائی وے پر پکڑے گئے تھے اور تمہارے منگیتر علی خان نے تمہارے بھائی پر فائر کیا تھا تو اس کو بھی اسی جگہ مار دیا گیا تھا۔ اس وقت تم جس کی جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ نکلی تھیں، وہ کون تھا؟ کیا وہ ہمایوں خان تھا؟''

ام میرات نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور آج بھی اپنے قبیلے کے مرد کو خوف سے لرزتی پلکوں کے ساتھ دیکھا۔

یہ کون سی کہانی تھی جو ایک سوال پر رک گئی تھی اور یہ کیسا سوال تھا جس نے نیلی پڑتی ام میرات کو خالی کر دیا تھا اک ذرا سا بھرم بھی نہیں بچا تھا۔

''بعض اوقات لوگ ہمارے ساتھ برا کرتے ہیں پھر بطور ردعمل کے ہم اپنے ساتھ اس سے زیادہ برا کرتے ہیں۔ ان کے علاقے میں، ان کے قبیلے میں ان کے لوگوں کی دل ونظر اور لب ولہجے میں ایک رتی بھر بھی رحم کی امید ہوتی تو اس شام ام میرات کسی اجنبی سے پناہ کی بھیک مانگنے کے بجائے واپسی کا سفر طے کر سکتی تھی۔

بس سفاک اور سنگدل لب ولہجے کے مالک اس قبائلی کے روبرو رعنا کی تڑپتی اور کڑکتی آواز نے ایک بار پھر عورت کے حق میں گواہی دی مگر اس کی گواہی آدھی تھی۔

☆☆☆

گیسٹ ہاؤس کے پہلو میں واقع اس روشنی زدہ لان میں موجود تمام لوگ اپنے دل ودماغ میں یہ گتھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق سلجھا رہے تھے کہ وہ اپنے منگیتر کے ساتھ بھاگی تھی پھر ایک دوسرے شخص کی ہمراہی میں وہ کہاں کہاں بھٹکی ہوگی تو کیا ہمایوں ایک تیسرا شخص تھا۔ ورشہ نہیں جانتی تھی کہ ایاز کی فیملی، یا وہاں کھڑی چھوٹی بوا۔ فاخرہ آنٹی اور زرش بی اس معاملے کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے۔

وہ وہاں سے دور جاتے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کون تھا جس نے ہمایوں کی پوتی کی شناخت کو اب کسی کتبے پر کندہ کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔

وہ ایک بار پھر جس میں ہری کی اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اس کے شاہی گہنے ایک بار پھر کم ہو چکے تھے۔ اس کے پاس شہزادی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا، ایاز کی والدہ جب رعنا بھابھی کو منگنی کی انگوٹھی واپس کر رہی تھیں۔ تو زرش بی نے بے اختیار کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ایاز نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

''پلیز، اس لڑکی نے اس رشتے کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی تھی، وہ تو شکر کریں کہ اس وقت اس سزا بخشی کی وجہ بھی دیوان فیملی ہی ہے۔''

یعنی اس کے نزدیک ورثہ کی کوئی ویلیو ہی نہیں تھی۔ اس نے رعنا بھابھی کی ڈبڈبائی آنکھوں میں اپنی جلتی آنکھیں گاڑیں گویا وہ ناحق اتنا عرصہ خود کو بادشاہ کی پوتی سمجھتی رہی۔

ہر ایک کے چلے جانے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے مڑی اس نے ام میرات کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میرے باپ، دادا اور میری بے سروسامانی کی وجہ صرف اور صرف تم تھیں۔'' وہ ان کا گریبان پکڑنے کو جھکی جب قسام نے اسے کلائی سے کھینچ کر دادی سے دور کیا۔

''اگر تم نے مزید ایک لفظ بھی کہا تو.....'' وہ جیسے مٹھی بھینچ کر اسے تھپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پا گیا۔ ''ہمیشہ یاد رکھنا کہ تم ام میرات سے برتر نہیں ہو، اگر اس روز میں تمہارا کہنا مان لیتا تو تمہاری آنے والی نسلوں کا ہاتھ بھی کبھی تمہارے گریبان پر ہوتا۔''

یہ کیسی سفاک حقیقت تھی کہ اس لڑکی کے اعصاب جھنجھنا کے رہ گئے۔ یہ بدترین انکشاف تھا کہ رعنا کی نگاہ میں وہ لڑکی لمحہ بھر میں بونی ہوئی۔

ورثہ نے قسام کی تھکن زدہ پیشانی اور تنے نقوش سے نگاہ موڑی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کیا خبر وہ ابھی تک بھاگ رہے ہوتے اور اگر ایک دن کی روپوشی کے بعد بھی وہ لوٹ آتے تو اس کی حیثیت ہمیشہ کے لیے صفر رہ جاتی۔

''تم یہ کیسے چاہ سکتی تھیں کہ جس شخص کے باپ دادا نے تمہارے خاندان کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا تھا تو وہ تمہارے اس جد بانی قدم سے ہمیشہ کے لیے نقب زن کہلایا جاتا۔''

رعنا بھابھی کے سنگین لہجے نے اسے زمین میں گاڑا واقعی وہ ام میرات سے برتر تو نہیں تھی۔ اس نے بھی اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے ایاز کے سامنے غلط بیانیوں سے کام لیا۔ ہر بات میں جھوٹ کا دامن تھاما۔ وہ شخص جو ہمیشہ اسے جھوٹ میں سے سچ الگ کر کے دکھاتا تھا۔

ورثہ نے دیکھا وہ ام میرات کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ رہا تھا اس کا دل لامحدود گہرائی میں ڈوبا، وہ جیسے پاتال میں دھنسی۔ اسے تو ابھی ام میرات سے معافی مانگنا تھی، ام میرات اور اس میں فرق ہی کیا تھا تو پھر عمر کا ایک حصہ اس نے یونہی بے خبری میں ام میرات سے نفرت کرتے گزار دیا۔

☆☆☆

''تمہاری دادی نے اپنی جان بچانے کے لیے جس شخص سے پناہ مانگی تھی۔ وہ کوئی اور نہیں ہمایوں ہی تھا وہ ان کے علاقے میں شکار کی غرض سے جاتا رہتا تھا۔''

اپنا سامان سمیٹتی رعنا اس کے سامنے ام میرات کا ماضی اب کیوں کھول رہی تھیں جب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

سفید دوپٹے سے آنکھیں رگڑتی وہ لڑکی کیا اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''اب کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ آج میرے سسرال والے مجھ سے آپ لوگوں کے متعلق سو طرح کے سوال کر رہے ہیں۔ کل کلاں مجھے بہن بھی بیاہنی ہے اس لیے اب آپ لوگوں کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔''

چند گھنٹے پہلے ولید ان دونوں سے بظاہر دادی کا افسوس کرنے آیا تھا۔ اس کی سرد آواز ابھی تک ورثہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''ایمان اور خولہ ماڈلنگ کے لیے ایک ساتھ سلیکٹ ہوئی تھیں تو آفس کے ریکارڈ میں ایمان کا وہ فوٹو شوٹ اب بھی پڑا ہوگا۔ اس نے اپنا یہ شوق ولید کے پروپوزل کے بعد ترک کر دیا تھا۔ تم کہو تو کسی نہ

کی طرح ہے۔ وہ تو سوٹ ٹائیڈ کو دیکھا جا سکتا ہے۔"

ولید کے ہتک آمیز لہجے پر اسے میشا کی یہ بات یاد آئی تھی مگر وہ اس کی دشمنی میں ایک عورت کے ماضی پر پڑا پردہ اب تو ہرگز بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔

"ہمایوں الہزعیر کی ام میرات کو سمجھا، بہلا کر کسی نہ کسی طرح اس کے قبیلے میں چھوڑ آتا مگر اس نے یہ خبر سن لی تھی کہ ام میرات کے بھاگنے کے بعد اس کی ماں کو ایسی باغی لڑکی پیدا کرنے کے جرم میں گولی مار دی گئی تھی تو سوچو پھر تمہاری دادی کی واپسی پر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔"

رعنا بھابھی نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے ایک گہرا تکلیف دہ سانس بھرا۔ وہ لڑکی اس گہرے تکلیف دہ سانس پر چونکی تک نہیں کہ وہ رعنا کو کب سن رہی تھی۔

"کچھ لوگوں سے محبت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر ہمایوں نے ام میرات سے محبت کی، میرا بیٹا بھی ہمایوں جیسا ہی ہے وہ تمہاری پہرے داری کرتے کرتے کسی دن اتفاق سے ان سفاک سرداروں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم رعنا کے ساتھ واپس ہمایوں کے خاندان میں چلی جاؤ۔"

زرش بی کے منجی لہجے نے رات اس کے اندر ایک حشر جگا رکھا تھا۔

ایک طرف ہمایوں پر قتل کا کیس ہو چکا تھا دوسری جانب اس کے دوست، احباب، اس کا پورا خاندان اس اجنبی لڑکی کو واپس کرنے پر اصرار کر رہا تھا وہ ان کڑے حالات میں الجھ کر رہ گیا۔

اسی دوران کسی نے اسے شہر کے نامی گرامی اور کامیاب بیرسٹر دیوان صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا جب وہ قتل کے کیس سے بری ہو کر لوٹا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے یہیں دیوان صاحب کا غلام بن کر رہنا تھا۔

رعنا ایک فیصلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"میرے شوہر نے مرتے وقت مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ام میرات بائیس آئی ہے، میں نے بعد اس کے پاس چلی جاؤں گی تو اسے دکھ سکھ کے لیے تمہارا سہارا مل جائے گا۔"

"کس قدر اعلا ظرف تھا ہمایوں کا خاندان۔" ورشہ نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

"لیکن اب میں آزاد ہوں۔ میں باقی کی زندگی اپنے علاقے اور اپنے رشتہ داروں میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد جب وہ رعنا کے بیگ کے ساتھ اپنا سامان رکھ رہی تھی تو رعنا سے نگاہ چرا کے بولی۔

"جیسا بھی سہی، ٹوٹا پھوٹا مگر ہمایوں کا گھر مجھے ہر حالت میں قابل قبول ہے۔ تم مجھے وہاں چھوڑ کر جہاں مرضی چلی جانا۔" اس بات پر رعنا خاموش رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب وہ دونوں ام میرات کا سامان سمیٹ رہی تھیں تو انہوں نے قسام کو اندر آتے دیکھا کمرے کے بیچوں بیچ پڑے سامان کو دیکھ کر اس کی رنگت متغیر ہوئی۔ ہر بار اسے ایک عجیب مقام پر کھڑا کر دیتی تھی ان گونگے راستوں پر کھڑا اپنے بکھرے اعصاب پر قابو پاتا وہ شخص کیا یہاں تاخیر سے پہنچا تھا جب رخت سفر باندھتی وہ لڑکی اپنے سامان میں ام میرات کی سرد مہری اور خاموشی رکھ چکی تھی۔

قسام ایک بار پھر بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھے ہی گیا۔ وہ بدستور رخ موڑے اب کچھ ریشمی دھاگے سمیٹ رہی تھی۔

وہ پلٹ کر کیسے دیکھتی۔ اس سے کیسے نگاہ ملاتی کہ وہ اس شخص سے مردہ تتلی کا پرسہ لے کر اب خود کو مزید رسوا نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے اس کی نگاہ اسی پر تھی جو اپنی نالی کے سامنے جیسے کھانے کی ٹرے بیچ رہی تھی۔ ورشہ اس منظر پر بے چین ہوئی۔

اس گھر میں رعنا سے ایک بوڑھی عورت اور اس کی نواسی کے ساتھ نتھی کر کے اپنی بھانجی کے پاس لاہور جا چکی تھی۔ وہ بوڑھی عورت جتنی کم گو تھی۔ اس

ہوئی بھلا اسے پوچھنے کی کہ اس گھڑی ہر گھڑی جنگل میں کیوں گھلتی ہے۔ بعد میں اس کو پتا چل گیا کہ ہر کھڑکی سے صرف اس کو جنگل نظر آتا تھا۔ کوئی کھڑکی، کوئی راہداری ایسی بھی تھی جہاں سے کوہ قاف کے جنگل میں گھڑا مرزا بھی نظر آتا تھا۔

''رات کو میری آنکھ کھلی تو تم کمرے میں نہیں تھیں۔'' اس نے ٹانکا بھرتی سوئی پر نگاہ جما کر پوچھا۔

نفاست سے ٹانکا لگاتی سسی کا ہاتھ کانپا۔

''جب تم اس پورے گھر میں موجود نہیں ہوتیں تو کہیں نہ کہیں تو جاتی ہو۔ تم اپنی نانی سے برتر تو نہیں ہو۔''

اس کی صاف شفاف دھیمی آواز پر سسی کی آنکھیں ایسے کھلیں جیسے گلے پر کسی نے تیر چلایا ہو۔

''ہم..... ہماری محبت پاکیزہ ہے۔'' وہ بمشکل اور بے ربطی سے گویا ہوئی تو جواب میں وہ تاسف سے مسکرائی۔

''بہت دیر سے ہی سہی مگر میں نے جان لیا ہے کہ ام میرات، ورشہ، سسی، ایمان، خولہ، ہمایوں، ولید، قسام، مرزا، ہم سب کم و بیش ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کسی کی نفرت میں مبتلا، کسی کی محبت کا شکار اور ہم نادانی میں ایک دوسرے سے نفرت کرنے میں عمر گزار دیتے ہیں اور نادانی میں ہم سب خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کی حماقت کرتے رہتے ہیں۔ باقی سب قسمت کا کھیل ہے کہ کسی کا بھرم رہ جاتا ہے اور کسی کا چکنا چور ہو جاتا ہے۔''

☆☆☆

''وہ بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ پاس کا جنگل کاشت کرنے والا قبیلہ جنگل میں سے سبزیاں اور پھول چننے والی لڑکی کو کبھی اپنی بہو نہیں بنائیں گے۔''

اس بوڑھی عورت کی اس بات پر ورشہ نے بمشکل آہ دبائی۔

''وہ تمہاری باتوں سے بدل گئی ہے، اسے سمجھاؤ کہ اس کے لیے جس کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ وہ بھی کوئی گیا گزرا نہیں بالکل ساتھ میں کھجوروں والے باغ کا رکھوالا ہے۔ وہیں باغ میں اس نے پکا گھر بھی بنا لیا ہے۔

اچھا سے شروع ہونے والی بات چیت ایک مہینہ مکمل ہونے تک اب اچھی خاصی گفتگو تک آ چکی تھی۔

''اس بوڑھی عورت کے ساتھ محبت اور ادب جتا لینے سے تمہیں گناہ نہیں ملے گا۔''

سسی جب اس کے پاس آ کر بیٹھی تو اس نے اسے سمجھاتے ہوئے سر جھکا لیا تھا تو کیا اس نے ہاتھ میں موجود کرتے پر ٹانکا بھرنے کی غرض سے سر جھکایا تھا۔

''میری ماں روز ابا سے اس عورت کی وجہ سے مار کھاتی تھی۔ آج میں بتاتی ہوں کہ کیوں؟ میرا نانا خود رات بھر تماش بینوں کے ساتھ بیٹھتا تھا اور سارا دن نانی کو شکی نظروں سے دیکھتا اور روز مارتا پیٹتا کہ میری غیر موجودگی میں تم کہیں نہ کہیں تو جاتی ہو گی۔

اب نانا کو گھر میں اکیلی عورت کی گواہی ایک آٹھ نو ماہ کی بچی تو نہیں دے سکتی تھی۔ بالآخر نانا کے شک اور مار پیٹ سے تنگ آ کر نانی کی راتیں سچ مچ گھر سے باہر گزرنے لگیں۔''

سسی کی آواز مدھم ہوئی۔ ورشہ کا چہرہ زرد ہوا۔ جیسے وہ گہری تکلیف میں ہو۔

''میری ماں میرے باپ سے نانی کی بدکرداری کے طعنے تشنے سہتے سہتے خون تھوکتی ہوئی مر گئی تو کیا میں اس عورت کو معاف کر دوں۔''

(ہائے یہ لڑکی اپنے لیے پچھتاوے خرید رہی تھی)

سسی نے ساکت بیٹھی ورشہ کے ہاتھ سے سوئی دھاگہ واپس لیتے ہوئے کرتا اپنے آگے پھیلایا اور اس کے گریبان سے جڑی ریشم کی ڈوری کو سیدھا کرنا چاہا مگر ناکام ہوئی۔ کوئی ٹانکا تو ایسا تھا جو بی بی سے غلط لگ گیا تھا۔

''تمہاری نانی کا ماضی جیسا بھی تھا۔ تمہیں ان سے نفرت کرنے یا نفرت جتانے کا کوئی حق نہیں۔''

اس بات پر سسی کے ہاتھ رکے۔ وہ اس خاص الخاص مہمان کی بات پر متعجب ہوئی۔ وہ جب یہاں آئی تھی تو قدیم طرز پر بنی اس سبز پوش گول عمارت کی دوسری اور تیسری منزل پر بنی راہداریوں میں چکر کاں

سسی کی نانی نے بڑی آس امید کے ساتھ اس سے مدد طلب کی تھی۔

"جب وہ اپنے رسم ورواج سے آگے نہیں بڑھ سکتا تو پھر تو ہی اپنی عزت کی خاطر پیچھے ہٹ جا سسی۔" اس کے سمجھانے کا انداز ایسا تھا کہ کسی نے اسی وقت ہاں کردی۔

اگلے دن جب جنگل میں شام اتر رہی تھی تو اس گول عمارت کے بیرونی احاطے میں رسم کی مٹھائی بانٹی جارہی تھی مگر اس کی سکھیاں عجیب گیت گارہی تھیں۔

پنوں میں تاسکھ لئی اے
ہنہ، ہونگ بلوچاں والی

سسی نے اس دل چیرتے گیت پر انگلی میں چمکتے چھلے کو دیکھ کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں نے اس کو تو چھوڑ دیا ہے مگر اس کی محبت مجھے نہیں چھوڑے گی بی بی۔"

"آہ!" بی بی کے اندر کوئی الاؤ سا سلگا۔ اس نے یہ کیسی بات کی تھی کہ آج ہفتوں بعد اسے وہ شخص یاد آیا جسے اس گول عمارت کی راہداریوں پر چکر کاٹتی جانے کیوں ہر روز وہ حد نگاہ تلاشتی تھی۔ رعنا بھابھی نے کہا تھا کہ وہ تمہاری پراپرٹی کے متعلق تم سے آخری بار بات چیت کرنے کبھی نا کبھی تو آئے گا۔ ہر سسی نادانی میں مرزا سے محبت کر بیٹھتی ہے مگر جب اس کا پنوں آتا ہے تو سسی بانس کے جنگل میں کھلنے والی کھڑکی بند کرکے چاندی کے چھلے پہن کر اپنی سکھیوں کے ساتھ اونچی آواز میں سر لگاتے لگاتے اسے اپنے پنوں سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔

اب جنگل میں شام گہری ہورہی تھی۔ اس کی نگاہ دوسری منزل کے جھروکے کی جانب اٹھتی ہے۔ اس کی نگاہ ساکن ہوتی ہے کیا وہ آگیا تھا۔

ڈاچی پیچ داراہ بھل جاوے
کدی خان پنل مڑ آوے

سسی اپنی سکھیوں کی آواز میں آواز ملا کے تالیاں بجارہی تھی۔ اس کی نگاہ جھروکے میں کھڑے اس شخص پر ٹکی تھی کیا وہ آخری بار آیا تھا۔ اس کا دل ڈوبا۔ اس کا دل چاہا وہ بھی سکھیوں کی آواز سے آواز ملا کر اونچی آواز میں گائے۔

پنوں میں تاں سکھ لئی اے
ہنہ ہونگ بلوچاں والی

☆☆☆

قسام نے ہاتھ میں پکڑا فولڈر اس کی طرف بڑھایا۔

"بزنس میں جو تمہارے شیئرز تھے، وہ میں نے ولید کو فروخت کردیے ہیں۔ اس میں تمہاری پراپرٹی کی تمام تفصیل کے ساتھ تمہارا اکاؤنٹ نمبر اور چیک بھی موجود ہے۔ باقی شکارگاہ سے متعلق تمہاری زمین کے کاغذات ہیں۔"

وہ اس کے ہاتھ میں موجود فولڈر کو تھامے بنا اسے دیکھتی رہ گئی جیسے کہنا چاہتی ہو۔

"بس یہی کچھ..... کوئی ہالہ، کوئی دائرہ وہ آدھا تالاب وہ کیسری پھول۔"

سفید شلوار سوٹ میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کی پیشانی پر چمکتے پسینے کو دیکھتا وہ اس کی ایک ایک جنبش کو سمجھ رہا تھا جیسے وہ دونوں پلک جھپکتے تو منظر بدل جاتا جیسے وہ دونوں اس منظر کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ دو قدم آگے آئی مگر اس نے وہ فائل نہیں تھامی۔

"مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔" ایسا کہتے ہوئے اس نے اپنی ٹھنڈی اور بھیگی مٹھی اس کے سامنے کھولی۔

اس مٹھی بھر کاغذ پر ایک خالی پیڑ کا اسکیچ تھا۔ وہ اسے سمجھتا تھا لیکن وہ اکثر اسے حیران کرجاتی تھی۔

وہ چار قدم آگے بڑھا۔

"کیا میں تمہیں ایک تھپڑ مارنے کی خواہش بھی پوری کرسکوں گا۔" اس نے وہ کاغذ اٹھانے کے بجائے اس کی مٹھی کو اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا۔

ورشہ کا دل چاہا وہ اسے جانے نہ دے اسے روک لے۔ اور پوری شدت کے ساتھ روئے اسے بتائے۔ سارے ماہ وسال تو اسیری میں گزر گئے۔ اب رہائی کہاں ممکن تھی۔ وہ اپنی اس خواہش پر عمل کرنے کے موڈ میں تھی کہ ایک تیز دستک کے بعد کسی نے کمرے میں جھانکا۔

صاحب آئی لمحہ رہا ہے کہ ہم نے آپ کے آنے کی خبر کسی کو بھی نہیں دی پھر بھی باہر بڑے ڈرائنگ روم میں کوئی پچاس مہمان آپ کے منتظر ہیں۔"

کسی کے ہونٹوں میں چھپی مسکراہٹ سے زیادہ وہ اس کی بات پر ٹھنڈی ٹھار ہوئی۔

"کیا یہ علاقہ اور گھر واقعی میرے دادا کا ہے؟"

وہ جب یہاں آئی تھی تو اس سچ سے بے گھر کے متعلق دن میں کئی بار یہ سوال پوچھتی تھی مگر کسی چالاکی سے بات بدل دیتی تھی، گویا یہ رعنا بھابھی اور قسام کی ملی بھگت تھی۔ وہ اب شدید حیرت کے عالم میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر اس وقت بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔

"بابا کہتے تھے، میرے بعد تمہیں بہت سے مسائل کا سامنا ہوگا جنہیں تمہیں طاقت اور پیسے سے نہیں بلکہ عقل اور ذہانت سے حل کرنا ہے۔ یہ تو میں نے بہت بعد میں جانا کہ تم میری زندگی کا وہ واحد مسئلہ ہو جسے واقعی مجھے عقل اور ذہانت سے حل کرنا چاہیے تھا۔"

وہ دو قدم آگے آیا۔ یعنی وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اس کی شکارگاہ میں تھی۔

"کیا میں تمہیں کسی انجان علاقے میں گم ہونے کے لیے تمہارے حال پر چھوڑ دیتا۔" اس نے ورشہ کے ٹھنڈے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"کیا تم قسام مالک سے چھپا سکتی تھیں کہ تمہاری ہیئر پن پہ اس رات وہ تلی مر گئی تھی اور کیا تم نے رخ موڑ کر مجھ سے چھپا لیا تھا کہ اب دیوان ہاؤس چھوڑنے میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی۔ یہاں بھی میں نے ذہانت سے کام لیا اور ممی کے سامنے انتہائی جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے سچ اگلوالیا۔"

"بانس کا جنگل کاشت کرنے والے جب پھول چننے والی لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے تو اسے اپنے وقار کو بحال رکھنے کے لیے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بار پھر اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار تھی۔

وہ اب ام میرات کی طرح پیشانی تک دوپٹہ لیتی کسی کو لیا اسی کی طرح وہ ہمایوں اور قسام کے خاندان سے پوشیدہ اس گول حویلی میں زندگی گزار دیتی۔

"کیا میں تمہاری انا کا قد نہیں جانتا۔ اس بار میں سارے فیصلے کر کے آیا ہوں اور میں اس کیسری پھول کو ڈھونڈنے والی لڑکی کے لیے دیوان ہاؤس سے دست بردار ہو کے آیا ہوں۔ میں اپنی فیملی کی موجودگی میں اپنی تمام پراپرٹی تمہارے نام کر کے آیا ہوں۔"

اس شخص کی محبت نے اسے کس، کس مقام پر نہیں چونکایا تھا۔ وہ اس کی باتوں پر سن ہوئی، جامد ہوئی مگر قسام وہ کتنے مشکل فیصلے کر کے آیا تھا۔ وہ اس سے کیا کہتی، اس کے ہونٹ کپکپا کے رہ گئے۔

"میں انہیں یہ بھی بتا کر آیا ہوں کہ کل شام اپنے نکاح کی تقریب میں، میں اپنی فیملی کا انتظار کروں گا۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔

اس بات کے جواب میں وہ کچھ کہنے والی تھی کہ اس نے سپاٹ انداز میں ٹوک دیا۔

"ایک آخری مسئلہ ہے، لیکن اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔"

"کوئٹہ کی ساری لڑکیاں جانتی ہیں کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں، اس لیے میں اب کراچی شفٹ ہونے کا سوچ رہا ہوں۔ وہاں کچھ چانس تو نکلے گا۔"

یہ پہلی بات تھی جو اس نے مسکرا کے کی تھی اور بات کو سمجھنے پر اس نے تیوری چڑھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کی گرفت سے ہاتھ چھڑانا چاہا تو وہ اس کی ہتھیلی کو تھامتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔

"یہ پورا جنگل اور اس میں اگنے والا ہر پھل، پھول اب تمہارا ہے۔ میں زندہ رہنے کے لیے صرف محبت ذخیرہ کروں گا۔" اس کی آواز مدھم ترین ہوئی۔ "تمہاری محبت۔" وہ اس بات پر پوری کی پوری نم ہوئی۔

کچھ لوگوں سے محبت کرنا پھر اس محبت کو نبھانا آسان نہیں ہوتا۔ مگر قسام مالک نے اس سے ہر حال میں نا صرف محبت کی تھی بلکہ نبھائی بھی تھی۔

☆

نرمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکر قندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

نرمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ نرمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے نرمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ نرمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹو میٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ نرمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالی آ رہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گنوا نہ دیں کہیں

pklibrary.com

منشی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں نرمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔
ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے، وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔

Khawateen Digest August 2021

نرمین افشاں اور ان کی امی کے ساتھ بازار جاتی ہے جو تاریدے، وہاں مراد اسے دیکھتا ہے وہ اس پر فدا ہو جاتا ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔

افشاں رکھ لیتی ہے لیکن نرمین ڈر کے مارے ثمینہ کو سب بتا دیتی ہے۔

مراد کاکا سے کہتا ہے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاکا کہتا ہے کہ وہ اور منشی رشتہ لے جائیں گے۔

ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھاتا اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔

ثریا کو تھرکتا دیکھ کر رشیداں کو غصہ آیا ہے۔

نرمین پانچ سو کی ٹیوشن پڑھانے لگتی ہے۔ انور حسین ثمینہ کے منع کرنے کے باوجود اجازت دے دیتا ہے۔ وہ تمبردار کے گھر بھی ہو آتا ہے۔

ثریا ملک صاحب کے گھر سے کھانا چوری کر کے لے کر آتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے۔

رشیداں کو ملک صاحب کے گھر سے چاول ملتے ہیں۔ رفیق اسے گالیاں بکتا ہے۔

مراد کو بخار ہو جاتا ہے۔ کاکا اسے دیکھنے آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اسے اب شادی کر لینی چاہیے۔ وہ انور حسین کی بیٹی نرمین کا کہتا ہے۔ کاکا رشتے کے لیے منشی کو لے جانے کا بھی کہتا ہے۔ منشی ہامی بھر لیتا ہے۔

مراد اور کاکا، انور حسین کے گھر منشی کا انتظار کر کے چلے جاتے ہیں۔ منشی بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ مراد کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ انور حسین سے کہتا کہ تو نے یا تیری بیٹی نے مراد کو پھنسایا ہے۔

مراد منشی کو گھونسا مارتا ہے۔ اس کی ناک سے خون نکلتا ہے۔ کاکا زبردستی مراد کو لے جاتا ہے منشی بھی دھمکیاں دیتا چلا جاتا ہے۔

مراد فرخ کو بتاتا ہے کہ وہ نرمین کے لیے رشتہ لے گیا تھا۔ اور منشی کا بھی بتایا ہے۔ فرخ صدمے سے وہاں سے آ جاتا ہے۔

ثریا بشیر سے ملنے باغ میں جاتی ہے وہ دوبارہ رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔

رشیداں ثریا کے لیے رشتہ دیکھتی ہے وہ لوگ آئے بیٹھے تھے کہ ثریا بشیر سے مل کر آتی ہے وہ انکار کر کے چلے جاتے ہیں۔ افشاں نرمین کو زبردستی مراد کی گلی سے لے کر آتی ہے مراد کے ملنے پر اسے خوش خبری سناتی ہے کہ نرمین کے ابا مراد کو ہاں کہنے والے ہیں۔

فرخ اپنی ماں سے نرمین کی بات کرتا ہے وہ اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتی ہیں۔ وہ غصے میں نرمین کے گھر جاتا ہے جہاں افشاں اسے نرمین کی شادی کی خبر سناتی ہے۔

منشی انور حسین سے پورے پیسے دینے کا کہتا ہے۔ وہ پریشان گھر آتا ہے ثمینہ اسے کہتی ہے کہ فوراً مراد سے نرمین کا نکاح کر دو، انور حسین منشی سے کچھ وقت مانگ لیتا ہے۔

رفیق رشیداں سے کہتا ہے کہ اسے اسپتال لے جائے۔ کیوں کہ اس کے زخم پک رہے تھے۔ نرمین ٹیوشن پڑھانا چھوڑ دیتی ہے۔ مراد گھر پہنچتا ہے تو اس کا سامان باہر پڑا ہوتا ہے۔

کاکا اس کے گھر میں رنگ و روغن کروا دیتا ہے۔ فرخ نرمین کو مراد سے شادی نہ کرنے کا کہتا ہے۔ نرمین اسے گھر سے بھگا دیتی ہے۔ دروازے پر مراد آتا ہے۔ اس وقت ثمینہ اور افشاں کی امی بھی آ جاتی ہیں۔ مراد بچوں کے لیے پرالے کر آتا ہے۔ ثمینہ کہتی ہے کہ نرمین وہ تیرا بہت خیال رکھے گا، بڑے دل والا ہے۔ وہ ثمینہ سے نرمین کو بازار لے جانے کا کہتا ہے۔ افشاں اور اس کی امی کے ساتھ ثمینہ، نرمین کو بھیج دیتی ہے۔ اسی دوران منشی آ جاتا ہے، ثمینہ اسے دروازے سے ہی ٹرخا دیتی ہے۔ منشی کو گلی سے نکلتے ہوئے مراد کا رکشہ نظر آتا ہی، وہ انتقامی کارروائی کا سوچتا ہے۔

رشیداں کے ٹوکنے پر ثریا اس پر گرم چائے پھینک دیتی ہے۔ رفیق کے زخم سڑ جاتے ہیں۔ رشیداں اس کے بھائی کو

بلاتی ہے، وہ اسے لاہور لے جاتا ہے لیکن رفیق مر جاتا ہے۔

نرمین کے گھر میں بارات کے استقبال کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ نرمین دلہن بن چکی تھی۔ انور حسین بارات کا انتظار کر رہا تھا کہ کاکا آ کے بتاتا ہے کہ مراد کو پولیس پکڑ لے گئی۔

شادی کے گھر میں یہ خبر بجلی بن کر گرتی ہے کہ مراد کو پولس پکڑ کر لے گئی ہے۔

رفیق کے مرنے کے بعد اس کا بھائی شفیق اپنے بیٹے سے ثریا کا نکاح کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ثریا کو عین وقت پر پتا چلتا ہے کہ اس کی شادی بشیر سے نہیں کسی اور سے ہو رہی ہے تو وہ غصہ کرتی ہے۔ رشید اس کے دیے سوٹ کو آگ میں جھونک دیتی ہے اور بشیر سے رابطہ کر کے عین شادی کے وقت گھر سے بھاگ جاتی ہے، انصی کو دھمکا کر جاتی ہے۔

نکاح کے لیے آنے والوں کو پتا لگتا ہے تو سب باتیں بناتے ہیں۔

منشی، انور حسین کو دھمکیاں دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے بچوں کو اور اسے جیل بھیج دے گا، وغیرہ وغیرہ۔ انور حسین مان جاتا ہے۔ ثمینہ اور خدیجہ نرمین سے کہتی ہیں کہ وہ بھاگ جائے لیکن نرمین باپ کی حالت دیکھ کر منشی سے شادی پر رضا مند ہو جاتی ہے۔

ثریا کے بشیر کے ساتھ بھاگ جانے پر بارات واپس چلی جاتی ہے۔ کاکے کو یہ سن کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ انور حسین، نرمین کا نکاح منشی سے کرنے پر راضی ہے۔ خدیجہ گھر آتی ہیں تو فرخ بہن کے گھر سے واپس آ چکا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ منشی کو مراد کے نکاح کی خبر اسی نے دی تھی۔ خدیجہ اسے مارتی ہیں۔

کاکا مراد کو جا کر بتاتا ہے کہ منشی کے دھمکانے پر انور حسین، نرمین کا نکاح منشی سے کرنے پر راضی ہے۔ مراد کو غصہ آتا ہے۔

تصبح ہو جاتی ہے منشی نہیں آتا۔ خبر آتی ہے کہ منشی کو کسی نے قتل کر دیا۔ منشی کی بیوی اسپتال میں بیان دیتی ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ حملہ آور کون تھے۔ منشی بچ جاتا ہے۔ نسیمہ کے بھائی اس کا علاج کرواتے ہیں۔ بشیر نسیمہ کو بچانے کے لیے منشی کو مارتا ہے۔ بشیر کے گھر پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ بشیر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ثریا کو مارتی ہے۔

نویں قسط

نرمین کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

وہ خود مشکل میں تھا۔ ان سے دور تھا۔ خود کو رہائی دلانے کے لیے اسے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ مگر اسے اب بھی نرمین اور اس کے گھر والوں کی فکر تھی۔ محبت صرف لب و رخسار کی تعریف کرنے یا محبوب کے تصور میں کھوئے رہنے کا نام نہیں ہے۔ محبت بنا کہے جان لینے کا نام ہے۔ محبت وہ تھپکی ہے جو زمین پر گرے انسان کو پھر سے کھڑا ہونے پر اکسائے، نرمین نے اپنے نڈھال وجود کو کھڑا ہوتے دیکھا۔

اسے وہ تھپکی، وہ لمس، وہ سہارا مل گیا تھا۔

''تم رو کیوں رہی ہو؟'' فرخ کی ہتھیلیوں میں بے چینی اتر آئی۔ وہ نرمین کے آنسو سمیٹ لینا چاہتا تھا۔

نرمین نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور ہنس دی۔

''ہمیں تو خوشی میں بھی رونا آتا ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں فرخ! میں کچھ لمحے پہلے تک گہری دھند میں تھی۔ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ جیسے انسان پاگلوں کی طرح جنگل میں راستہ ڈھونڈے اور اسے راستہ نہ ملے۔ یہ۔'' نرمین نے پیسے ہتھیلی پر رکھ کر ہتھیلی فرخ کے سامنے پھیلائی۔

''یہ پیسے نہیں، یہ میرا کھویا ہوا راستہ ہے۔''

''تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہتیں۔'' فرخ کو برا لگا۔ نرمین نے مٹھی بند کر لی اور مسکرائی۔

''میں نے تو اس سے بھی نہیں کہا۔''
فرخ شرمندہ ہو گیا۔
''مراد سے کہنا.....'' نرمین کہتے کہتے رکی۔
''مراد سے کہنا ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ کاکے نے دیے تھے۔'' فرخ بدمزا ہوا۔ ''آئندہ بھی دیتا رہے گا۔''
''میں کون سا ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ کاکے نے دیے تھے۔'' فرخ بدمزا ہوا۔ ''آئندہ بھی دیتا رہے گا۔''
''ٹھیک ہے ویسے بھی کچھ کہہ کر اس کی محبت اور خلوص کا قرض تو نہیں اترے گا۔''
''نمو! کب سے دروازے پر کھڑی ہو۔ کیا ہوا؟'' ثمینہ چلی آئی۔
''امی! مراد نے پیسے بھجوائے ہیں۔'' نرمین نے خوشی سے کانپتی آواز میں بتایا تو ثمینہ مراد کا رواں رواں مرد کے لیے دعا کرنے لگا۔ فرخ کو اپنا آپ بے کار لگا۔ وہاں نہیں تھا لیکن مراد کا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنی غیر موجودگی کے باوجود سارے منظر پر چھایا ہوا تھا۔

ثمینہ کی دعاؤں میں
نرمین کی مسکراہٹ میں
اس کی ہتھیلی اور آنسوؤں میں
ہر طرف مراد ہی مراد تھا

فرخ خاموشی سے چلا گیا۔
وہ حسد میں جلتا وہاں سے آیا تھا اور گلی کا موڑ مڑنے تک ہار گیا۔
''یہ پیسے نہیں۔ یہ میرا کھویا ہوا راستہ ہے۔'' نرمین کی ہتھیلی پوری سڑک پر پھیلی تھی۔
''تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہتیں کونے میں لگے پیپل کے چوڑے پتوں نے شکوہ کیا۔
''میں نے تو اس سے بھی نہیں کہا۔'' پیپل کی چھاؤں سے نکل کر وہ دھوپ میں آ گیا۔
حقیقت اور سچائی اس کے سامنے عیاں ہو گئی۔
''تو محبت یہ ہوتی ہے فرخ۔'' اس نے مایوسی سے سر جھکا کر دھوپ میں لشکتی سڑک کو دیکھا۔
''جو تم نے کی، وہ کیا تھی؟''
''نہیں، محبت نہیں تھی۔'' اس کے اندر شدت سے نفی میں جواب آیا۔
وہ ہار گیا تھا۔
مراد کی محبت نے فرخ کے سامنے آئینہ رکھا تو اس نے اپنی ہی شکل دیکھنے سے منہ پھیر لیا تھا۔

☆☆☆

''لاؤ۔ میں سودا لاتی ہوں۔'' ثمینہ نے جلدی سے چادر اوڑھی۔
''نہیں۔ سودا لینے میں خود جاؤں گی۔'' نرمین نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔
''کیوں؟''
''کیونکہ جو سودا مجھے لینا ہے، وہ آپ نہیں لا کر دیں گی۔'' نرمین ہنسی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ جیسے اس نے کچھ ٹھان لیا ہو۔ کچھ کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ نرمین نے محلے کی دکان سے جو چیزیں خریدیں، ان میں سے آدھی پر تو ثمینہ کو اعتراض تھا۔ اعتراض تو ایک طرف، ان کا دل ڈوب رہا تھا۔ نرمین کیوں فالتو پیسے لگا رہی تھی اس سے پہلے دکان پر کبھی آنا نہ ہوا تھا۔ چادر میں منہ چھپائے نرمین کے چٹکیاں کاٹتی رہی۔ مگر نرمین نے اپنی لسٹ بنا رکھی تھی۔ اسی کے مطابق ساری چیزیں لیں۔
''چاچا! یہ اخبار لے لوں۔'' دکان سے نکلتے ہوئے اس نے ایک طرف پڑے پرانے اخبار کے پلندے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تو دکاندار نے اخبار اسے دان کر دیے۔

ہاتھوں میں سودا سلف میں اخبار والے وہ خوشی خوشی گھر واپس آ گئیں۔
''یہ چیزیں کیوں لی؟ ہیں ہمیں ان کی ضرورت نہیں تھی۔'' سامان سنبھالتے ثمینہ نے دوسرے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔ انہیں واقعی اس عیاشی کی ضرورت نہیں تھی۔ بیسن، چنے، چاٹ مسالا، کالی مرچ، املی۔
''ان ہی کی تو ضرورت تھی۔'' نرمین نے چنے پتیلی میں ڈال کر بھگو دیے۔
''چنے پکاؤ گی؟'' ثمینہ نے الجھ کر پوچھا۔
''نہیں آلو شوربا بنالیں۔'' اس نے املی بھی بھگو دی۔ ''یہ تو ہم نے دوجمع دو کرنے ہیں۔''
''نمو.....'' ثمینہ نے اداسی سے بیٹی کو دیکھا۔ ''تمہارے ابو بریڈھی لے کر نہیں جائیں گے۔''
''ابو نہیں میں لے کر جاؤں گی۔''
ثمینہ کے آلو اٹھاتے ہاتھ رک گئے۔ تعجب سے بیٹی کو دیکھا۔ جیسے وہ مذاق کر رہی ہو۔
مگر نرمین بہت سنجیدگی سے اپنے کام میں مگن تھی۔
''پاگل تو نہیں ہو گئیں۔''
''ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تو ابو کی طرح ہو جاؤں گی۔''
نرمین نے بچوں کو آواز دے کر ہدایات جاری کیں۔
''ریڑھی کو سیدھا کر کے اچھی طرح دھو دو۔'' نقاہت زدہ بچوں نے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔
نرمین نے دس روپے والا بسکٹ کا ایک ایک پیکٹ سب کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ اچھلتے کودتے چلے گئے۔
کونے میں پڑی ریڑھی کو سیدھا کیا اور نل کھول لیا۔
''نمو! تم نہیں جاؤ گی۔'' ثمینہ کے اندر کی ماں انگڑائی لے کر جاگی۔
''تو آپ چلی جائیں۔'' نرمین کے اطمینان نے ثمینہ کو لاجواب کر دیا۔ ماں کی خاموشی محسوس کر کے نرمین اس کی طرف مڑی۔
''امی! انسان مرنے والا ہو تو مردار بھی جائز ہو جاتا ہے لیکن مجھے مردار نہیں کھانا اور نہ اپنے بہن بھائیوں کو کھلانا ہے۔''
''نمو! تم لڑکی ہو.....''
''پہلے میں انسان ہوں۔''
''لوگ نہیں سمجھتے، باتیں کریں گے۔''
''تو ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی دیکھی ہیں۔ کالونی کی طرف جائیں تو پھولوں والی سڑک کے کنارے عورتیں بیٹھی ہوتی ہیں۔ سفید چادر تو ہو گی ناں آپ کے پاس۔''
''میں تھپڑ لگاؤں گی۔'' ثمینہ کو غصہ آ گیا۔
''اس سے کیا ہو گا؟'' نرمین کے لہجے میں بغاوت در آئی جس نے ثمینہ کو دل ہی دل میں ہولا دیا۔ اسے لگا وہ نرمین کو نہیں روک پائے گی۔
''امی! ہم کب تک لوگوں کی شکلیں دیکھیں گے۔ کب تک امداد کا انتظار کریں گے۔'' نرمین پھٹ پڑی۔
زندگی اس طرح نہیں گزرتی۔ اگر گزرتی بھی ہو تو مجھے قبول نہیں۔ اللہ نے مجھے ہاتھ پاؤں دماغ سب کچھ دیا ہے۔
''اور مشی نے راستہ روک لیا تو۔''
''وہ ابو جی نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ اب نہیں روکے گا اور اگر اس جیسا کوئی اور سامنے آیا تو خاموش نہیں رہوں گی۔ اتنا چلاؤں گی کہ ساری دنیا جمع ہو جائے۔'' نرمین کے لہجے میں پختہ ارادے کی جھلک در آئی۔
''الزام تو تم پر ہی آئے گا۔'' ثمینہ بے بس ہو گئی۔

بہاتے، چھلانگیں لگاتے چہلیں کررہے تھے۔
نرمین کمرے میں چلی آئی۔ انور حسین زمین پر بازو کا تکیہ بنائے کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال بڑھ گئے تھے۔ نرمین اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا بسکٹ کا پیکٹ کھولا۔ پیکٹ کی آواز پر انور حسین نے مندی مندی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
نرمین نے بسکٹ توڑ کر باپ کے منہ میں ڈال دیا۔
انور حسین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور بسکٹ چبانے لگا۔
''ابو جی! آپ نے تو ہمت ہار دی۔ لیکن میں نہیں ہاروں گی۔ آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔ آپ کا علاج کرواؤں گی۔ آپ بالکل پہلے جیسے ہو جاؤ گے۔ ان شاء اللہ۔'' انور حسین نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خود کھانے لگا۔
نرمین گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔
''امی سالن بنا رہی ہیں۔ میں روٹی لے کر آتی ہوں۔''

☆☆☆

ریڑھی پر رکھے پکوڑے، آلو کی بیسن والی ٹکیاں، آلو چنے کی چاٹ کپڑے سے ڈھکی تھی۔
چاٹ مسالا، املی کی چٹنی، اخبار کے پھاڑے چوکور ٹکڑے اس نے دوپٹہ اپنے وجود کے گرد لپیٹا اور ریڑھی باہر نکال لی۔ ثمینہ نے بھاگ کر دروازے کا پٹ پکڑ لیا۔
وہ دوراہے پر کھڑی ماں تھی۔ جس کے سینے میں ہزاروں خدشے دہکتے تھے۔
وہ بیٹی کو روک لینا چاہتی تھی۔
پھر اندر کی عورت تھی۔ جو دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔
''جانے دے۔ نرمین راستہ بنا لے گی۔ اس پر اعتبار کر۔''
''امی! دیر ہو رہی ہے۔ مجھے چھٹی سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔'' نرمین نے جھنجھلا کر کہا تو ثمینہ نے دعا پڑھ کر اس پر پھونکی اور ہاتھ ہٹا لیا۔
نرمین نے ریڑھی نکال لی۔
ساتھ والے گھر کا دروازہ کھول کر افشاں نے قلفی والے کی تلاش میں باہر جھانکا اور پھونچکی رہ گئی۔ پھر خیال آنے پر جوش سے پوچھا۔
''نمو! چاچا جی کام پر جا رہے ہیں؟''
''نہیں، نمو کام پر جا رہی ہے۔''
افشاں کا منہ کھل گیا۔
جب بھی افشاں کے بھائی کا موبائل ہاتھ لگتا تھا نرمین فلم، ڈرامہ، گانے دیکھنے کے بجائے ایسی عورتوں کی وڈیوز نکال کر دیکھتی تھی۔ جنہوں نے کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑے ہونا قبول کیا تھا۔
''تو پھر جا، مگر بوہنی کروا کے بھیجوں گی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا پچاس کا نوٹ ریڑھی پر رکھ دیا تھا۔ پھر دونوں کھلکھلا کر ہنسیں۔ ثمینہ نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور مرے مرے قدموں سے اندر چلی آئی۔ جہاں انور حسین خاموشی سے اپنا پیر کھجا رہا تھا۔
''کچھ نہیں کر سکتے تھے تو بیٹی کے ساتھ ہی چلے جاتے۔''
''اس کی تو شادی ہو گئی ہے۔'' انور حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں پکوڑے اور ٹکیاں نہ بیچ رہی ہوتی۔"

☆☆☆

سر پر پگھلتا سورج تھا اور پیروں میں تپتی کولتار کی سڑک۔
وہ کالونی کی دو اطراف پھولوں سے گھری سڑک پر پہنچ گئی۔
وہیں کنارے پر کپڑا بچھائے سفید چادر اوڑھے، آدھا منہ ڈھکے مظلومیت کی تصویر بنی عورت شکر دوپہر میں پگھلی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کو زمین کا دل چاہا۔ وہ بھی یہیں بیٹھ جائے۔ پکوڑے اور ٹکیوں سے تو زیادہ ہی کمالے گی۔ مگر دور بجتے اسکول کی چھٹی کی گھنٹی نے اسے کمنڈال کر کھینچ لیا۔ زمین نے ریڑھی وہیں کھڑی کی جہاں انور حسین کھڑا کرتا تھا۔
چھٹی کے بعد بچے سیل رواں کی طرح گیٹ سے بہتے چلے آئے۔ زمین کو یہ دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ کس کی آنکھوں میں اس کے لیے حیرت تھی یا ناگواری، بچوں نے اسے گھیر لیا۔
اس نے باپ کے ساتھ مل کر بہت دفعہ یہ گاہکی نبھائی تھی۔
اس کے ہاتھ سرعت سے دس بیس کے نوٹ سمیٹنے اور پکوڑے ٹکیاں بانٹنے میں لگ گئے۔ یوں گھنٹے کے اندر اندر سارا سودا بک گیا۔
اس نے پسینہ صاف کر کے ایک بچا ہوا پکوڑا منہ میں ڈالا اور ہنس پڑی۔
پست حوصلے والے تیرا ساتھ کیا دیں گے
زندگی ادھر آجا، ہم تجھے گزاریں گے
واپسی کا سفر ہلکا پھلکا رواں اور سبک تھا۔
وہ عین اس عورت کے سامنے رکی۔ اپنی چھوٹی سی صندوقچی میں سے دس روپے نکال کر اس عورت کی طرف بڑھائے۔ اس عورت نے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔ آدھا ڈھکا منہ، کمان سی بھنویں۔ تین کریمیں مکس کر کے اشکائی جلد۔ زمین نے گھن کھا کر نوٹ چھوڑا۔ اس عورت کی ہتھیلی پر گرا اور زمین کا دل سجدہ ریز ہو گیا۔ اس کے رب نے اسے دینے والا ہاتھ بنایا تھا۔ لینے والا نہیں۔

☆☆☆

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔" ثمینہ چلے پیر کی بلی کی طرح صحن میں چکرا رہی تھی۔
"میں طلحہ اور حذیفہ کو ہی ساتھ بھیج دیتی۔"
طلحہ اور حذیفہ کے ہاتھ میں کوئلہ آ گیا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے دیوار پر نقش و نگار بنا رہے تھے۔
"اکیلی لڑکی کو بھیج دیا۔"
وہ کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی انور حسین منہ کھولے سو رہا تھا۔ اس کی ضروریات بہت محدود ہو گئی تھیں۔ آلو کے شوربے میں دو روٹی ڈبو کر کھانے کے بعد سونا ہی سب سے بڑی حاجت تھی۔ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹی اور دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔
"فرخ نظر آ جائے تو اسی کو بھیج کر پتا کرواؤں۔"
دور دور تک خاموش گلی۔
گھروں کے سامنے نیم اور پیپل کے درختوں میں دم سادھے سرد ہوا۔
اور دور باغوں سے کوئل کی کوک بھری دوپہر میں ساون مانگتی تھی۔
"ہائے ساون....."

شادی کے ابتدائی دنوں میں، کوئل کی کوک، بارش کی خوشبو اور ادھ کھلے گلابوں کی مہک بھلی لگی تھی۔ وہ اسی طرح دروازے میں کھڑی انور حسین کا انتظار کیا کرتی۔

وہ ہمیشہ دکان سے واپسی پر اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ کبھی سموسے، کبھی جلیبیاں اور کبھی گجرے۔

اس کی سائیکل کی ٹن ٹن جو گلی کے کونے سے شروع ہو کر گھر کے دروازے پر بند ہوتی اس کوئل کی کوک سے کہیں زیادہ دلفریب تھی۔

''آہ..... ساون بھی بوڑھا ہو گیا۔'' ثمینہ نے دھندلی آنکھیں صاف کیں۔

''پاگل کبھی ساون بھی بوڑھا ہوتا ہے۔''

ایک بارش بھرے دن میں وہ خالی ہاتھ گھر آیا تو ثمینہ ناراض ہو گئی۔ نرمین کے بعد ثمرین اور فضہ پیدا ہو گئی تھیں۔ ثمینہ کے پاس اب وقت کہاں ہوتا کہ دروازے میں کھڑی ہو کر انور حسین کا انتظار کرے اور انور کی سائیکل ٹھٹھاتی تو ثمینہ سے پہلے وہ تینوں بھاگ کر شاپر قابو کر لیتی تھیں۔

''ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ورنہ تو اب بھی کوئی ثمینہ کسی نہ کسی دروازے میں کھڑی اپنے انور حسین کا انتظار کرتی ساون کے گیت گاتی ہو گی۔''

''کاش مجھے پھر سے گلی کے موڑ پر تمہاری سائیکل کی آواز سنائی دے۔''

مگر گلی خاموش تھی اور کوئل کی کوک ساون کی راہ دیکھتی تھی۔

پھر گلی کے نکڑ پر بڑھی کی پہلی جھلک دکھائی دی اور نرمین جس کے قدموں سے تھکن نہیں جوش لپٹا تھا۔ سالانہ امتحان پاس کرنے کی خوشی اس کے چہرے پر تمتما رہی تھی۔ دوسرے نکڑ سے فرخ نمودار ہوا اور بھونچکا رہ گیا۔

دوپٹے کی بکل مارے۔

پسینہ زدہ گندمی چہرہ۔

''یہ نرمین ہے؟'' فرخ کو اپنی بصارت پر شبہ ہوا۔ پھر اس نے خود کو دیکھا۔ سیاہ پینٹ پر سفید براق شرٹ، چمکتے جوتے، ہاتھ میں کتابیں اس نے پھر سے نرمین کو دیکھا۔ وہ اسے کتنی پیاری کتنی اچھوتی سی لگی تھی اور اب وہ اتنی عام، اتنی معمولی لگ رہی تھی کہ شاید وہ ایسی لڑکی کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ آن واحد میں فرخ نے خود کو بلند ہوتا محسوس کیا۔

نرمین کی شخصیت کا سحر اڑن چھو ہوا۔ وہ شہزادی سے مینڈکی بن گئی۔

''میں اس سے محبت کرتا تھا؟'' فرخ کو اپنے ہی اوپر حیرت ہوئی۔

نرمین نے بھاگ کر اماں کو چھپی ڈالی۔ اب وہ اپنی کمائی کا ڈبہ ماں کو دکھا رہی تھی۔

''میں نے اس ریڑھی والی نرمین سے محبت کی تھی۔''

فرخ کو خود پر حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ آنے لگا۔ اس کا ایک خاندان تھا۔ حیثیت تھی۔ اس کا باپ سرکاری ملازم تھا حیثیت واقعات ہزاروں میں تنخواہ لیتا تھا اور اس ڈبے میں کیا ہوتا۔ دس دس زیادہ سے زیادہ پچاس والے نوٹ۔

محبت کا جنوں لمحوں میں ٹوٹا۔

حیثیت اوقات نمایاں ہوئی۔ غرور کی پٹی آنکھوں پر بندھی تو یہ لمبی تڑنگی، گندمی رنگت والی لڑکی بھوک سے جس کے گالوں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اسے اتنی بے کشش اور معمولی لگی کہ جب نرمین کی نظر فرخ پر گئی اور اس نے جوش میں اسے پکارا تو..... وہ ''میں جلدی میں ہوں'' کہہ کر تیزی سے گلی عبور کر گیا۔

نرمین نے بے حد حیرت سے اسے جاتے دیکھا۔

مگر زیادہ محسوس نہیں کیا۔ آج اس کی کامیابی کا دن تھا۔

وہ ماں کو تفصیل بتانی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

ہتھاں وچ گجرا ڈھولنا وے تیرے ناں دا

وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا اور آئینے میں ثریا کا عکس تھرک رہا تھا۔ بشیر مسکرا کر پلٹا اور اس کی کلائی پکڑ لی۔

گجرا مرجھایا تھا اور اس کی باسی خوشبو گزری رات کی ان کہی کہانیاں سنا رہی تھی۔

''بس کر۔ نرگس ہی بنتی جا رہی ہے۔''

''کیا کروں، ان چند دنوں میں تم نے مجھے اتنی خوشیاں دی ہیں کہ سنبھالی نہیں جا رہیں۔'' وہ محبت کے نشے میں مدہوش تھی۔

بشیر نے اسے خوب گھمایا پھرایا اور کھلایا تھا۔

پورا گھر ثریا کی دسترس میں تھا۔

سکینہ کا میک اپ، اس کے نئے کپڑے۔ جو سکینہ کے جانے کے بعد درزن دے کر گئی تھی۔ سکینہ جا چکی تھی اور ثریا کو لگتا تھا۔ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

''دوپہر کو بھنڈی گوشت بنا لینا۔'' بشیر نے دھاگا توڑ ڈالا۔ پتیاں ان کے قدموں میں بکھر گئیں۔

''جا کہاں رہے ہو.....؟''

''تمہارے چونچلے پورے کرنے کے لیے کمائی بھی تو کرنی پڑے گی۔'' اس نے دوسری کلائی کھینچی۔

''ہائے اللہ یہ تو میرے پاس رہنے دے۔''

''میں نے زندگی میں کبھی باسی چیز پسند نہیں کی۔'' اس نے دھاگا انگلی میں لپیٹا اور کھینچ ڈالا۔ ثریا کے لبوں سے سسکاری نکلی تو کان کے پاس جھک کر جملہ مکمل کر گیا۔ ''سوائے تمہارے.....'' ثریا ششدر سی رہ گئی۔

''دوپہر میں کھانے کے لیے آؤں گا۔ دروازہ بند کر لینا۔''

''اس نے یہ کیوں کہا۔'' ثریا نے مڑ کر آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بشیر نے محلے کے پارلر سے اس کا فیشل کروایا تھا۔ پہلے دن تو کوئی خاص فرق نہ لگا۔ مگر دوسرے دن چہرہ تروتازہ اور جلد ملائم ہو گئی تھی۔ خوشبودار شیمپو سے دھلے بال کندھے پر بکھرے تھے۔ چہرے پر چھائی نحوست اور پکا پن جس سے خود اسے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ کیفیت اب معدوم ہو گئی تھی۔ آئینے میں ایک پیاری سی گھریلو شادی شدہ عورت کھڑی تھی۔ ایک جائز تعلق نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اسے خود پر پیار آ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ میٹھے بادام کھاتے کھاتے کڑوا بادام بھی منہ میں آ جاتا ہے۔'' ثریا نے خود کو تسلی دیتے ہوئے بشیر کی بات کو کڑوے بادام کی طرح تھوک دیا۔

''سکینہ..... سکینہ.....''

دروازہ کھلا تھا۔ بھائی تجسس میں دندناتی ہوئی صحن میں چلی آئی۔ حالانکہ پتا چل گیا تھا۔ گھر میں چل کیا رہا ہے۔

ثریا تیزی سے باہر نکلی۔

''سکینہ اب یہاں نہیں رہتی۔''

''کہاں گئی؟'' ساجدہ نے سرتاپا ثریا کو دیکھا اس نے وہی سوٹ پہن رکھا تھا۔ جو ساجدہ اور سکینہ ساتھ خرید کر لائی تھیں۔

''بشیر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔'' ثریا نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے بریکنگ نیوز سنائی جس کی ساجدہ کو پہلے سے خبر تھی۔

''مگر کیوں وہ تو سکینہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ دن کو رات

بھی تو مان لیتا یہی بھنوں کی جوڑی تھی۔ شام کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر واک کرتے نکلتے تھے۔" ساجدہ ثریا کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر مزید چٹخارے لینے لگی۔

"پیار تو وہ مجھ سے کرتا تھا۔ اس کمبخت نے تو بشیر کو پھنسایا تھا۔" ثریا پھٹ پڑی۔

"تم کون ہو؟" ساجدہ نے مصنوعی تعجب سے پوچھا۔ "میں تو سمجھی بشیر کی بہن آئی ہے۔"

"بہن ہوگی سکینہ، بیوی ہوں بشیر کی، اس کا پہلا پیار ہوں۔"

"ہائے اللہ، اب سکینہ کا کیا ہوگا؟"

"طلاق دے گا اور کیا ہوگا۔" ثریا تڑخ کر بولی۔

"پر بچے کا کیا ہوگا؟" اس بات کی توقع تو ساجدہ کو خود بھی نہیں تھی۔

"وہی پالے گی جس کا بچہ ہے۔ بشیر سے کہوں گی، طلاق میں بچہ بھی لکھ دے۔"

"وہ مان جائے گا۔"

"بشیر اب وہی کرے گا جو ثریا کہے گی۔" ثریا نے فخر سے سینے پر ہاتھ مارا۔

"جا کر بتا دینا اپنی سکینہ کو، بشیر کو بھول کر اپنے لیے کوئی اور ڈھونڈ لے کیونکہ سکینہ کی جگہ نہ بشیر کے گھر میں ہے نہ اس کے دل میں....."

ساجدہ ہونق سی صورت کے ساتھ واپس بھاگی۔

"ہونہہ، منحوس سکینہ کی ہمدرد بن کے آئی تھی۔ اب جا کر بتائے گی ایک ایک بات۔ سب پتا ہے جاسوسی کرنے آئی تھی۔"

ثریا نے زور سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھائی اور مڑ کر اپنے گھر کو دیکھا۔

"میرا گھر....." وہ ہنسی۔ کاش رشیداں آ کر دیکھتی۔ ثریا کتنے عیش میں رہ رہی ہے۔

☆☆☆

دھان کی بیجائی شروع تھی۔ رشیداں نے عدت ختم ہوتے ہی کام پر جانا شروع کر دیا تھا۔ اب اقصیٰ بھی اس کے ساتھ ہی آ جاتی۔ اکیلے گھر میں چھوڑتی بھی تو کس کے آسرے پر۔

اقصیٰ نے اکتا کر اپنی تختہ ہوتی کمر کو سیدھا کیا۔ کچھ کھیتوں میں دھان کی نوخیز مخملیں فصل سر اٹھا رہی تھی اور کچھ میں ابھی پنیری لگ رہی تھی۔ اس کے اردگرد عورتیں رکوع میں جھکی ٹخنوں تک پانی میں ڈوبی پنیری کے ایک ایک تنکے کو سرعت اور احتیاط سے بو رہی تھیں۔ انہیں میں رشیداں بھی تھی۔

"اماں! میں تھک گئی ہوں۔" اقصیٰ نے ہاتھ میں پکڑی پنیری ماں کو تھما دی۔

"اچھا تو جا....." رشیداں نے نرمی سے کہا۔ جانتی تھی، اقصیٰ کو ایسے کاموں کی عادت نہیں۔

"اس کو اتنا ملوک (نازک) کیوں بنا رہی ہے۔ کل کو اگلے گھر نہیں جانا؟" کسی عورت کو اقصیٰ کی نازک مزاجی ایک آنکھ نہ بھائی۔

"رب وارث ہے....." رشیداں نے نرمی سے کہا۔

اقصیٰ نے کینہ توز نظروں سے اس عورت کو دیکھا۔ کھالے کے بہتے پانی میں ہاتھ منہ دھو کر شہتوت کے درخت تلے آ بیٹھی۔ پاس ہی پانی کا گھٹا اور سلور کی قلفی میں ان کی روٹی بندھی تھی۔

رشیداں نے گرم گرم روٹی کے درمیان شکر ڈال دی تھی جو گرمائش سے پگھل کر روٹی کو نرم کر چکی تھی۔

اقصیٰ کو بھوک لگی تھی۔ مگر وہ ماں کا انتظار کرنے لگی۔

"رشیداں ماسی..... رشیداں ماسی۔"

اقصیٰ نے گردن گھما کر دیکھا۔ رسولاں کا لڑکا بلو تھا۔

''مگر اماں کو کیوں آواز دے رہا ہے۔'' کام کرتی عورتیں بھی متوجہ ہونے لگیں۔ گاؤں سے کھیتوں کی طرف آنے والے رستے میں وہ دھول اڑاتا جہاز کی طرح اڑتا آ رہا تھا رشیداں ماسی، رشیداں ماسی۔'' کی آوازیں کھیتوں کے پانیوں پرست ربڑ کی گیند کی طرح ٹپے کھانے لگیں۔

''تم لوگ یہاں کیا کر رہی ہو؟ ادھر تمہارے گھر میں۔''

اقصیٰ کے پاس رک کر دونوں گھٹنوں پر ہاتھ ٹکائے بلو نے اپنا سانس بحال کرنے کی کوشش کی تو جملہ ادھورا رہ گیا۔

''اب یہ نہ کہہ دینا کہ آپا ثریا واپس آ گئی ہیں۔'' اقصیٰ نے بے زاری سے کہا۔

رشیداں الٹے سیدھے پاؤں دھرتی ان تک پہنچی۔

''رب خیر کرے بلو.....''

''خیر نہیں ہے ماسی۔ انہوں نے تمہارے گھر کا سارا سامان باہر نکال دیا ہے۔'' اس نے جھکے جھکے رشیداں کے پیروں میں بم پھوڑا۔

دونوں حواس باختہ ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔

''کنوں نے .....؟'' اقصیٰ نے بلو کا بازو جھنجھوڑا۔

''پتا نہیں۔''

''چل اقصیٰ۔'' رشیداں نے جلدی جلدی سامان سمیٹا، چپل پہننا بھی بھول گئی جو اقصیٰ نے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ کھیت، باغ، مچھلی، تالاب۔

جانوروں کے باڑے اور گاؤں کی کچی پکی گلیاں ٹاپتے۔ خدشوں کو پالتے جب وہ گھر کے سامنے پہنچیں تو وہاں گھر نہیں تھا۔

اقصیٰ نے بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلیں۔ آج صبح انہوں نے چولہے پر روٹی پکائی تھی اور اقصیٰ نے اپنے چھوٹے چھوٹے چوزوں کو دانہ ڈالا تھا اور انہیں ڈربے میں بند کر کے صحن میں جھاڑو دی تھی تو وہاں ان کا گھر تھا۔

اور اب وہاں گھر نہیں جانوروں کا باڑا تھا۔

ان کا سامان باہر گلی میں پڑا تھا جس کے درمیان ننھے منے چوزے چوں چوں کرتے پھر رہے تھے۔ اقصیٰ کو دیکھتے ہی بھاگ کر پیروں میں چلے آئے۔

اقصیٰ نے خوف زدہ ہو کر ماں کو دیکھا۔ پیلا پٹھک چہرہ۔

گاؤں والے تماشا دیکھنے کو کھڑے تھے صرف تماش بین نہیں تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ان کے لیے ہمدردی اور ترس بھی نمایاں تھا۔

''یہ کس نے کیا ہے۔'' ان کے صحن میں بھینسیں بندھی تھیں۔

''اس نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔'' رسولاں نے اپنی آنسو بھری آنکھیں دوپٹے سے صاف کیں۔

''رفیق کے بھائی شفیق نے۔ کسی کو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ بس انہوں نے آ کر قبضہ لے لیا۔ گاؤں والوں نے روکنے کی کوشش کی مگر اتنے بندے تھے۔ کسی نے کچھ سنا ہی نہیں۔ کہنے لگے پیسے دیے ہیں تو قبضہ بھی لیں گے۔''

''بے غیرت کو شرم نہ آئی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ بھائی کی بیوہ ہے۔ جوان لڑکی کو کہاں لے کر جائے گی۔''

''جب بھائی نہیں رہا تو کہاں کا رشتہ۔ پھر اقصیٰ اس کی کیا لگتی تھی جو سوچتا۔''

''خدا خوفی ہی کر لیتا.....''

آئیے آئیے کیسے بچ گیا۔ اس میں ثریا کا بھی حصہ تھا۔
بھانت بھانت کی آوازیں۔ نت نئے مشورے، کوئی اس کا حق یاد دلا رہا تھا کوئی قانون سمجھا رہا تھا۔
رشیداں نے سر اٹھا کر نیلی چھتری کو دیکھا۔ دور تک پھیلا آسمان اتنا لشکتا تھا کہ نگاہ سہار نہ سکی اور جھک گئی۔
''چل سامان میرے گھر رکھ، پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔''
رسولاں نے نیچے گرا بستر اٹھایا۔
''میں نے کیا کرنا ہے۔ کرے گا تو اوپر والا۔'' رشیداں نے چپکے سے اپنی ایف آئی آر کٹوائی اور اقصیٰ کو دیکھا۔ اقصیٰ جھک کر اپنے چوزے اکٹھے کرنے لگی۔ جتنی عجلت میں سامان باہر پھینکا گیا تھا۔ گاؤں والوں نے اتنی ہی سرعت سے رسولاں کے گھر میں سامان ڈھیر کر دیا۔ پیٹیاں ٹرنک سامنے گھر والوں نے رکھ لیں۔
دھیرے دھیرے لوگ چھٹنے لگے۔
روٹی سامنے والے گھر سے پک کر آ گئی۔
''اماں! اب کیا کریں گے؟'' اقصیٰ نے ماں سے پوچھا۔ گھر کے پیچھے کھیتوں کے ساتھ تھوڑی جگہ خالی تھی۔ جو کسی کی ملکیت نہ تھی۔
رفیق نے یہاں چھپر ڈال کر جانوروں کے باندھنے کو جگہ بنائی تھی، رشیداں نے اس کی صفائی شروع کر دی تھی۔
''اماں! یہاں کیسے رہیں گے.....؟'' اقصیٰ کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہا۔
''مٹی گھول دے۔ لپائی کرنی ہے۔''
''مجھے نہیں کرنی لپائی اماں! یہ کوئی زندگی ہے۔'' اقصیٰ چیخ اٹھی۔ ''بھوک، بے عزتی، ہمارا گھر چھین لیا۔ اس سے تو اچھا ہے ہم مر جائیں۔''
''مر ہی جانا ہے، زندہ کس نے رہنا ہے۔''
''اماں! تم بن جاؤ سائیں۔ اللہ لوک ہو کر لوگوں کو دعائیں دینا شروع کر دینا مجھ سے نہیں ہوتا۔ بس ہو گئی ہے۔ اللہ کرے سارے مر جائیں۔ جس جس نے ہمیں دکھ دیا ہے سارے مر جائیں میرے چاچے، تائے مامے، شفیق۔ ثریا اور تیرا مراد علی بھی۔''
پورے زور کا تھپڑ اقصیٰ کے گال پر پڑا۔
چیختی چلاتی اقصیٰ جا کر چھپر میں گری۔
رشیداں کی بے بس آنکھوں میں قہر اترا
ایسی آگ لپکی کہ اقصیٰ کو لگا، تنکوں کے چھپر میں آگ لگ جائے گی۔
وہ اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

''زندگی کی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ ہی لیا ہے۔ میرے لیے زندگی خوش رنگ تتلی نہیں ہے۔ تپتی سڑک ہے۔ جس پر مجھے ننگے پاؤں چلنا ہے۔ لیکن میں خوش ہوں، مجھے یہ مشقت پسند آ گئی ہے کیونکہ میرے گھر والے اب بھوکے نہیں سوتے، رکشے کا کرایہ بھی آ رہا ہے۔ میری کوشش تھی جمع کر لوں تمہارے لیے لیکن نہیں کر پائی، خرچے بہت ہیں مراد! ہو سکا تو تمہارا قرض واپس کر دوں گی۔ نہ کر پائی تو معاف کر دینا۔''
اس نے آگے ایک اسمائلی فیس بنایا۔
''تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ تمہیں برا تو نہیں لگا۔ اگر برا لگے تو آئندہ نہیں لکھوں گی۔ امی ہر وقت تمہیں دعائیں دیتی ہیں اور میں، میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔''

اس نے ڈائری بند کی اور دراز خول کر اس میں ڈال دی۔ صاف ستھرے کمرے پر نگاہ دوڑائی۔ کل سے اس کے پرچے شروع ہو رہے تھے تو وقت نہ ملتا اسی لیے آج ساری صفائی کر دی تھی۔

''کب آؤ گے مراد۔'' کمرہ مراد کے بغیر کتنا ادھورا اور اداس لگ رہا تھا۔ نرمین نے باہر نکل کر لاک لگایا۔ دوسری طرف سے فرخ آیا۔ اسے مراد کے گھر سے نکلتے دیکھ کر تیوری چڑھ گئی۔

''فرخ.....'' وہ نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتا تھا۔ مگر نرمین نے بھی قسم کھائی تھی۔ کالی بلی کی طرح اس کا رستہ ضرور کاٹے گی۔

''اس طرح رستے میں آوازیں کیوں دیتی ہو، لوگ کیا سمجھیں گے۔'' وہ خواہ مخواہ بگڑا۔

''کیا ہو گیا؟ میں تو بچپن سے اسی طرح آوازیں دیتی ہوں۔'' نرمین نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''بچپن چلا گیا ہے۔'' وہ چبا چبا کر بولا۔

''فرخ! تمہیں کس بات کا غصہ ہے۔''

''کسی بات کا نہیں.....''

ابھی کل کی بات ہے۔ اس کے دوستوں میں سے کسی نے اچانک پوچھا۔

''وہ تمہاری رشتے دار تھی نا نرمین..... میں نے کل اسے پکوڑے بیچتے دیکھا۔ اس کے حالات اتنے خراب ہیں، تم لوگ مدد نہیں کرتے۔''

''وہ ہمارے رشتے دار نہیں ہیں۔'' وہ کس قدر شرمندہ ہوا کہ وضاحت پر وضاحت دیتا گیا۔ ''محلے کے غریب لوگ ہیں، امی بہت مدد کرتی ہیں۔''

پتا نہیں دوستوں کو یقین آیا یا نہیں۔ مگر وہ شرمندہ ہو کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

''تمہیں میرا ریڑھی لے جانا اچھا نہیں لگا۔''

''مجھے کیا۔ تم جو مرضی کرتی رہو۔ میری رشتے دار لگتی ہو۔ جو میں روکوں گا۔'' اتنا خراب لہجہ..... نرمین ہکا بکا رہ گئی۔

''آئندہ مجھے اس طرح راستے میں آوازیں نہ دینا۔ لوگ نجانے کیا سمجھیں گے۔'' وہ بہت غصے سے لتاڑتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

نجانے کیوں نرمین کو اس کے لہجے سے حقارت کی بو آئی۔ وہ دل گرفتہ سی گھر آ گئی۔ بچے نل کھولے پانی پانی کھیل رہے تھے۔ سارا صحن پانی سے بھر گیا۔

''دماغ ٹھیک ہے تم لوگوں کا۔ سارا پانی ضائع کر رہے ہو۔ پھر سے موٹر چلانی پڑے گی۔ بل کس نے دینا ہے۔'' اس نے غصے سے ٹونٹی بند کی۔

''نرمین! آج کیا پکاؤں.....'' ثمینہ کچن سے نکلی۔ تھوڑے دن لگے تسلیم کرنے میں۔ مگر گھر میں آٹا رزق کے برابر لگتا ہے۔ نرمین اب اس گھر کا کماؤ پوت تھی۔ اس سے پوچھنا تو بنتا تھا۔

''کچھ بھی پکا لیں امی..... ہمارے پاس کون سی لمبی لسٹ ہے۔''

''دال بنا لیتی ہوں پتلی..... صبح بھی کام آ جائے گی۔''

''نرمین.....'' افشاں دیوار پر چڑھ آئی۔ ''تمہاری تیاری کیسی ہے؟''

''اچھی ہے۔'' کل ریاضی کا پرچا تھا۔ دونوں کا سینٹر ایک ہی تھا۔ مگر افشاں کو اس کے بھائی نے چھوڑنا تھا۔

''تم کیسے جاؤ گی.....؟''

''چلی جاؤں گی۔ کسی نہ کسی طرح تو جاؤں گی۔'' وہ بے زاری سے کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

''اسے کیا ہوا ہے؟''

''سارے سیاپے اس بے چاری کی جان کو ہی تو لگے ہیں۔ ریڑھی بھی لے جانی ہے۔ نمبرداروں کے گھر ٹیوشن بھی پڑھانی ہے، اوپر سے پرچے۔'' ثمینہ کا دل تاسف سے بھر گیا۔ کاش وہ نرمین کی کچھ مدد کر سکتی۔

''اب سینٹر اتنی دور بنا ہے۔ پتا نہیں کیسے جائے گی۔''

افشاں شرمندگی سے دیوار سے نیچے اتر گئی۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ بھائی ان دونوں کو چھوڑ دے گا۔ جب سے نرمین نے ریڑھی نکالی تھی۔ وہ تو اس کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔

''آوارہ پھرنے کا شوق ہوتا ہے ایسی لڑکیوں کو۔'' اس کے لہجے میں بلا کی نفرت تھی۔ ''دو چار اور پیچھے لگا لائے گی۔''

''بھائی! نرمین ایسی نہیں ہے۔'' افشاں منمنائی۔

''تمہاری زبان کاٹ دوں گا اگر اس کا نام بھی لیا۔''

افشاں نے دم سادھ لیا۔

''کرتی بھی تو کیا؟''

☆☆☆

نرمین نے ساری ضروری چیزیں پاؤچ میں رکھیں۔ پرچے کی پریشانی کے علاوہ اکیلے سینٹر تک پہنچنے کی ٹینشن بھی سوار تھی۔ تب ہی چائے کا پورا کپ بھی نہ پی سکی۔ بچے ثمینہ کے گرد اسکول جانے کو تیار ناشتہ کر رہے تھے۔ ثمینہ نے سختی سے تاکید کی تھی۔ شور نہیں کرنا۔ ابا کو نہیں جگانا..... پوری رات جاگنے کے بعد وہ صبح کے قریب ہی سویا تھا۔

نرمین نے جلدی جلدی چوٹی کو بل دینا شروع کیے۔

باہر رکشے کا مخصوص ہارن بجا۔

نرمین کا دل ڈوب کر ابھرا۔

ہاتھ آخری بل پر ساکت ہو گئے۔

''مراد بھیا آ گئے۔'' بچوں نے بھی وہ مخصوص ہارن پہچان لیا تھا۔

پورا گھر دروازے کی طرف لپکا۔

عین دروازے کے سامنے مراد کا رکشہ کھڑا تھا۔

''مراد۔'' دل نے بے آواز پکارا۔

تب ہی دروازے کی آڑ سے وہ سامنے آیا۔ انور حسین کی عمر کا چھوٹے قد والا شخص۔

''مراد بھائی نے بھیجا ہے۔''

مراد کہاں ہے؟ سوال ثمینہ نے کیا اور جواب کے لیے نرمین آگے آ گئی۔

''وہ تو نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ جب تک نرمین بی بی کے پرچے ہیں۔ میں انہیں سینٹر چھوڑنے اور لینے جاؤں۔''

اس کے نہ آنے کی مایوسی رگ و پے میں سرائیت کر گئی۔

بچے بھی منہ لٹکا کر مڑ گئے۔

''میں آتی ہوں۔'' نرمین نے کمرے میں جا کر اپنا ضروری سامان اٹھایا۔

''اسے میرے پل پل کی خبر رہتی ہے۔''

کچھ لمحے پہلے کی ٹینشن پریشانی سب اڑن چھو ہوگئی۔
وہ جیسے کسی کے حصار میں تھی۔
محفوظ اور مطمئن۔

☆☆☆

پرچہ دے کر باہر نکلی تو افشاں بھاگ کر اس کے گلے آ لگی۔
''پیپر کیسا ہوا؟''
''بہت اچھا۔ اتنی تو میری تیاری بھی نہیں تھی۔'' نرمین ہنسی۔ اطمینان بھری کھلکھلاتی ہنسی۔
افشاں چونکی۔
نرمین کے چہرے پر کھلتی خوشی محض پرچے کا اچھا ہونے کی تو نہیں تھی۔
''کیا بات ہے؟''
''تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' نرمین نے کیاری سے پھول توڑا۔ جہاں لکھا تھا ''پھول توڑنا منع ہے۔''
مالی ان کی طرف بھاگا آیا۔
نرمین نے افشاں کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگا دی۔
افشاں گیٹ کے اندر ہی رہ گئی۔ باہر اس کا بھائی گیٹ پر نظریں لگائے بیٹھا ہوگا۔
''تم کس کے ساتھ آئی ہو؟''
''مراد کے ساتھ.....'' قلقل ہنسی میں بہتے جھرنے کی سی روانی تھی۔
''وہ واپس آ گیا؟'' افشاں اچھل پڑی۔
''گیا ہی کب تھا؟'' نرمین نے ہاتھ میں پکڑے پھول کو دیکھا۔
''ٹھیک سے بتاؤ نا۔''
''وہ واپس نہیں آیا۔ مگر وہ ہر اس جگہ موجود ہے۔ جہاں مجھے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔'' نرم مدھر لہجہ۔ ''بس اتنی سی بات ہے۔''
''تم مجھے بہت بدلی بدلی سی لگ رہی ہو نرمین۔'' افشاں نے بے چین ہو کر نرمین کو دیکھا۔
''میں اب بڑی ہوگئی ہوں افشاں اور اب ہماری راہیں بھی الگ ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میری وجہ سے ہر روز اپنے بھائی کی باتیں سنو۔''
اس نے افشاں کا ہاتھ پکڑ کر پھول اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔
''تم دوستی ختم کر رہی ہو؟''
''لوگ آہستہ آہستہ مجھ سے رشتے ختم کر رہے ہیں۔'' فرخ کی آنکھوں میں دکھائی دیتا غصہ اور لہجے میں چھلکتی بے زاری نرمین کے دل میں انی کی طرح گڑ گئی تھی۔
''اس لیے سوچا، تمہیں خود ہی خدا حافظ کہہ دوں۔ جاؤ تمہارا بھائی انتظار کر رہا ہے۔ میرا رستہ تم سے بالکل الگ ہے۔''
نرمین نے آنکھوں میں در آئے آنسوؤں کو کمال ضبط سے پیچھے دھکیلا۔ مگر افشاں رو پڑی۔
نرمین نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور رخ پھیر لیا۔

افشاں اداسی سے اسے دیکھی آنکھیں صاف کرتی گیٹ سے نکل گئی۔

''میرا نام تمہارے لیے بے عزتی کا باعث بنے گا۔ اسی لیے خود کو تم سے الگ کر رہی ہوں۔'' اس نے رک کر اتنا انتظار کیا کہ افشاں اپنے بھائی کے ساتھ چلی جائے۔ پھر جا کر رکشے میں بیٹھ گئی۔

''چاچا! مجھے بتاؤ۔ رکشہ کیسے چلاتے ہیں۔''

چاچے نے حیران ہو کر زمین کو دیکھا۔ مگر وہ سنجیدہ تھی۔

☆☆☆

مٹی کی لپائی سے وہ چھپر گھر تو نہیں بنا تھا۔ بس سر چھپانے کا آسرا ہوا تھا۔ کچھ ضروری سامان رکھ کر باقی رشیداں نے غریبوں میں بانٹ دیا تھا اقصیٰ دل ہی دل میں ہنسی گاؤں میں ان سے زیادہ غریب بھی ہیں۔''

کچھ چیزیں رسولاں نے زبردستی رکھ لیں۔

''پاگلے، لڑکی کا وہاہ کرے گی تو کام آئیں گی۔''

''میں کہاں رکھوں گی۔'' رشیداں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چھپر پر بستر کی چادر کا پردہ تھا۔

''یہ پردہ ہماری عزت کو ڈھانپ لے گا۔''

اس کے رگ وپے میں بے چینی در آئی۔

''میں رکھ لوں گی۔ تیری امانت سمجھ کر۔''

رشیداں نے پٹی بیچ دی تھی۔ اس کے بدلے ایک بکری لے لی تھی۔ اب بکری، رشیداں اور اقصیٰ کو ایک ہی جگہ رہنا تھا اور یہ بات اقصیٰ کو قبول نہ تھی۔ وہ کب سے کھیتوں کے کنارے کھڑی بس آنسو ہی بہائے جا رہی تھی۔ چولہا لیپتی رشیداں نے کئی بار اسے دیکھا۔ آواز بھی دی۔ مگر وہ رشیداں سے ہی نہیں پوری دنیا سے ناراض، اپنی قسمت سے خفا وہاں کھڑی تھی۔

''اقصیٰ میری دھی۔'' رشیداں ہتھے کھالے میں ہاتھ دھو کر پاس آ کھڑی ہوئی۔ اقصیٰ کی نظروں کے سامنے کپاس کی فصل پک رہی تھی۔ سفید روئی کپاس کے ٹینڈوں سے جھانکنے لگی تھی۔

''کب تک ناراض رہے گی۔''

''جب تک قسمت نہیں بدل جاتی۔'' اس نے پاس سے گزرتے زہریلے کیڑے کو چپل سے مسل دیا۔

''تو تو دعا بھی نہیں کرتی۔'' رشیداں نے نرمی سے احساس دلایا۔

اقصیٰ پلٹی اور پھٹ پڑی۔

''اماں! ہم یہاں کیسے رہیں گے جانوروں کے ساتھ۔ مچھروں اور سانپوں کے ساتھ۔ بجلی نہیں ہے، پانی نہیں ہے، غسل خانہ نہیں ہے۔ ہم انسان ہیں، جانور نہیں۔''

''تو کیا کروں، تیرے پاس کوئی حل ہے۔'' رشیداں نے ہتھیار ڈال کر اختیار اسے دے دیا۔

''ماموں کے گھر چلیں۔'' اقصیٰ نے آس کے ساتھ ماں کو دیکھا۔

''تیرے ماموں کو کیا خبر نہیں ملی ہوگی؟ نہیں آیا۔''

''تو کوئی اور رشتے دار..... کوئی تو ہوگا جو ترس کھا کر رکھ لے ہمیں۔'' رشیداں مضمحل سا مسکرائی۔

''تجھ سے پکا وعدہ ہے..... کوئی آ گیا ترس کھا کر ہمیں لینے تو چلی جاؤں گی۔ اس تھاں پر نہیں رکوں گی۔''

وہ بات کہاں کرتی تھی۔ وہ تو بس بات ختم کرتی تھی۔ جیسے کہ ابھی کر دی۔ اقصیٰ بھی جانتی تھی، انہیں لینے کسی نے نہیں آنا اسے یہیں رہنا ہے مچھروں جانوروں اور سانپوں کے ساتھ۔

''کاش وہ بھی ثریا کے ساتھ بھاگ جاتی۔''

رشیداں نے جا کر چولہے میں آگ جلادی۔ وہ چولہا سوکھنے کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ اسے روٹی پکا کر کام پر جانا تھا۔

اقصیٰ کا غصہ بے بسی کی چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اس نے خاموشی سے چھوٹی سی پرات اٹھائی اور دو پیڑوں کا آٹا گوندھنے لگی۔

دور تک پھیلے کھیتوں پر شاہ خاور قہر برسا رہا تھا۔

☆☆☆

چونسہ آم کا بھرا شاپر اور مٹھائی کا ڈبہ لے کر جب خدیجہ خالہ آئیں تو نرمین اپنی ریڑھی لے کر نکل رہی تھی۔

خدیجہ خالہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

نرمین نے مسکرا کر سلام کیا تو وہ جواب دینا ہی بھول گئیں۔

''تم نے یہ کب سے شروع کیا؟''

''بہت دن ہوگئے۔'' نرمین مسکرائی۔ ''آپ نے ہی تو کہا تھا حیلے سے وسیلہ ہے۔ بس آپ کی بات گرہ سے باندھ لی۔ اب ہم گھر والے بھوکے نہیں سوتے۔''

''ہاں مگر.....'' خدیجہ خالہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ اب کہیں تو کیا کہیں۔

''خالہ! چھٹی کا ٹائم ہونے والا ہے۔ مجھے اسکول پہنچنا ہے۔'' نرمین معذرت کرتی چلی گئی اس کا رستہ بہت سیدھا تھا اور بکے کا ہک، منٹوں میں سب بک جاتا ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ وہ پرچہ دے کر آتی تو ثمینہ ریڑھی تیار رکھتی تھی۔

خدیجہ حیران حیران سی گھر کے اندر چلی گئیں۔ وہاں کا منظر اس سے زیادہ حیران کن تھا۔ انور حسین زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ چاروں بچے اس کے گرد دائرہ باندھے کوکلا چھپاکی کھیل رہے تھے۔

خدیجہ کا سر چکرا گیا۔

تب ہی کمرے سے ثمینہ نکلی۔ انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''خدیجہ آپا! آپ نے تو اتنے دن لگادیے۔ آئیں اندر بیٹھیں۔''

پرانی مگر صاف ستھری چادریں پلنگ پر بچھی تھیں۔

وہ سامان رکھ کر بیٹھ گئیں۔

''نرمین ابھی ابھی گئی ہے۔ ورنہ آپ سے بھی ملاقات ہوجاتی۔'' ثمینہ جلدی جلدی سکنجبین بنالائی۔

''میں نے دیکھا تھا اسے۔'' خدیجہ نے ذرا سا توقف کیا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کیا کہوں؟'' ''ثمینہ! تم خود کہیں کام کرلیتیں۔ اس طرح جوان جہان لڑکی سڑکوں پر.....''

''کیا کرتے؟'' ثمینہ نے سر جھکا لیا۔ ''بھوک سے زیادہ ظالم کوئی چیز نہیں نرمین اٹھ کر کھڑی نہ ہوتی تو شاید ہم سارے کے سارے خودکشی کرلیتے۔ زندہ رہنا آسان نہیں ہے آپا! بہت ہمت چاہیے اور یہ ہمت صرف نرمین میں تھی، میرے قدم تو دروازے سے نکلتے ہی کانپنے لگتے تھے۔ یہ پتا نہیں کس پر گئی ہے۔''

ثمینہ کے لہجے میں نرمین کے لیے فخر ہی فخر تھا۔

''میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ پہلے ہی اتنا کچھ ہوگیا ہے۔''

''نرمین کہتی ہے، اتنا کچھ ہوگیا کہ دل سے ڈر ہی نکل گیا ہے۔''

''چلو..... اللہ تم لوگوں کے حالات بدلے۔ انور حسین کو کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔'' خدیجہ نے بات بدل دی۔

(اعتراض تو تب کرو جب اس پورے گھر کا خرچا اٹھانے کے قابل ہوں۔ بچوں کو تعلیم دلا سکوں، ان کے سارے مسائل حل کر سکوں جب نہیں کر سکتی تو ان کی ہمت کیوں توڑوں۔ نیا زمانہ ہے۔ وقت بھی بدل گیا ہے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تو مارنے دو۔ کیا پتا راستہ مل ہی جائے منزل پر پہنچ ہی جائیں۔)

انہوں نے خود کو اور اپنی روایتی سوچ کو بہلا لیا تھا۔

''سرکاری ہسپتال لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے دوائیاں بھی دیں۔ مگر کہتا ہے کسی بڑے شہر کے اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ نرمین کہتی ہے کچھ پیسے جمع کر کے.....'' ثمینہ بتا رہی تھی۔

اس کا ہر جملہ نرمین کہتی ہے سے شروع ہو کر اس پر ہی ختم ہوتا تھا۔

''مراد کا کیا بنا؟''

''اللہ نے چاہا تو وہ بھی جلد واپس آئے گا۔''

''منشی دوبارہ تو نہیں آیا۔''

''نہیں۔ اس لعنتی نے دوبارہ شکل نہیں دکھائی۔'' ثمینہ نے نفرت سے کہا۔ مگر اس لعنتی کو نرمین کی شکل نظر آ گئی تھی۔

وہیں جہاں سفید چادر اوڑھے وہ عورت بیٹھی بھیک مانگ رہی تھی۔ منشی کی گاڑی نے کالے بلے کی طرح نرمین کی ریڑھی کو کراس کیا۔

پھر گاڑی بیک کر کے لایا۔

نرمین نے بدک کر دیکھا۔ تو وہ کھل کر ہنسا خبیث، مذاق اڑاتی ہنسی۔

''یہ ہے تمہاری اوقات۔''

نرمین نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک سنسان تھی اور سفید چادر والی عورت کسی موٹر سائیکل والے سے بات کر رہی تھی۔

''اس وقت اے سی والے کمرے میں مہارانی بن کر بیٹھی ہوتی۔ نوکرانیاں آگے پیچھے کام کر رہی ہوتیں پر نہیں عزت ہر کسی کو راس نہیں آتی اور بندہ اپنی اوقات سے باہر نہیں سوچتا۔''

منشی کے لہجے میں بلا کی اکڑ نفرت اور غیر محسوس سی بے بسی تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ کھینچ کر گاڑی میں ڈالے اور لے جائے.....اور اگر وہ ایسا کر لے۔

ایک شیطانی سے خیال نے منشی کی روح کو جکڑ لیا۔

شیطان جو فرنٹ سیٹ پر ہمیشہ انسان کے ساتھ بیٹھتا ہے۔

☆☆☆

تفتیش یک طرفہ تھی۔ منشی تو پیش ہی نہ ہوا تو چند پیشیوں کے بعد پرچا خارج کر دیا گیا۔ ڈی پی او دفتر سے باہر نکل کر مراد نے اک گہری سانس لی۔ اور آنکھیں کھولیں۔ بہت مصروف سڑک تھی۔ مگر سر پر کھلا آسمان ساون کے بادلوں سے ڈھکا تھا۔

مراد کا بس چلتا تو اڑ کر چیچا وطنی پہنچ جاتا۔

عین نرمین کے گھر کے سامنے.....اور رکشے کا ہارن سن کر وہ بے تابانہ بھاگتی ہوئی آ کر دروازہ کھولتی۔

مگر اسے چیچہ وطنی کے لیے وین پکڑنی تھی۔ تب ہی وہ لوگوں سے بے نیاز با آواز بلند گنگناتا پیدل ہی وین اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔

گھر سے نکلتے ہی، کچھ دور چلتے ہی
رستے میں ہے اس کا گھر
خوشی اور آزادی کے احساس سے سرشار اس کے قدم اڑتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

''گھر آتے ہی آپ نرمین کے گھر چلی گئیں نہ گھر کا کوئی خیال ہے نہ بیٹے کا۔'' فرخ کو نجانے کس بات کا غصہ تھا۔

''ماں تو صبح سے آ کر بیٹھی ہے۔ تمہیں ہی جھانکنے کی فرصت نہ تھی۔'' خدیجہ بہت فرصت سے اپنے لیے چائے کا کپ لے کر بیٹھی تھیں۔

''پتا چل گیا۔ نرمین نے کیا کام شروع کیا ہے؟'' وہ جلبلا کر بولا۔

''ہاں بچاری لڑکی۔ انور حسین تو پورا پاگل ہو گیا ہے۔'' خدیجہ کے لہجے میں اب بھی ان کے لیے ہمدردی تھی۔

''تو ہمیں کیا۔ ہمارے کون سا رشتے دار ہیں؟''

خدیجہ نے بے حد حیرت اور غور سے بیٹے کو دیکھا۔ آسمانی شلوار قمیص میں ملبوس ماتھے پر تیوری چڑھائے عین سامنے بیٹھا دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''تم تو رشتے دار ہی بنانا چاہتے تھے۔''

''میری کم عقلی تھی۔''

''اب عقل کیسے آ گئی؟'' سارا معاملہ خدیجہ کی عقل سے بالاتر تھا۔

''بس آ گئی۔ آپ بھی زیادہ میل جول نہ رکھیں۔ لوگ انہیں ہمارا رشتے دار سمجھ کر مذاق اڑا رہے ہیں۔''

ایک پل میں خدیجہ کو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔

محبت، اوقات و دنیاوی حیثیت کے پلڑے میں تل گئی تھی۔ ان کا بیٹا محبت کی جادو نگری سے نکل کر دنیاداری کے تقاضے نبھانے لگا تھا۔

''چلو، ٹھیک ہو گیا۔ اب تم بھی اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ امتحان ہونے والے ہیں۔''

انہوں نے رسانیت سے بات سمیٹ دی۔ دل میں یک گونہ اطمینان اترا۔

''رشتے داری اپنے جیسے خاندان میں ٹھیک لگتی ہے۔''

انہیں اس بات پر کامل یقین تھا۔

☆☆☆

گھنی کالی رات کے مہیب سائے آسمان کو ہولناک دکھا رہے تھے۔ ہوا کپاس کے کھیتوں میں دم سادھے تھی۔

گرمی، حبس اور مچھروں کی بہتات، جنہوں نے ہاتھ پیروں میں آگ لگا دی تھی۔

سانس سینوں میں گھٹ رہی تھی۔

جھینگروں کا شور۔

مینڈک کے ٹرٹرانے کی آوازیں۔

کہیں کہیں کوئی گیدڑ بھی اونچی آواز نکالتا تو وہ کانپ کانپ جاتی۔

یہ کھیتوں کے کنارے ساون کی رات تھی۔
انتہائی ہولناک اور ڈراؤنی۔
گرم اور حبس زدہ۔
آسمان پر جمع ہوتے سیاہ بادل کسی عفریت کا روپ ڈھال گئے تھے۔
اس نے آسمان کی یہ شکل پہلے بھی دیکھی تھی۔
مگر اس میں خوف کا عنصر اتنا نہیں تھا۔ وہ گھر کی چار دیواری میں قید آسمان تھا۔ برستا تو وہ کمروں میں جا کر پناہ لے سکتی تھیں۔
اور اگر اب برسا تو۔
اقصیٰ نے گردن گھما کر ماں کو دیکھا۔ وہ چت لیٹی مگر سو نہیں رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے جوان بیٹی کو لے کر رشیداں سو بھی کیسے سکتی تھی۔
''اماں.....''
''ہوں.....''
''بارش تو نہیں ہوگی۔''
جواب ماں نے نہیں بادلوں نے دیا تھا۔ اتنی زور سے گرجے کہ وہ دہل کر اٹھ بیٹھی۔ دور کھیتوں کے کنارے جھکے آسمان پر بجلی کڑکی اور چمکی۔
''اماں.....'' رشیداں بیٹھ گئی۔ بجلی دوبارہ لشکی۔ اقصیٰ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔
''گڈی! بکری کھول۔'' رشیداں نے تیزی سے اٹھ کر چارپائی اٹھائی۔
اقصیٰ بکری کی طرف بھاگی۔ مگر بانیوں سے لدے، ہواؤں پر سوار بادلوں نے انہیں محفوظ مقام تک پہنچنے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔ پل میں جل تھل ہوگیا تینوں چھپر تلے آ گئے۔ رشیداں نے بکری کی رسی چارپائی کے پائے سے باندھی اور اقصیٰ کو بازوؤں میں بھر لیا۔
وہ مسلسل استغفار کی تسبیح کر رہی تھیں۔
ہواؤں کی شوریدہ سری بڑھنے لگی۔ تو بادلوں کی گرج میں قدرت کا قہر شامل ہوگیا۔ وہ ساون کی بارش نہیں طوفان تھا۔
طوفان جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔
لوگوں کے گھروں کی چھتیں بھی۔
انہوں نے اپنے سر سے سرکنڈوں کے چھپر کو اڑتے دیکھا۔
اقصیٰ کی چیخ نکل گئی۔
بکری بلبلانے لگی اور رشیداں۔
ننگے سر ننگے آسمان کے نیچے حیرت کدہ بن گئی کہ آخر اس سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوگیا ہے کہ رب اس سے ناراض ہوگیا ہے۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شگفتہ پروین

عشق ممنوع

"ہائے اللہ! وہ آرہے ہیں۔" صدف نے دوپٹے کے پلو کو دانتوں میں داب کر شرمانے کی ناکام ایکٹنگ کی۔ نگاہیں "عشق ممنوع" کے "بہلول" پر جمی ہوئی تھیں۔

"اچھا۔۔۔" ماہا نے اپنی پھسلتی عینک کو ناک پر جمایا۔ ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ٹی وی پر "بہلول" کو۔۔۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ بھورا بندر پاکستان آرہا ہے۔" کمال بے توجہی سے بول کر وہ دوبارہ ڈائجسٹ کے ہیرو ہیروئن کے مکالموں میں غرق ہو چکی تھی۔ ذہن کہانی میں الجھا ہوا تھا۔

"بھورا بندر۔۔۔!" صدف کا صدمے سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"حد ادب گستاخ لڑکی! اتنا اسمارٹ ڈشنگ' ہینڈسم' ویل ایجوکیٹڈ' ویل مینوڈ! میں تو اس کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوب چکی ہوں۔ سچی' فرحت اشتیاق کے ناولوں جیسا ہیرو ہے۔ اس دفعہ آئیں گے تو میں اپنی محبت ان پر ثابت کرکے رہوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ ماہا نے ٹی وی کو دیکھا جہاں اب "بیسٹر" کمال بے باکی سے "بہلول" سے "عشق" فرما رہی تھی۔

"استغفراللہ! مقدس رشتوں کی بے حرمتی۔۔۔ اور یہاں ان محترمہ کو عشق کا بخار چڑھ رہا ہے۔" ماہا منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ باہر سے آتی شہلا جوان کی دوست اور پڑوسن تھی۔ صدف کے آخری جملے سنے اور کمرے میں آکر صوفے پر ڈھے گئی۔

"یہ محترمہ کن پر اپنی محبت ثابت کرنا چاہ رہی ہیں؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"بھورے بندر پر۔۔۔" ماہا نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔

"چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ "بیسٹر" اور "نہال" کیا کم تھیں جو یہ جنابہ بھی ان کے "متاثرین" میں شامل ہو چکی ہیں۔ بہت زیادہ افسوس ہوا۔" اس نے تاسف سے صدف کو دیکھا۔

"واٹ۔۔۔؟" صدف اچھلی "تمہیں کیسے پتا کہ "بیسٹر" اور "نہال" بھی میرے مینگیتر سے متاثر ہیں؟" صدف سے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔ ماہا اور شہلا نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر پاگل پن کا شبہ ہو۔

شہلا' صدف کو اپنے سے لپٹا کر رقت آمیز لہجے میں بولی۔

"یار صبر کر۔۔۔ تیرا اس ہیرو سے ستارہ عشق ملنا ناممکن ہے۔ دو لڑکیاں پہلے ہی اس کے پیار میں پاگل ہو چکی ہیں' سو تیرا عشق واقعی ممنوع ہے۔ وہ ان میں سے کسی ایک سے شادی کرے گا۔ تو چاہے اسے خیالوں' خوابوں میں اسے اپنا مینگیتر بنا بھی لے۔۔۔ مگر تیرا عشق لاحاصل ہی رہ جائے گا۔" اس نے افسوس سے آہ بھری۔

"ہٹے منہ۔۔۔ دفع دور۔۔۔" وہ شہلا کو دور دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"عمیر صرف اور صرف میرا ہے اور میں اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر رہوں گی۔"

"ہائیں۔۔۔" ماہم کے ہاتھ سے ڈائجسٹ پھسل کر نیچے گر گیا۔

"تم اپنے مینگیتر عمیر کی بات کر رہی ہو۔ میں سمجھی "عشق ممنوع" ڈرامہ کے ہیرو "بہلول" کی۔۔۔"

"توبہ' کہاں وہ بھورا بندر۔۔۔ کہاں میرا کالے بالوں' کالی آنکھوں والا اسمارٹ سا پاکستانی مینگیتر!" اس نے فوراً" سامنے والی دراز کھول کر اپنے مینگیتر کی تصویر کو محبت سے دیکھا۔

"کنور ارسلان" سے کتنی مشابہت رکھتا ہے نا۔۔۔ جب منگنی کے بعد دو تین دفعہ ہمارے گھر آئے تو کتنی شان دار ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔ جیسے بالی وڈ کا "سلمان خان" وہ لالی وڈ کے کنور ارسلان سے سلمان خان تک لمبی چھلانگ لگا چکی تھی۔ محبت سے ابھی تک اپنے مینگیتر کی تصویر کو تک رہی تھی۔

"میرے عمیر کا اسٹینڈرڈ اور اسٹیٹس ہائی ہے اور پسند تو لاجواب۔ اور اب تو یورپ کی خوب صورت فضاؤں اور اعلا تعلیم نے کیا خوب ان کی شخصیت کو نکھارا ہوگا۔ اور زیادہ ٹپ ٹاپ میں آچکے ہوں گے۔" صدف کی لن ترانیاں ابھی جاری تھیں۔ ماہم نے اس کے "میرے عمیر" کہنے پر منہ ہی منہ میں "بے شرم" کہا۔

"شکر ہے ہالی وڈ کے ہیروز کی بچت ہو گئی۔" شہلا نے مذاق اڑایا۔

"ورنہ ابھی اس نے مینگیتر صاحب کو "ٹام کروز" بنا دینا تھا۔ مینگیتر نہ ہوئے تھالی کے بینگن ہو گئے۔ لولی' بولی اور ہالی کے درمیان لڑھکتے پھر رہے ہیں۔" اس نے اپنی ہنسی ہونٹوں میں دبائی۔

"ہے۔ خبردار۔ جو میرے منگیتر کے شان میں گستاخی کی۔" صدف نے شہلا کی کمر پر زور کی دھپ لگائی۔

"مجھے کچھ ایسا بتاؤ کہ وہ میری محبت پر دل و جان سے یقین لے آئیں۔"

"منگنی کی انگوٹھی کافی ہے، تمہارے منگیتر کو محبت کا یقین دلانے کے لیے۔" تو کوئی کال آئی ہے نہ ایس ایم ایس کا رپلائی! ان کی امی نے فون پر بتایا تھا کہ بہت مصروف ہے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اپنی منگیتر کو ویلنٹائن ڈے وش تک نہیں کیا۔" صدف کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"ویلن ٹائن ڈے پر ہمارے میڈیا نے محبت، عشق کی گردان کی تھی نا۔ یہ اسی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ورنہ پہلے یہ محترمہ بالکل ٹھیک تھیں۔" شہلا نے ماہا کو دیکھ کر کہا۔ جو پہلے ہی جانتی تھی کہ اس سے ایک سال بڑی، بہن میڈیا کی طلسماتی، ہوشربا اور مغربی طور طریقوں کو فروغ دیتی دنیا سے کتنی متاثر ہے۔ سو سب کچھ سنی ان سنی کرتی دوبارہ رسالے میں کھو چکی تھی۔ ادھر صدف صاحبہ اپنے منگیتر کی آمد پر ان کو متاثر کرنے کے طریقوں اور حربوں کو سوچ رہی تھیں۔ شہلا کے جانے کا دونوں کو ہی علم نہیں ہوا۔

"اوہ آئیڈیا۔ یکم اپریل کو ان کی سالگرہ ہے۔ 28 مئی کو وہ پاکستان آچکے ہوں گے۔ میں انہیں اپنے گھر پر سالگرہ کی سرپرائز پارٹی دوں گی۔" وہ خوشی سے اچھل کر بولی۔

"یار ماہا! بتاؤ نا۔ میں کیسی ڈریسنگ کروں اس دن؟ یورپ میں تو ایک سے ایک لڑکی ہوتی ہوگی۔ میں کچھ ایسا پہنوں کی کہ ان میموں سے کسی طور کم نہ لگوں۔" وہ پھر سوچ کے سمندر میں ڈوب گئی۔

منگنی کے بعد اس کی جتنی دفعہ عمیر سے بات ہوئی تھی اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ روشن خیال اور ماڈرن شخص ہے۔ وہ اس سے کافی مرعوب ہوئی تھی اور اب کسی نئے اور انوکھے طریقے سے اسے ویلکم کرنا چاہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

یکم اپریل کی روشن صبح نے جیسے ہی صدف کے گھر، دستک دی۔ وہ کمر باندھ کر میدان عمل میں اتر آئی۔ آج عمیر اور اس کی امی کی دعوت تھی۔ ماہا، امی کے ساتھ مل کر دعوت کا اہتمام کر رہی تھی اور صدف۔ اپنے کمرے کو خوب صورت ربنوں، غباروں سے سجا کر کیک، ویلکم اور برتھ ڈے کارڈز کو ٹیبل پر سجا کر سوفٹ میوزک لگا کر، کمرے کے ماحول کو نہایت ہی رومانٹک اور رنگین بنا چکی تھی۔ صدف نے مغربی طرز کا ایک اسٹائلش سا اسکرٹ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ جو آستینوں کے بغیر تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑ کر لائٹ سا میک اپ کیا اور چھوٹا سا دوپٹا گلے میں ڈال لیا۔

"پرفیکٹ!" آئینے میں اس نے خود کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر تصور کی آنکھ سے عمیر کو دیکھا، وہ اس کی شان دار تیاری اور حسین سراپے کو بھرپور انداز سے سراہ رہا ہے۔

"صدف جی۔ آپ کے ہیرو تشریف لا چکے ہیں۔" ماہا نے آکر اس کے حسین سپنے کو توڑ دیا۔

"او اچھا۔ کیسے ہیں موصوف؟" اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"بہت اچھے۔ زبردست۔" اس کے لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔

"ہاں خیر! ان کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔" صدف اترائی۔ اس کا ابھی تک عمیر سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ روبرو ملاقات ہوگی تو خوب شکوے کرے گی اور پھر وہ اسے منائے گا۔ اس نے باہر جانے سے گریز کیا۔ اس دوران عمیر اور اس کی ہونے والی ساس دعوت بھی کھا چکے تھے۔ وہ تیاری کا بہانا بنا کر ابھی تک کمرے میں تھی۔ ہاں ماہا سے اس نے کہہ دیا تھا کہ بہانے سے عمیر کو کمرے میں لے آئے۔ تاکہ وہ اسے برتھ ڈے سرپرائز دے سکے۔ لنچ کے بعد ماہا عمیر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" صدف کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ اس کا حیرت کی زیادتی سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور سلام دعا سب بھول گئی۔ سامنے سفید شلوار قمیص میں ملبوس' پائنچے ٹخنوں سے اونچے کیے۔ سر پر سفید ٹوپی پہنے' نظریں جھکائے' چہرے پر شرعی داڑھی میں جو موصوف کھڑے تھے' وہ اس کے منگیتر تھے۔ ماہا مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ۔۔۔" عمیر نے خود ہی سلام کیا۔ اس کی نظریں سجے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"آج شاید کوئی خاص دن ہے۔" وہ بولا۔ صدف بت بنی ابھی تک صدمے میں تھی۔ اس کا سرپرائز کا "بھوت" تو کہیں دم دبا کر بھاگ چکا تھا۔ کیونکہ عمیر کا "شاکنگ سرپرائز" اس سے بڑھ کر تھا۔ اس نے ایک نظر بھی اس کے سراپے پر نہیں ڈالی۔

"انہوں نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے یہ بہروپ بھرا ہے نا۔ کیونکہ آج اپریل فول ہے؟" وہ بے یقینی سے ماہا کے کانوں میں گھس کر بولی۔ اب وہ اس کی داڑھی کو ایسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے نقلی لگائی ہو اور وہ ابھی قہقہہ مار کر اسے ہٹا دے گا۔

"نہیں۔۔۔ تمہاری بے وقوفیوں کو ختم کرنے لیے۔" ماہا مسکرائی۔ "تمہیں سدھارنے کے لیے۔" وہ بھی سرگوشی میں بولی۔ صدف دوپٹے کو گلے سے نکال کر سر پر اوڑھ چکی تھی اور انگلش میوزک کو بند کر چکا تھا۔ شاید اس کی بارعب شخصیت کا کمال تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟ آج شاید کسی کی سالگرہ ہے؟ میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا یہ سب غیر اسلامی طور طریقے ہیں اور وقت اور پیسوں کا ضیاع بھی۔۔۔" وہ نرمی سے گویا ہوا۔

"جی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔۔۔!" صدف کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"م۔۔۔ میں ٹھیک۔۔۔ آج سالگرہ منا رہی ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ کہیں ہم دونوں۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔

"خواتین کی اس کی نظر ٹیبل پر رکھے رسالے پر پڑی تو فوراً" بات بنائی۔ خواتین ڈائجسٹ کی۔ ماہا تو دیوانی ہے اپنے رسالے کی۔" اس کا خوابوں کا محل زمین بوس ہو چکا تھا۔

"ہائے۔۔۔ یہ یورپ گیا تھا یا افغانستان۔ دل میں سوچا۔ ماہا کسی کام سے باہر چلی گئی۔

"آپ کا لباس کچھ غیر مناسب سا ہے۔" اس نے ایک نظر اسے دیکھ کر جھکی نگاہوں سے کہا۔

"آپ صدف ہیں۔ آپ کو موتی کی طرح ہونا چاہیے۔ جسے قیمتی ہونے کی وجہ سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔" اس کا اشارہ کس طرف تھا' وہ بخوبی سمجھ گئی۔ عمیر نے آگے بڑھ کر کارڈ اٹھائے تو اسے "حقیقت" پتا چلی۔ کارڈز میں کافی محبت بھرے اشعار درج تھے۔ اس نے صدف کو دیکھا۔ جواب شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

کھی تو مشرقی باحیا لڑکی ہی نا۔۔۔ ڈراموں' فلموں کی دنیا اور حقیقت کی دنیا میں بہت فرق ہوتا ہے۔

"یہ سارے اظہار' اقرار شادی کے لیے سنبھال کر رکھیے۔ شادی کے بعد ہی میں اس اظہار و سراپے کو جائز اور بھرپور طریقے سے سراہ سکوں گا۔ فی الحال یہ "ممنوع" ہے۔ صدف نے اسے دیکھا' وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ باہر نکل گیا۔

"یورپ میں واقعی عمیر بھائی کا کیا رنگ و روپ نکلا ہے۔ کنور ارسلان بتا رہے تھے "جنید جمشید" لگ رہے ہیں۔ آنٹی کہہ رہی ہیں کہ وہاں کسی جماعت کے ساتھ رہتے تھے۔ وہیں دل کی دنیا کے ساتھ ظاہر بھی بدل گیا۔" ماہا اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا صدف جی؟ تمہیں تو عمیر بھائی سے عشق تھا نا؟ اب یہ اداس بلبل کیوں بنی ہو؟" اس کا منہ لٹکا دیکھ کر وہ شرارت سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ عشق تو سدا رہے گا۔ کیونکہ یہ "دل کا معاملہ ہے۔" لیکن وہ کہہ گئے ہیں کہ شادی سے پہلے یہ "عشق ممنوع" ہے۔"

وہ صدمے سے بولی اور ماہا کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔

ملیحہ صدیقی

وقت کا آئینہ

"یہ لو باجی!" بشریٰ نے ثمن کو پانی کا گلاس پکڑایا۔ ثمن نے گلاس تھام لیا مگر ——— اب بھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ حد ہوتی ہے۔" بلقیس کا غصہ کم ہو کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

ثمن کے سسرال میں ڈگیتی ہوئی تھی۔ ثمن کے

سسر اسٹیٹ ایجنٹ کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے کل ہی ایک مکان کا ایڈوانس ایک لاکھ روپے لاکر گھر میں رکھے تھے۔ وہ رقم اور اس کے علاوہ ثمن اور اس کی جیٹھانی کے زیورات اور سب کے موبائل فون ڈاکو لے گئے تھے۔

اسی اثناء میں امجد کمرے سے نکلا۔

"امی! بیلنس ڈلوانا ہے، تھوڑے پیسے ہوں گے۔"

وہ لجاجت سے بولا۔ بلقیس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چپل اٹھا کر اسے کھینچ ماری۔

"یہ سب تیری نحوست ہے۔ نشہ تو کرتا ہی تھا، چوری کر کے جیل کی ہوا بھی کھائی۔ کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ ہماری سات پشتوں میں ایسا کوئی نہیں نکلا۔"

"ہاں پتا ہے، تم اور تمہارا اعلان خاندان۔" وہ منہ بناتا دوبارہ کمرے میں گھس گیا۔

"ارے پتا بھی ہے، کچھ ہوش بھی ہے۔ بہن پر تیری وجہ سے کیا آفت آئی ہے۔ بدبخت منحوس۔" وہ ہانپنے لگیں مگر کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ بشریٰ اور ثمن انہیں سنبھالنے میں لگ گئیں۔

☆☆☆

ثمن کے سسرال والوں نے کہا تھا کہ یہ ڈکیتی ثمن کے نشے باز بھائی نے اپنے ساتھیوں سے کروائی ہے اور رقم کی خبر ثمن نے بھائی کو دی ہے۔ پہلے کے ثمن زدہ ماحول اور چھوٹے موٹے طعنوں کی بات الگ تھی مگر یہ الزام ایسا تھا کہ ثمن برداشت نہ کر پائی اور میکے آ گئی۔

"اپنی بھابھی سے کچھ سیکھ لیتیں۔ کیسے شوہر کو قابو کیا ہے مگر تم سے ایک سال میں بھی کچھ نہ ہوا۔" وہ پانی پی کر دوبارہ سے دل جلانے لگیں۔

"ارے ان کے لاکھ روپے کی کیا حیثیت ہے۔ یہ اوپر کا پورشن اور دو دکانیں کرائے پر چڑھی ہیں۔ تمہارے ابا کا اچھا خاصا چلتا ہوا میڈیکل اسٹور ہے۔ پنشن الگ آتی ہے۔ اللہ کا لاکھ احسان ہے۔ یہ کیسا گھٹیا پن ہے۔ میں تو جا کر بات کروں گی تمہارے ابا کے ساتھ۔" انہوں نے اٹل لہجے میں کہا۔

"امی! بھائی کو بھی لے جانا۔" ثمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بشریٰ کا منہ بن گیا۔

"بیوی دامن چھوڑے گی تو جائے گا نا۔" بلقیس چمک کر بولیں۔

"امی! بھائی ہر ہفتے آتے تو ہیں، خرچا بھی دیتے ہیں۔ ان کا پورشن بھی کرائے پر چڑھا ہے۔ وہ خود کرائے پر رہ رہے ہیں مگر کبھی اف نہیں کیا۔" ثمن دبے دبے لہجے میں بولی۔

"یہ سب اس کی بیوی کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تو اسے گھر سے نہیں نکالا۔" وہ چیخ کر بولیں۔

اسی وقت ڈور بیل بجی۔ ندرت بی آئی تھیں۔ بشریٰ شربت بنانے چلی گئی۔ ثمن نے آنسو پونچھنے کی کوشش نہیں کی۔ ندرت بی ان کے گھر کے فرد جیسی ہی تھیں۔ ہر معاملے سے باخبر۔ وہ سب بہن بھائی ان کی گود میں کھیلے تھے۔ ان کا بیٹا عرصہ دراز سے سعودیہ میں تھا۔ بلقیس جب اوپر تلے کے بچوں سے پریشان تھیں، تب وہ اکثر دن میں اپنی تنہائی مٹانے ان کے گھر آ جاتی تھیں۔ بلقیس بھی اپنی ماں جیسی پڑوسن سے بہت خوش تھیں۔ ورنہ وہ کسی سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ثمن نے انہیں سارے معاملے سے آگاہ کیا۔ وہ ساری بات سن کر فکر انگیز نظروں سے اسے دیکھنے لگیں اور کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔

☆☆☆

"خالہ! پریشانیوں نے تو ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ پہلے امجد بری صحبت میں پڑا، اب ثمن کو ایسا گھٹیا سسرال ملا۔ عجیب جاہل لوگ ہیں۔" وہ بے چارگی سے بولیں۔

"بلقیس! تم نے کبھی سوچا کہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور کب سے ہو رہا ہے؟" وہ ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بولیں۔ بلقیس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"میں نے پہلے کبھی تمہارے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دیا مگر یہ بچی میرے ہاتھوں میں پلی ہے۔ اس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔" انہوں نے ثمن کی طرف دیکھا۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" بلقیس بولیں۔

"تہمت اور بہتان طرازی اللہ کو کس قدر ناپسند اور گناہ کبیرہ ہے۔ تم نے کبھی سوچا، اس پر پکڑ بھی سخت ہوگی — گیہوں کے کے ساتھ گھن بھی پستے ہیں اور بعض دفعہ والدین کے اعمال اولاد کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ تم ثمن کے سسرال کی شکایت کرتی ہو مگر اپنی بہو کے ساتھ تمہارا کیا رویہ تھا؟ یہی سب تم بھی اپنی بہو کے ساتھ کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ثمن کے سسرال میں اسے جو طعنے دیے جاتے تھے، وہ تک مشترک ہیں مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تم نے اپنی بہو کے خاندان کو برا بھلا، گھٹیا کہا..... یہی سب ثمن کو بھی کہا جاتا ہے۔ تم بہو کی صورت شکل میں عیب نکالتی تھیں، طنز کرتی تھیں۔ ہو بہو وہی جملے ثمن کی بارے میں کہے گئے — یہاں تک کہ تم نے اپنی بہو کی کردار کشی تک کر ڈالی۔ جسے کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ بھی چلی گئی۔ ارے ایسا کرتے تو ہر بیٹی کی ماں کا دل کانپنا چاہیے کہ میرے آگے بھی بیٹی ہے۔ اسی لیے اب اسی طرح ثمن پر بھی الزام لگ رہا ہے۔ اسے بھی سسرال سے ذلت ہی مل رہی ہے تو سوچو کس قدر مماثلت ہے؟ تمہارے بیٹے کے الگ ہوتے ہی چھوٹا بیٹا بری صحبت میں پڑا پھر ثمن کی شادی ہوئی تو اسے سسرال میں سکون نہ ملا۔ پھر اسجد جیل گیا اور اب یہ افتاد..... تم خود ٹھنڈے دل سے غور کرو۔"

ندرت بی بولنے پر آئیں تو پھر رکی نہیں۔

ثمن کے چہرے پر شرم ساری چھائی تھی۔ اسے اپنے گھر والوں کی زیادتیوں کا احساس تھا۔ بلقیس ہونٹ بھینچے سب سن رہی تھیں۔

"خالہ! آپ بڑی ہیں اور میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ گھر میں پہلے ہی بہت پریشانی ہے۔ جس ماں کا بیٹا الگ ہو، وہی یہ دکھ جانتی ہے۔ میری بہو سے ثمن کا کیا مقابلہ۔ اس نے تو یہاں بھی عیش کیے اور الگ رہ کر بھی عیش ہی کر رہی ہے۔ ثمن کو تو شروع دن سے سکون کا سانس نہیں ملا۔ میری بچی مرجھا کر رہ گئی ہے مگر یہاں کسی کے دل میں انصاف ہی نہیں ہے۔"

وہ اٹھیں اور بڑبڑاتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔

ثمن نے ایک شرمندہ نظر ندرت بی پر ڈالی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گئیں۔ وقت کا آئینہ چہرہ تو دکھا دیتا ہے مگر اسے سمجھنا اور قبول کرنا صرف اہل ظرف کا کام ہے۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہو گئے ہیں

☆ فصل غم کا گوشوارہ — رضیہ جمیل — قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم — راحت جبیں — قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو — نبیلہ عزیز — قیمت: -/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہو جائے گی جب تم سے شناسائی ذرا اور
بڑھ جائے گی شاید مری تنہائی ذرا اور

کیوں کھل گئے لوگوں پہ مری ذات کے اسرار
اے کاش کہ ہوتی مری گہرائی ذرا اور

پھر ہاتھ پہ زخموں کے نشاں گن نہ سکو گے
یہ اُلجھی ہوئی ڈور جو سلجھائی ذرا اور

تردید تو کر سکتا تھا پھیلے گی مگر بات
اس طور بھی ہو گی تری رسوائی ذرا اور

ہے دیپ تری یاد کا روشن ابھی دل میں
یہ خوف ہے لیکن جو ہوا آئی ذرا اور

بڑھ جائیں گے کچھ اور لہو بیچنے والے
ہو جائے اگر شہر میں مہنگائی ذرا اور

اک ڈوبتی دھڑکن کی صدا لوگ نہ سُن لیں
کچھ دیر کو بجنے دو یہ شہنائی ذرا اور

آنس معین

مرے دل کی راکھ کرید مت اسے مسکرا کے ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر بھی چراغ ہے کہیں تیرا ہاتھ جلا نہ دے

نئے دور کے نئے خواب ہیں نئے موسموں کے گلاب ہیں
یہ محبتوں کے چراغ ہیں انہیں نفرتوں کی ہوا نہ دے

ذرا دیکھ چاند کی پتیوں نے بکھر بکھر کے تمام شب
ترا نام لکھا ہے ریت پر کوئی لہر آ کے مٹا نہ دے

میں اُداسیاں نہ سجا سکوں کبھی جسم و جاں کے مزار پر
نہ دے جلیں مری آنکھ میں مجھے اتنی سخت سزا نہ دے

مرے ساتھ چلنے کے شوق میں بڑی دھوپ سر پہ اُٹھائے گا
ترا ناک نقشہ ہے موم کا کہیں غم کی آگ گھلا نہ دے

میں غزل کی شبنمی آنکھ سے نہ دکھوں کے پھول چنا کروں
مری سلطنت مرا فن رہے مجھے تاج و تخت عطا نہ دے

بشیر بدر

یوسف خان

واقعہ یہ ہے کہ اگلا ثانیہ
اَن گنت اسرار کے پردوں میں ہے
لیکن اک فلمی کہانی کے توہم کردار کو
اپنی ساری داستاں معلوم ہے

مسئلہ یہ ہے کہ اس 'معلوم' کو
یوں بسر کرنا کہ گویا ہر گھڑی مشکور ہے
کس ہنرمندی سے کونے طے کیا
یہ کٹھن جادہ — یہ مشکل مرحلہ!
بارہا دیکھی ہے میں نے، دیدۂ حیراں کے ساتھ
تیرے حرفِ زیرِ لب میں برق کہراتی ہوئی
تیرے سحر انگیز اسلوبِ ادا کے سامنے
لفظ بھی مجھ کو ادھورے سے لگے!
ڈھل گئے ہیں جب ترے کردار میں
زندگی کے درد و غم اچھے لگے

تیرے طرزِ فن میں آئی ہے نظر
ماورائے فن کی زیبائی مجھے
یاد آتا ہے
پشاور میں ترا جشنِ پذیرائی مجھے
وہ ترے شیدائیوں کا جمگھٹا!
میں تو اس تقریبِ استقبال میں
دیکھنے والوں کو تکتا رہ گیا!

انور مسعود

لوگ کہتے ہیں کہ تو اب بھی خفا ہے مجھ سے
تیری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

ہائے اس وقت کو کوسوں کہ دُعا دوں یارو
جس نے ہر درد مرا چھین لیا ہے مجھ سے

دل کا یہ حال کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
ایسا لگتا ہے کوئی جُرم ہوا ہے مجھ سے

اب مرے قتل کی تدبیر تو کرنی ہوگی
کون سا راز ہے تیرا جو چھپا ہے مجھ سے

جاں نثار اختر

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے کہا۔

"اللہ کے رسول! سب سے سخت مصیبت کس پر آتی ہے؟"

آپ نے فرمایا: "نبیوں پر، پھر جو ان کے بعد سب سے افضل ہیں، پھر جو ان کے بعد افضل ہیں۔ بندے پر اس کے دین کے مطابق آزمائش آتی ہے۔ اگر وہ اپنے دین (اور ایمان) میں مضبوط ہو تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ اگر اس کا ایمان نرم ہو تو اس کے ایمان کے مطابق آزمائش آتی ہے۔

بندے پر آزمائش (اور مصیبت) آتی رہتی ہے حتیٰ کہ اسے ایسا کر کے چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس پر کوئی گناہ (باقی) نہیں ہوتا۔"

(نسائی)

لیڈر کی بصیرت،

لیڈر کا کام یہ ہے کہ عوام کو اس مقام سے جہاں وہ ہیں، اس مقام تک لے آئے جہاں انہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کدھر جا رہی ہے۔ اسے عوام پوری طرح نہیں سمجھتے۔ لیڈر کو بصیرت کا حامل ہونا چاہیے۔ جو لیڈر یہ بصیرت نہیں رکھتے، وہ ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں، چاہے وہ وقتی طور پر کتنے ہی مقبول کیوں نہ ہوں۔

(ہنری کسنجر)

نئے نظام کے لیے ضروری شرط،

اگر ہمیں کوئی نیا نظام بنانا ہے تو پرانے نظام کو یاد رکھنا چاہیے۔ اگر ہم نے پرانے نظام کو بھلا دیا تو پھر ہمیں یہ بھی پتا نہیں چلے گا کہ کس قسم کی باتوں کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور ایک دن نوبت یہ آئے گی کہ ہم جدوجہد سے بھی تھک جائیں گے اور مشین کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔

(انتظار حسین)

ادیب کو ان چار لوگوں سے بچنا چاہیے،

چار آدمیوں کی محبت ادیب کے تخلیقی کام میں کھنڈت ڈالتی ہے۔

- لڑاکا بیوی۔
- باتونی انٹلکچوئل۔
- لالچی معلم۔
- ادب کی سرپرستی کرنے والا افسر۔

(انتظار حسین)

فکر انگیز جملے،

ساؤتھ افریقہ میں ایک یونیورسٹی کے دروازے پر یہ فکر انگیز جملے درج ہیں۔

- کسی قوم کو تباہ کرنے کے لیے ایٹم بم یا دور تک مار کرنے والے میزائلز کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے نظام تعلیم کا معیار گرا دو۔
- طلبہ و طالبات کو امتحانات میں نقل کرنے کی اجازت دے دو۔ وہ قوم خود تباہ ہو جائے گی۔
- اس ناکارہ نظام تعلیم سے نکلنے والے ڈاکٹر کے ہاتھوں مریض مرتے رہیں گے۔

- انجینئرز کے ہاتھوں عمارات تباہ ہو جائیں گی۔
- معیشت دانوں کے ہاتھوں دولت ضائع ہو جائے گی۔
- مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں انسانیت تباہ ہو جائے گی۔
- ججز کے ہاتھوں انصاف کا قتل ہو جائے گا۔
- نظامِ تعلیم کی تباہی قوم کی تباہی ہوتی ہے۔

عمل بھی

- زندگی میں چند خاص باتوں پر غور و فکر کے ساتھ عمل کرنا بھی لازمی ہے۔
- کامیابی کے حصول کے لیے سب سے پہلے اپنی سوچ کو مثبت بنائیں اور دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا سیکھیں۔
- خوش اخلاقی سے کام لیں اور اپنا کام محنت و لگن سے انجام دیں۔
- زیادہ سوچنے سے انسان کے فیصلے کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی مقصد میں فیصلہ کر لیں تو اس کو انجام تک پہنچا کر ہی دم لیں۔
- ناکامیوں سے نہ گھبرائیں بلکہ ناکامیوں اور غلطیوں سے سیکھتے ہوئے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہیں۔
- مایوسی کفر کی علامت ہے، اسے اپنے قریب بھی نہ آنے دیں۔
- کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے آپ کا مطمئن ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے نتائج ادھورے رہ جاتے ہیں۔
- اگر انسان اپنی راہ کا تعین کر کے اس پر عمل کرے تو یقیناً اسے کامیابی ضرور ملتی ہے۔ کیونکہ انسان محنت سے ہر چیز حاصل کر سکتا ہے۔

رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں

باپ چار بچوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوا، ایک سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

بچے۔ بچے نہیں آفت کے پرکالے تھے۔ انہوں نے ٹرین چلتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیا۔

کوئی اوپر کی سیٹوں پر چڑھ رہا ہے تو کسی نے مسافروں کا سامان چیرنا شروع کر دیا۔

کوئی چادر میاں کی ٹوپی اتار کر بھاگ رہا ہے تو کوئی زور زور سے چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہا ہے۔

مسافر سخت غصے میں تھے۔ کیسا باپ ہے؟ نہ انہیں منع کرتا ہے نہ انہیں کچھ کہتا ہے۔ کوئی اسے بے حس سمجھ رہا تھا تو کسی کے خیال میں وہ نہایت نکما تھا۔

بالآخر جب برداشت کی حد ہو گئی تو ایک صاحب غصے سے اٹھ کر باپ کے پاس پہنچے اور دھاڑ کر بولے۔

"آپ کے بچے ہیں یا مصیبت؟ آخر آپ ان کو ڈانٹتے کیوں نہیں؟"

باپ نے ان صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور بولا۔

"آج صبح ان کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے، میں ان کو وہیں لے کر جا رہا ہوں۔ مجھ میں ہمت نہیں کہ ان کو کچھ کہہ سکوں۔ آپ روک سکتے ہیں تو روک لیں۔"

سارے مسافر ایکدم سناٹے میں آ گئے۔

ایک ہی لمحے میں منظر بالکل بدل چکا تھا۔

وہ شرارتی بچے سب کو پیارے لگنے لگے تھے۔ سب آبدیدہ تھے۔ سب انہیں پیار کر رہے تھے۔

زندگی میں ضروری نہیں کہ حقائق وہ ہی ہوں جو بس ہمیں نظر آ رہے ہوں، بلکہ وہ بھی ہو سکتے ہیں جو ہمیں نظر نہ آ رہے ہوں۔ رائے قائم کرنے میں وقت لگائیں۔

بدگمانی سے پہلے خوش گمانی کو کچھ وقت دیں۔

فیصلے سے پہلے ذرا ایک بار اور سوچ لیں۔

مریم۔ لاہور

والمیکی، (ہندو مذہب کی کتاب۔ راماین کا مصنف) والمیکی کا شمار سنسکرت کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس نے ہندو مذہب کے بھگوان رام کی

سیرت کو رامائن کی صورت میں منظوم کیا ہے۔ اس عظیم نظم میں چوبیس ہزار اشعار ہیں۔

والمیکی رام کا ہم عصر تھا۔ اسے رام سے براہ راست ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے رام کے بیٹوں لوا اور کش کی پرورش کی تھی۔

نوجوانی میں والمیکی ایک ڈاکو تھا۔ بعض روایات میں اسے ڈاکو کے ساتھ ساتھ قاتل بھی کہا گیا ہے۔

ایک دفعہ والمیکی نے جنگل سے گزرنے والے ایک برہمن رشی نرد کو لوٹا۔ نرد نے والمیکی سے پوچھا۔

"تم لوٹ مار کیوں کرتے ہو؟"

والمیکی نے جواب دیا۔ "میں اپنے بیوی بچوں کو پالنے کے لیے لوٹ مار کرتا ہوں۔"

نرد نے کہا۔ "کیا تمہارے مرنے کے بعد تمہارے بیوی بچے تمہارے گناہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔"

والمیکی نے کہا۔ "کیوں نہیں۔ میں یہ کام ان ہی کے لیے کرتا ہوں۔"

نرد نے کہا۔ "ذرا اپنے بیوی بچوں سے معلوم تو کرو کہ وہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔"

والمیکی کو نرد کی بات میں معنی نظر آئے تو اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچا۔ اس نے بیوی بچوں کے سامنے نرد کا سوال دہرایا۔

بیوی بچوں نے کہا۔ "ہم مرنے کے بعد تمہارے گناہ میں ہرگز حصے دار نہیں ہوں گے۔"

یہ لمحہ والمیکی کی زندگی میں قلب ماہیت کا لمحہ تھا۔ اس نے لوٹ مار ترک کر دی اور وہ نرد کا شاگرد بن گیا۔

نرد نے اس سے کہا۔ "تم جنگل کے کسی گوشے میں بیٹھ کر بھگوان رام کا ذکر کرو۔"

والمیکی نے ایسا ہی کیا۔ ذکر میں اس کی محویت اتنی بڑھی کہ اسے اپنا ہوش ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ اس کے جسم پر چیونٹیوں نے گھر بنا لیا۔ اسی نسبت سے والمیکی کہلایا۔

پرنسپل کا خط والدین کے نام

سنگاپور میں امتحانات سے قبل اسکول کے پرنسپل نے بچوں کے والدین کو خط بھیجا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"محترم والدین!

آپ کے بچوں کے امتحانات جلد ہی شروع ہونے والے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ سب اس چیز کو لے کر بہت بے چین ہوں گے کہ آپ کا بچہ امتحانات میں اچھی کارکردگی دکھائے۔ لیکن یاد رکھیں یہ بچے جو امتحانات دینے لگے ہیں ان میں (مستقبل کے) آرٹسٹ بھی ہوں گے، جنہیں ریاضی سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

اس میں بڑی بڑی کمپنیوں کے ترجمان بھی ہوں گے، جنہیں انگلش، ادب اور سٹری سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

ان بچوں میں (مستقبل کے) موسیقار بھی ہوں گے جن کے لیے کیمسٹری کے فارمولز کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ان سے ان کے مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑتے والا۔

ان بچوں میں ایتھلیٹس بھی ہو سکتے ہیں جن کے فزکس کے مارکس سے زیادہ ان کی فٹنس اہم ہے لہٰذا اگر آپ کا بچہ زیادہ مارکس لا تا ہے تو بہت خوب لیکن اگر وہ زیادہ مارکس نہیں لا سکا تو خدارا اس کی خود اعتمادی اور اس کی عظمت اس بچے سے نہ چھین لیجیے گا۔ اگر وہ اچھے مارکس نہ لا سکیں تو انہیں حوصلہ دیجیے گا کہ کوئی بات نہیں یہ ایک چھوٹا سا امتحان ہی تھا۔ وہ زندگی میں اس سے بھی کچھ بڑا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔"

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

زرینہ خانم لغاری ——— مظفر گڑھ

حسن مصروف خود نمائی ہے
عشق کا دور ابتدائی ہے
دل نے غم سے شکست کھائی ہے
عمر رفتہ تری دہائی ہے

رضوانہ وقاص ——— ہری پور

جب بڑھ گئی عمر گھٹ گئی زیست
جو حد سے زیادہ ہو وہ کم ہے

فرحانہ منہاس ——— کراچی

بات وہ کہیے کہ جس بات کے سو پہلو ہوں
کوئی پہلو تو رہے بات بدلنے کے لیے

حمدہ واجد ——— کراچی

بات الٹی وہ سمجھتے ہیں جو کچھ کہتا ہوں
اب کے پوچھا تو یہ کہہ دوں گا کہ حال اچھا ہے

ثناء اسلم رانا ——— بھکر

خموشی میری معنی خیز تھی اے آرزو کتنی
کہ جس نے جیسا چاہا ویسا افسانہ بنا ڈالا

زینب زریں ——— قلعہ دیدار سنگھ

لوگ دیتے رہے کیا کیا نہ دلاسے مجھ کو
زخم گہرا ہی سہی زخم ہے بھر جائے گا

فاکہہ سہیل ——— کراچی

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

افشاں شاہی ——— کراچی

بھولتے ہیں رفتہ رفتہ انہیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزا ہم سے پوچھیے

سارہ رحمٰن ——— بستی سوکڑ

آپ کے لب پہ اور وفا کی قسم
کیا قسم کھائی ہے خدا کی قسم

خنسا ——— لاہور

کاش دیکھو کبھی ٹوٹے ہوئے آئینوں کو
دل شکستہ ہو تو پھر اپنا پرایا کیا ہے

سحر احمد ——— کراچی

اٹھو یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

نادیہ یاسر ——— گوجر خان

انجام وفا یہ ہے جس نے بھی محبت کی
مرنے کی دعا مانگی جینے کی سزا پائی

ارم کمال ——— فیصل آباد

ہم جو پہنچے تو رہ گزر ہی نہ تھی
تم جو آئے تو منزلیں لائے

آمنہ سعد ——— کراچی

دو ہی لفظوں کا تھا وہ افسانہ
جو سنا کر خاموش ہو بیٹھے
ابتدا یہ کہ تم کو چاہا تھا
انتہا یہ کہ تم کو کھو بیٹھے

وجیہہ رحمٰن ——— بفرزون

یہ لمحوں کا نہیں ہے یہ صدیوں کی مسافت ہے
کسی کی یاد کا صحرا محبت ہم سفر میری
وہی ہر وقت سوچوں پر کسی کی یاد کا پہرہ
وہی دن رات کا جلنا، محبت ہم سفر میری

بشریٰ انیس ——— کراچی

کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آج جینا بڑا محال ہوا

لائبہ ایمن ——— آزاد کشمیر

مجھے تھا زعم مگر میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا

امت الصبور

خاتون کی ڈائری

ثوبیہ قطب

کی ڈائری سے

طاقت ور کو ہر دور میں کمزور پر سبقت حاصل رہی ہے۔ مگر ایک ایسی طاقت بھی ہے کہ جس کے آگے ابلیس و فرعون سب بے بس ہیں۔ عباس تابش کی اس غزل میں ظالموں کو متنبہ کیا گیا ہے۔

تو پرندے مار دے سرو و صنوبر مار دے
تیری مرضی جس کو دہشت گرد کہہ کر مار دے

تیرا اس کے ماننے والوں سے پالا پڑ گیا
جو پرندے بھیج کر لشکر کے لشکر مار دے

تم بھی موسیٰ کے تعاقب میں چلے تو آئے ہو
دیکھنا تم کو نہ یہ نیلا سمندر مار دے

تو نے جس کے ڈھونڈنے کو بھیج دی اتنی سپاہ
یہ نہ ہو وہ تجھ کو تیرے گھر کے اندر مار دے

اس کو کیا حق ہے یہاں بارود کی بارش کرے
اس کو کیا حق ہے مرے رنگے کبوتر مار دے

فیصلے تاریخ کے میدان میں ہوتے نہیں
مارنے والو! کوئی تم کو نہ مر کر مار دے

روشنی کے واسطے پندار کا سودا نہ کر
سامنے سورج بھی ہے تو اس کو ٹھوکر مار دے

گونج تو بھی اس کے لہجے میں پہاڑوں کی طرح
تابش اس کی بات تو بھی اس کے منہ پر مار دے

ماریہ عمران

کی ڈائری سے

"نگاہ عشق" کے عنوان سے محسن نقوی کی یہ غزل آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

حقیقت جان کر ایسی حماقت کون کرتا ہے
بھلا بے فیض لوگوں سے محبت کون کرتا ہے

بتاؤ جس تجارت میں خسارہ ہی خسارہ ہو
بنا سوچے خسارے کی تجارت کون کرتا ہے

ہمیں ہی غلط فہمی تھی کسی کے واسطے ورنہ
زمانے کے رواجوں سے بغاوت کون کرتا ہے

خدا نے صبر کرنے کی مجھے توفیق بخشی ہے
ارے جی بھر کے تڑپاؤ شکایت کون کرتا ہے

کسی کے دل کے زخموں پہ مرہم رکھنا ضروری ہے
مگر اس دور میں محسن یہ زحمت کون کرتا ہے

نمرہ اقرأ

کی ڈائری سے

شبنم ہے کہ دھوکا ہے کہ جھرنا ہے کہ تم ہو
دل دشت میں اک پیاس تماشا ہے کہ تم ہو

اک لفظ میں بھٹکا ہوا شاعر ہے کہ میں ہوں
اک غیب سے آیا ہوا مصرع ہے کہ تم ہو

دروازہ بھی جیسے مری دھڑکن سے جڑا ہے
دستک ہی بتاتی ہے پرایا ہے کہ تم ہو

اک دُھوپ سے اُلجھا ہوا سایہ ہے کہ میں ہوں
اک شام کے ہونے کا بھروسا ہے کہ تم ہو

میں ہوں بھی تو لگتا ہے کہ جیسے میں نہیں ہوں
تم ہو بھی نہیں اور یہ لگتا ہے کہ تم ہو!

صفیہ مہر

کھو ڈائری سے

سلیم کوثر شاعری میں ایک مستند نام ہے

جن کی شاعری کسی تعارف یا تعریف کی محتاج نہیں۔ وہ محبتوں کے شاعر ہیں اور محبتوں سے ہی اسیر کرتے ہیں۔

اس قدر رات گئے کون ملاقاتی ہے
ایسا لگتا ہے کوئی یاد چلی آتی ہے

جس نے چاہا نہ کہا اور نہ کبھی خواہش کی
تیرے کوچے میں، تیری آب و ہوا لاتی ہے

یہ ستارے تو یونہی ساتھ چلے آتے ہیں
ورنہ یہ چاند اکیلا میرا باراتی ہے

میں تو دُشمن کے بچھڑنے پہ بھی رویا ہوں بہت
تُو تو پھر یار ہے اور یار بھی جذباتی ہے

حبیبہ خان

کھو ڈائری سے

زمانۂ طالب علمی میں فراق گورکھپوری سے تعارف ہوا تو پتا چلا کہ وہ کتنے اچھے شاعر ہیں۔ ان کی یہ غزل پڑھیں۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دُور سے پہچان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

جسے صورت بتاتے ہیں پتا دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ اُلفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں

فراق اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

اقصیٰ ناصر

کھو ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر پروین شاکر کی یہ غزل آپ سب بہنوں کی نذر۔

نیند تو خواب ہے اور ہجر کی شب خواب کہاں
اس اماوس کی گھنی رات میں مہتاب کہاں

رنج سہنے کی مرے دل میں تب و تاب کہاں
اور یہ بھی ہے کہ پہلے سے وہ اعصاب کہاں

میں بھنور سے تو نکل آئی اور اب سوچتی ہوں
موجِ ساحل نے کیا ہے مجھے غرقاب کہاں

میں نے سونپی تھی تجھے آخری پونجی اپنی!
چھوڑ آیا ہے مری ناؤ تہہِ آب کہاں

ہے رواں آگ کا دریا مری شریانوں میں
موت کے بعد بھی ہو پائے گا پایاب کہاں

بند باندھا ہے سَروں کا مرے دہقانوں نے
اب مری فصل کو لے جائے گا سیلاب کہاں

بقیہ ہمارے نام

فیکٹ ٹاپ آف والسٹ افسانہ تھا۔ انداز بھی خوب تھا۔ حمیرا شفیع اور منعم ملک نے بھی خوب لکھا۔ ایمل رضا کا انٹرویو لیں ناں۔ ادنیٰ سی خواہش۔

☆ پیاری زینب! آپ کی مجبوریوں کا ہمیں اندازہ ہے، اس لیے آپ کا پچھلے ماہ کا خط شامل اشاعت ہے۔ ناول ضرور لکھیں، آپ ناول لکھتے ہوئے صفحہ نہ چھوڑیں لیکن سطر ضرور چھوڑیں کیونکہ ہمیں تصحیح کرنا ہوتی ہے۔ ہم نے تبسم کے افسانے مسترد کر دیے تھے، اس لیے ماہا ہم سے ناراض ہیں۔

فرحانہ مہناز.....اسلام آباد

14 اگست 1947ء ہمارے لیے ایک خوب صورت آزادی کا دن جو ہمارے بڑوں نے بہت سی قربانیوں کے بعد حاصل کیا۔ مجھے پاکستان کا ہر خطہ بہت پسند ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سائرہ رضا نے ''برمیل تذکرہ'' میں تاریخ کے بارے میں بات کی۔ کچھ لوگوں نے اسے ناپسند کیا حالانکہ انہوں نے بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے سائرہ رضا کا تبصرہ بہت اچھا لگا (سوچا اگست میں اس کے بارے میں لکھوں گی)۔ ارطغرل غازی شاید پی ٹی وی پر چلا تھا جس کا میں نے صرف نام ہی سنا ہے کیونکہ مشہور چیزیں مجھے بہت کم ہی اچھی لگتی ہیں۔ نایاب چیزیں زیادہ اٹریکٹ کرتی ہیں۔

اف ہماری پاکستانی قوم! تاریخ تو سچ میں ہماری کتابوں میں بند پڑی ہے۔ اسے کھولنے کے بجائے ہم پروپیگنڈے پر یقین کر لیتے ہیں۔ آپی جان! میں آپ کو بتاؤں چودہ اگست 1947ء کو ہجرت کے وقت میرے دادا ابو کے بڑے بھائی یعنی بڑے دادا اور چھوٹے دادا ابو کی چھوٹی سی بیٹی راستے میں ہی انتقال کر گئے اور ان کو کہیں راستے میں ہی دفنا دیا بلکہ دفنانا کیا، ایک ہی قبر میں دونوں کو دفنایا۔ قبر بھی کیسی، ایک گڑھا کھودا، دونوں کو خوف کے سائے میں ڈالا اور روتے ہوئے اپنے پیاروں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ پاکستان آنے کے لیے کہ اب بھی ان کی قبر پر جانا نصیب نہ ہوگا اور اب ہماری جنریشن، خیر بات کبھی ہو جائے گی۔

''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' راحت جبین نے بہت رلایا۔ اتنی غربت۔ بچیوں کا دوسرے گھر کام کرنے کے عوض کھانا ملنا اور کچرے پر گلے سڑے پھل..... اف میرے آنسو رواں اور آنکھوں میں مرچیں، چبھن۔ ''رنگ ریز میرے'' پتا نہیں کیوں کبھی لگتا ہے کہ عباد نہیں ہے بلکہ زیاد اس کی جگہ پر ہے اور کبھی کی یاد اسے حریم تک جانے نہیں دیتی۔ گل ارباب کی کہانی اور ملاقات دونوں اچھی لگی۔ زینب نور کا بچپن بہت پسند آیا۔ ہمارا بچپن تو ہماری کمزوری ہے۔ قارئین نے فرحت اشتیاق سے سوال کر کے بہت اچھی ملاقات کروادی۔ ''ہمارے نام'' میں ابرش شاہ نے بہت پیارا خط لکھا۔

''سکندر اعظم کی آمد'' راشدہ رفعت جب بھی لکھتی ہیں، روانی سے معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''متاع'' مناسب ہی لگا۔ ''کرن کرن روشنی'' میں گواہی سے متعلق احکام و مسائل بیان کیے۔ شکریہ، جزاک اللہ۔ ''آپ کا باورچی خانہ'' سکینہ علی کا۔ کچن کی دونوں ٹپ اچھی لگی، آزمائیں گے۔

آپی جان! مجھے بھی لگتا ہے کہ آج کل میرے خط زیادہ لمبے ہو رہے ہیں لیکن یہاں آکر فرسٹریشن، ڈپریشن اور بھی بہت کچھ ہے تو اس کو نکالنے کا طریقہ یہی ہے کہ آپ سے تحریری بات کر لی جائے۔ ساری ٹینشن مہنگائی کی ہے۔

☆ فرحانہ! آپ نے جو افسانے لکھے ہیں، وہ بھجوا دیں یا جو کہانیاں لکھی تھیں، انہیں دوبارہ لکھ کر بھجوائیں۔ آپ کی کہانیاں اچھی تھیں لیکن ہمیں ان میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ دوبارہ لکھیں گی تو یقیناً بہتر ہوں گی۔

ثانی رانی۔ شمسہ.....گاؤں نوشہری خان (ٹیکسلا)

خاور (بھائی) مسلسل گھوریوں سے نواز رہا ہے مجھے لیکن میں نے بھی کافی سے کچھ زیادہ ہی ڈانٹ کھانے کے بعد اسے منا ہی لیا ہے۔

آج جولائی کی آٹھ تاریخ ہو گئی ہے لیکن ہمیں ابھی تک جون کا خواتین بھی نہیں ملا۔ سو پرانے رسالے پہ تبصرہ کر رہی ہوں۔ ''حالم'' زبردست اینڈ کیا ہے۔ نمرہ آپی! بہت بہت مبارک باد۔ خط لکھنے پر جس تحریر نے مجبور کیا ہے وہ ''دل کو بد دعا ہے'' نازیہ رزاق! کیا تحریر دی ہے آپ نے۔ کمال کر دیا (بلکہ کمال کی پوری افضال، جمال، دھمال کہیں تو غلط نہ ہوگا)۔ ویسے تو نازیہ رزاق کے لفظوں میں اتنی گہرائی ہوتی ہے کہ بندے کو پوری توجہ سے ڈوب

بجے دیے گئے مزاج کو پڑھ کر بندہ لوٹ پوٹ ہو جائے۔ تب سے اب تک میں کتنی ہی دفعہ اس تحریر کو پڑھ چکی ہوں۔ رسالہ پڑھنے کے بعد ہم تینوں بہنیں جب ڈسکس کرتی ہیں تو ہماری پھپھو زاد بہنیں مریم اور حمنہ بہت چڑتی ہیں۔ کہتی ہیں ''آپی! ہمارے سامنے وہ بات کیا کرو، جس میں ہمیں بھی سر پیر کا کچھ پتا ہو''۔ ''رنگ ریز میرے'' یہ ناول جتنا مجھے پسند ہے، اتنے ہی اس کے صفحات کم۔ اوپر سے ہر دوسرے ماہ چھٹی، پلیز عفت سحر آپی! دو تین اقساط تو اکٹھی بھیج دیا کریں نا۔

☆ پیاری بہن! ہمیں آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے۔ اس لیے آپ کا پرانا خط لگا دیا ہے۔ آپ تاخیر سے سہی، ہمیں خط ضرور لکھیں۔ ہمارے لیے اہم بات پرچے کے بارے میں آپ کی رائے جاننا ہے۔

نازیہ رزاق کی تحریر پر آپ کے تبصرے سے متفق ہیں۔ ہمیں بھی ان کی تحریر ہمیشہ چونکا جاتی ہے۔

ریحانہ چوہدری ..... مدو کے

گوشی جمال، فرحانہ مہناز کے خطوط واقعی دلچسپ ہوتے ہیں۔ جن بہنوں نے ہماری کمی محسوس کی، ان کا شکریہ۔ صفحہ نمبر دس پر مدیر صاحب نے موقع کی مناسبت سے عید قرباں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے خوب صورت دعا دی، اس کے لیے شکریہ۔ پھر ''کرن کرن روشنی'' سے روح کو منور کیا۔ عید الاضحیٰ کی رونقوں نے توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے۔ بھئی یہاں تو اپنی قاری بہنوں نے خوب رونق لگائی ہوئی تھی۔ واہ گل ارباب! بے تکلف جوابات کے ساتھ ہی طوبیٰ کی باتیں پڑھیں۔

''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' سچ حقیقتوں کا ترجمان یہ ناول پیاز کی پرتوں کی طرح ہر قسم میں ایک نیا رنگ دکھاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کا ''کروٹا والی گلی میں عید'' موجودہ صورت حال کی اچھی ترجمانی تھا۔ راشدہ رفعت کا مکمل ناول ''سکندر اعظم کی آمد'' رشتوں کی باریکیوں اور نزاکتوں کا عکاس تھا۔

گل ارباب کا ناول شوگر پیشنٹ کے بارے میں ایک اچھی تحریر تھی۔ بھئی ہماری زینب نور باقاعدہ رائٹر بن چکی ہیں، اس بات کی خوشی ہے۔ بھئی میری گجراتن بہن عفت سحر طاہر کا ''رنگ ریز میرے'' اس مرتبہ زیادہ مناظر فلیش بیک کے تھے۔ شاید اب کچھ اسپیڈ تیز ہو جائے۔

''نفسیاتی الجھنیں'' کے سلسلے میں ہمیشہ عدنان بھائی کے مشورے صائب ہوتے ہیں مگر مسئلوں کے بارے میں پڑھ کر دل بہت اداس ہوتا ہے۔ باقی سب سلسلے بہترین ہیں۔

☆ ریحانہ! پیاری سارہ کی شکایت بجا ہے کہ ہمارے پاس خطوط کا ایک انبار ہوتا ہے، اس لیے کبھی دل پر پتھر رکھ کر ہمیں بہت اچھے اچھے خطوط کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

گوشی جمال ..... یزمان

''کہنی سنی'' بہت عمدہ بات سے باقاعدہ آغاز۔ جیسے اسکول کے زمانے میں ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' سے آغاز ہوتا ہے، بالکل ویسے ہی۔ عید سردے میں خود کو براجمان پایا۔ دل خوشی سے مینگو مینگو ہو گیا۔ دراصل ان دنوں مینگو کا سیزن جو ہے۔ گل ارباب خاصی باپردہ خاتون ہیں۔ ''سوال یہ ہے کہ'' سلسلہ جاری رہنا چاہیے کیونکہ مصنفین کا کافی بڑا ٹولہ ہے۔ ویسے کیا ہی اچھا ہو کہ ہر ماہ ایک مصنفہ کا نام دے دیا کریں، اگلے ماہ سب قارئین اس کو ہی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیے رکھیں۔ بہن طوبیٰ صدیقی ماشاء اللہ سے عرصہ دراز سے شوبز سے منسلک ہیں، بال بچوں والی ہے۔ عمر بتا بھی دیتیں تو کوئی حرج نہ تھا۔ معذرت۔ اس دفعہ افسانے بہنوں نے کافی فرصت میں لکھے ہیں، طویل تر ہیں۔ افسانہ مختصر اور جامع زیادہ بہتر ہے، کیا خیال ہے؟ ''کروٹا والی گلی میں عید'' اور ''عید کی شام'' متاثر کن۔

''مریض عشق'' گل ارباب اچھی کوشش۔ ہمیشہ کی طرح ابھی تک گل ارباب کی کوئی اچھوتی، تہلکہ خیز چیز سامنے نہیں آئی۔ روٹین سبجیکٹ کو لے کر خراماں خراماں چل رہی ہیں۔ کوئی دھواں دھار لکھیں اور چھا جائیں۔ ''سکندر اعظم کی آمد'' ٹھنڈا ٹھار، گل بہار۔ ''ہمارے نام'' سب بہنوں کے خط غور سے پڑھے۔ میرے خطوط کی پسندیدگی کے لیے بہنوں کا بے حد شکریہ۔ ایک نویں کلاس کی طالبہ ایرش شاہ کا خط غور طلب رہا۔ پندرہ سال کی بچی کے الفاظ کی یہ پختگی کچھ ہضم نہیں ہوئی۔ شاید اماں یا پھر بڑی آپا کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے۔

سکتہ سا طاری ہو گیا بھئی ہم پر۔ خط کا اینڈنگ مرحلہ چل رہا تھا کہ ہمارے ساتھ ایک واقعہ پیش آ گیا۔ آٹھ سالہ بھانجا اس آم چوستے ہوئے فوراً میرے سر پر آ دھمکا اور آم شریف کا گودا خط پر براجمان۔ ہائے اور ہا! گھنٹے کی مغز ماری سے خط

نیچے جھلنگا سی پڑی چارپائی پر اتر کر دوبارہ لکھا۔

شمارہ کی قیمت دس روپے بڑھ گئی۔ یہ کوئی اتنا اچنبھے کی بات نہیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ تو ایسے ہے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ ہر چیز تو مہنگی ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو اسی روپے میں آتا کیا ہے آج کل کے دور میں۔ دادِ بھئی پورے ادارے کی ٹیم کو جو اس قیمت میں سب مینج کر رہے ہیں۔ آج کل تو ڈیڑھ لیٹر کولڈ ڈرنک کی بوتل سو روپے کی مل رہی ہے اور اسی روپے میں اتنا عمدہ شمارہ ہمیں فراہم ہو رہا ہے۔

☆ ج: پیاری گوشی ہم واقعی بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمیں اتنا پیار کرنے والے قارئین نصیب ہوئے۔ ہماری تقریباً سب ہی قاری بہنوں نے پرچوں کی قیمت میں اضافہ پر کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ نہایت خوش دلی سے ہماری مجبوری کو تسلیم کرتے ہوئے اس اضافہ کو قبول کیا ہے۔

یہ آپ کی محبت ہے۔ اور محبت کا جواب صرف محبت ہی ہو سکتی ہے جو اپنی پیاری قارئین کے لیے ہمارے دل میں ہے۔

اماں کی طبیعت کیسی ہے؟ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ آپ کے سر پر قائم رکھے۔ انہیں ہمارا اسلام کہیے گا۔

مریم خان..... بھلر وان سرگودھا

جیسے ہی رسالہ ہاتھ میں آیا تو چھلانگ لگا کر سب سے پہلے خطوط کی طرف چلے۔ اپنا نام ڈھونڈا کہیں نہ ملا۔ جیسے ہی فوزیہ خالد احمد حیدرآباد کے خط پر پہنچے تو خیال آیا کہ حیدرآباد میں رہنے والی فوزیہ صاحبہ نجانے پنجاب کی گرمی کا ذکر کیوں کر رہی ہیں؟ پھر تھوڑا خط اور پڑھا پھر تو تصدیق ہو گئی کہ یہ تو میرا اپنا خط ہے، اس بات سے مجھے ان لوگوں کا غم یاد آیا جن کی کہانیوں پر کسی دوسرے کا نام سہواً لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ تو صرف خط تھا اب جلتے ہیں شمارے کی طرف۔ ویسے تو رسالہ دس روپے مہنگا ہو گیا ہے۔ مگر جب ہم لوگ آدھے آدھے لاکھ کے موبائلوں پر سو، ڈیڑھ سو، پانچ سو اور ہزار کے پیکیج کرانے سے نہیں کتراتے اور وائے فائے کا خرچا الگ سے ہے تو دس روپے رسالہ کے زیادہ ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

''کرن کرن روشنی'' بہت پیارا سلسلہ ہے۔ سروے میں گوشی جمال کو کہنا تھا کہ اوجھڑی مکروہ ہے کھانا، یہ نہیں کھانی چاہیے۔ باقی سب کے جوابات بھی اچھے تھے۔ گل ارباب کے بارے میں پڑھ کر جان کر اچھا لگا اور میں جگہ ملی۔ تو میں بھی اپنی کوششوں کو جاری رکھوں گی۔

راشدہ رفعت نے نام بہت پیارے رکھے ''عزم، اجر''، دونوں کے۔ پورا ناول بھی اچھا تھا۔ ''عید کی وہ شام'' حمیرا الشفیع کے افسانہ میں پلاٹ پرانا ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا مزاح بھی تھا۔ ''مریض عشق'' اچھا تھا شوگر کے بارے میں احتیاط اور تدابیر بتاتا ہوا۔

''برکت'' فشاں حسن علی نے بہت خوب لکھا۔ ''متاع'' ام ایمان قاضی نے اچھا لکھا مگر تینوں ناول ایک جیسے پلاٹ کے تھے۔ مجھے تو نعیمہ ناز کے ناول اچھے لگتے ہیں ذرا ہٹ کے ہوتے ہیں۔ دو ماہ سے وہ غیر حاضر کیوں ہیں، بتائیے گا۔ ''ہمارے نام'' میں بہت دنوں سے کوثر خالد سودا نے شمولیت نہیں کی، کیا وہ بیمار ہیں۔ یا پھر مصروفیت۔ کوئی پوچھے ان سے۔ عنیزہ سید کے والد کا افسوس ہوا، ان کو اللہ عزوجل جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے۔

''خبریں وبریں'' میں زینب قیوم کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دس ماہ بعد ہی شوہر نے ان کو طلاق دے دی تو ان کے بچے ان کا بدلہ شوہر سے کس طرح لیں گے (کیا دس ماہ میں دو تین بچے ہو گئے تھے ہاہاہا) باقی سلسلوں کے ساتھ ساتھ سکینہ علی کا باورچی خانہ بھی اچھا تھا۔

ج: پیاری مریم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط کسی اور نام سے شائع ہو گیا۔ آئندہ آپ خط لکھیں تو خط پر اپنا نام صاف صاف لکھیں۔ ہمیں آپ کے دکھ کا اندازہ ہے اس لیے اس ماہ سلسلے کی ابتدا آپ کے خط سے ہی کی ہے۔

نعیمہ ناز کی تحریریں پچھلے دو ماہ سے شعاع میں شامل ہو رہی ہیں۔ اس لیے وہ خواتین کے لیے لکھ پا رہی ہیں۔

عاصمہ نورین..... اٹک، پنجاب

اس وقت شدید گرمی میں لان میں بیٹھ کر آپ کو آپ کے شان دار ڈائجسٹ کی شان میں ایک عدد خط لکھ رہی ہوں۔ یہ الفاظ بھی ناں۔ یوں تو پورا دن کیا حکم ہے میرے آقا کی تفسیر بنے رہتے ہیں کہ کب قلم ہاتھ میں آئے اور الفاظ صفحوں پر ڈیرے ڈالتے چلے جائیں مگر جوں ہی کاغذ قلم اٹھا کر بیٹھو، گمشدہ محبت کی طرح الفاظ کے ٹولے بھی کسی اور جہان کی سیر کرنے نکل جاتے ہیں خواتین اور شعاع ڈائجسٹ سے رشتہ اس وقت ہی جوڑ لیا تھا، جب حروف کو جوڑ کر لفظ لکھنا سیکھے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر تیسری جماعت سے ہی گھر میں امی اور باجی اور پھر آپی کی بدولت

میں صرف کہانیوں کے عنوانات پڑھ کر سنایا کرتے تھے پھر فرسٹ ایر سے باقاعدہ ڈائجسٹ پڑھنے بلکہ گھول کر پی جانے کا آغاز ہوا اور الحمدللہ یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔

کالج، یونیورسٹی، سول سروس اکیڈمی اور پھر اب جاب اور بچوں کی ذمہ داری بھی ہمیں اس سے الگ نہیں کر سکی۔ لمبی داستان ہے کسی اور وقت تفصیل سے آپ کو بتائیں گے۔ فی الحال ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' نے اپنا گرویدہ کیا ہوا ہے، یقین جانیں۔ انور، رامین، مراد جیسے ذہن میں بیٹھ گئے ہوں۔ اسی شدت سے ہر ماہ خواتین رسالے کا انتظار رہتا ہے، جیسے لڑکپن میں رہتا تھا اور فیملی گروپ میں سب سسٹرز کے ساتھ ڈسکشن بھی چلتی ہے۔ ہم چھ بہنوں کا گروپ ہے، جس میں یہ پاٹ کیک بنا ہوا ہے۔ ''سکندر اعظم کی آمد'' بھی اچھی کہانی تھی۔ دل سے پڑھی جانے والی۔ زینب نور کے بچپن نے ہمیں بھی اپنا بچپن یاد دلایا بلکہ ہاتھ پکڑ کر اسی زمانے میں لا کھڑا کیا۔ سوچیے رات کا سماں ہو، آپ ہر طرح سے فری ہو کر رسالہ پڑھیں اور لیمپ کی روشنی میں ''بچپن'' پڑھ رہے ہیں۔ کیسے اس فلم کو آنکھوں کے سامنے چلنے سے روک سکتے ہیں جس میں ہم نے زندگی گزاری ہو؟ ایک ایک لفظ سے خوشی، مسرت اور مزا کشید کرتے ہوئے پڑھنا بہت ہی عمدہ تھا۔ جیتی رہیے۔ ''رنگ ریز میرے'' میں رنگ بھرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ عدنان بھائی جتنے احسن طریقے سے خطوط کے جوابات دیتے ہیں، دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تبصرہ ابھی باقی ہے مگر اب مچھروں کے غول کی بھنبھناہٹ بڑھتی جا رہی ہے اور بٹیا رانی ''وین دل یو گیٹ ڈن؟'' کی گردان کر رہی ہیں۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ حالات سیز فائر سے بھی قابو میں نہ آئیں، ان کو بیڈ روم لیے چلتے ہیں۔ ابھی ان کی مالش، سونے کی دعائیں اور چھوٹے موٹے کام کر کے ان کو نیند یا پور بھیج کر ممی خود ''گمنام گاؤں کا آخری مزار'' پڑھیں گی۔ دو ہفتوں سے پڑھ رہی ہوں اور انجوائے کر رہی ہوں۔ ''برکت'' کی تعریف نہ کی تو یہ ناانصافی ہوگی اور دل کو کچوکے لگتے رہیں گے۔ فشاء محسن آپ کا آئیڈیا دل کو بے حد بھایا۔ آپ کے الفاظ بہت مانوس اور دل آویز تھے۔

آمدید۔ اب تک کہاں تھیں آپ؟ بہت دیر کی آنے میں ماشاء اللہ بہت باصلاحیت ہیں۔ کبھی لکھنے کی طرف توجہ نہیں دی آپ نے؟ ہمیں لگتا ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔

ام حریم.....لاہور

میں 2007ء سے آپ کے پرچے کی مستقل لیکن خاموش قاری ہوں۔ بہت مرتبہ دل چاہا آپ سے رابطہ کرنے کا لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی کہ پتا نہیں خط چھپے یا نہیں لیکن آج نہیں رہ سکی۔ مطالعہ کا شوق مجھے والد صاحب سے ورثے میں ملا ہے۔ میں نے تاریخ کو بہت پڑھا ہے۔ آپ کے شمارے سے باقاعدہ طور پر تعارف بہت عرصہ پہلے ہوا تھا۔ والد صاحب جاب کے سلسلے میں دور افتادہ پوٹھوہار کے پہاڑوں میں مقیم تھے اور رشتہ دار سب گوجرانوالہ، لاہور میں ہوتے تھے۔ ایک بار یہاں آنا ہوا تو اردو بازار سے شعاع کا پرانا پرچا خریدا۔ یہ تھا میرا آپ سے پہلا تعارف، پھر وہاں بھی کبھار مل جاتا تھا لیکن پھر 2007ء میں گوجرانوالہ میں شفٹنگ کے بعد مستقل طور پر خواتین ڈائجسٹ کی قاری رہی ہوں۔ پڑھائی، شادی پھر بچے کسی دور میں بھی اس کا ناغہ نہیں ہوا۔ یہ ایک اچھے ساتھی، ایک اچھے دوست کی طرح میرے ساتھ رہے۔ بات شاید لمبی ہو رہی ہے لیکن اتنے عرصے میں پہلی بار بات کر رہی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ آپ میری سنیں۔ ہم جو کبھی دور پہاڑوں، ٹیلوں، جھنڈوں کے دیس کی شہزادی تھے۔ ہاں جی جنتی پرسکون اور خوش گوار وہاں زندگی گزری ہے، اپنا آپ کسی شہزادی سے کم نہ لگتا تھا پھر جب یہاں میدانوں میں منتقل ہوئے تو ہمارا تخت وہیں رہ گیا، ایسے ہی جیسے شہزادی ناشتہ قدیم ملاکہ جدید کوالالمپور آ گئی۔

میں شروع میں خطوط نہیں پڑھا کرتی تھی لیکن اب سب سے پہلے میں یہی پڑھتی ہوں۔ سب بہت اپنے لگتے ہیں۔ اپنے اپنے گھروں میں ایک دوسرے سے دور بیٹھے لیکن ہم سب ساتھی سب دوست ہی تو ہیں۔

اس ماہ کا شمارہ ابھی پڑھا نہیں۔ میں مہینے کے آخر میں پڑھتی ہوں۔ دس بیس دن اس تسلی میں گزارے کہ میرے پاس آ چکا ہے اور آخر میں پڑھنا اس لیے تاکہ اگلے ماہ کے لیے انتظار کم کرنا پڑے۔ ماہ جون میں تحریر

تین تا ''سب'' بہت پسند آئی۔ منشاء محسن آپ نے بہت اچھا لکھا، لفظوں کا چناؤ زبردست۔ جب سے لاہور شفٹ ہوئی ہوں، شادی کے بعد تو لاہور سے متعلق کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں کچھ عرصہ پہلے لیکچرار کے لیے انٹرویو دینے گئی تھی۔ کہانی کے کرداروں کے ساتھ میں بھی جی سی کالج گھومتی رہی۔ باقی راحت جبیں کا دل اچھا جارہا ہے، حسب معمول ان کی تحریر ذہن پر بغیر کوئی بوجھ ڈالے چلتی جارہی ہے۔ یہ ان ہی کا خاصا ہے۔ کہانی میں پریشانی کے باوجود ذہن ٹینشن میں مبتلا نہیں ہوتا کیونکہ وہ کوئی نہ کوئی حل بھی جلد ہی لے آتی ہیں۔

''نفسیاتی الجھنوں'' کو پڑھ کر ان بہنوں کے لیے آسانی کی دعا اور اپنے حال پر شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سوں سے اچھے حال میں رکھا ہے، باقی تمام سلسلے بھی اچھے ہیں۔

یہاں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی، کچھ تحاریر کو چھوڑ کر آپ کی زیادہ تر تحاریر اس بات کی عکاس ہیں کہ پرانی کے ساتھ ساتھ نئی مصنفات بھی اس ادارے کی بہت ذہین ہیں اور بہت نالج رکھتی ہے، بہت پختہ لکھتی ہیں۔

☆ ام حریم! آپ نے اب تک خط نہ لکھ کر اپنے ساتھ بھی زیادتی کی اور ہمارے ساتھ بھی۔ اتنا پیارا لکھ سکتی ہیں تو اتنا عرصہ خاموش کیوں رہیں۔ تخت کھونے کا غم نہ کریں آپ اب ملکہ ہیں اپنے گھر کی بچے، گھر، شوہر یہ سب بھی بہت خوب صورت ہے۔

صرف اس خدشے کی بنا پر کہ خط شائع ہوگا یا نہیں۔ آپ نے ہمیں خط نہیں لکھا۔

آپ کی خواتین کی محفل میں آمد ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔ اب رابطہ رکھیے گا۔

حمیرا شفیع..... صادق آباد

موسم کی مناسبت سے ہی ڈریسنگ اچھی لگتی ہے۔

آپی! جب سے لاک ڈاؤن کی پابندیاں تھوڑی سی نرم ہوئی ہیں، ہمارے خاندان میں تو شادیوں کا سیزن زوروں پر ہے۔ اتنی ہوش ربا گرمی میں فینسی کپڑے پہن کر شادی اٹینڈ کرنا کوئی آسان کام ہے۔

نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کی دعوت کا ایک الگ کھڑاک ہے۔ اتنے نخروں سے تو دعوت کی تاریخ ملتی ہے۔ ایک دولہا دلہن تو حالانکہ ہماری پچھلی گلی میں گھر ہے، مگر پھر بھی رات گئے تشریف لائے۔ انواع واقسام کے دعوتی کھانوں کو دونوں نے نزاکت سے ذرا ذرا سا چکھا کہ بھئی ہم تو ڈائٹ پر ہیں۔ ہمارے بھائی صاحب غصے کے تیز ہیں۔ ان کے سامنے ہی کہنے لگے ''اٹھا کر رکھ دو سب کچھ فریج میں۔ اب پانچ دن ہانڈی نہ پکانا۔''

خیر یہ تو قصے ہیں۔ اب دوبارہ تبصرے کی طرف آتی ہوں، فہرست چیک کی تو دل خوش ہوگیا۔ تمام پسندیدہ مصنفات موجود تھیں۔ یکجا پر خالدہ جیلانی (مرحومہ) کا نام لکھا، دیکھ کر دل سے درد کی ٹیس سی اٹھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ ''کہنی سنئی'' میں مدیر صاحب نے قربانی کے فلسفے کو بہت اچھے سے بیان کیا۔ ''کرن کرن روشنی'' سے فیض یاب ہوئے۔

عید الاضحیٰ کی رونقیں، بہت اچھا سروے۔ بہنوں نے اپنے اپنے انداز سے عید کی مصروفیات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا۔ رائٹر گل ارباب سے ملاقات خوب رہی۔ اللہ ان کا زور قلم کرے اور زیادہ۔ طوبیٰ صدیقی کی باتیں خوب رہیں۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' میں نرمین کے گھر کے مخدوش حالات نے دل دکھی کردیا۔ قرۃ العین نے کورونا سے متعلق اچھا افسانہ تحریر کیا۔ راشدہ رفعت کی ''سکندر اعظم کی آمد'' منفرد تحریر۔ ''دل نازک ہمارا'' روبینہ جی اور زینب نور کے بچپن نے بھی متاثر کیا۔ ہماری دادی اماں کہا کرتی تھیں ''بچپن کی عادتیں پچپن سال تک جاتی ہیں۔''

سکینہ علی کا باورچی خانہ پسند آیا۔ ''نفسیاتی الجھنوں'' میں عدنان بھائی کا مشورہ بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ متاثرہ بہن کی مشکلات آسان کرے، آمین۔

☆ پیاری حمیرا! کورونا تو کسی طرح ہمارا پیچھا چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہے، ایک بار پھر تیزی سے پھیل رہا ہے اور یہ تیسری لہر تو زیادہ ہی خطرناک ہے۔ شادیوں پر بھی پابندی لگنے کا امکان ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہم کو اس عذاب سے نجات دے، آمین۔

پرچا آپ کو اچھا لگا، بہت شکریہ۔

صدف ناصر..... سرفراز کالونی گوجرانوالہ

''کرن کرن روشنی'' بہترین معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

''عید الاضحیٰ کی رونقیں'' سروے میں ایک سے

بڑھ کر ایک قاری بہنوں نے زبردست جواب دیے۔

جی بالکل! ہماری پسندیدہ مصنفہ "گل ارباب" سے ملاقات بے حد پسند آئی۔ "شاہین رشید" کا بہت شکریہ! شاہین پیسے لے کر انٹرویو دینے والوں سے منہ موڑ لیجیے۔ ہمیں ہماری پیاری رائٹرز کافی ہیں۔ آنکھیں بند کر کے "نادرہ خاتون، رضیہ جمیل، واصفہ سہیل، عدنان بھائی۔" کے انٹرویوز بھی لے ڈالیے۔

"فرحت اشتیاق" سے سوال جواب پسند آئے۔ برائے مہربانی اس سلسلے کے اینڈ پر بتا دیا کریں کہ آئندہ ماہ کس مصنفہ کی باری ہے تاکہ سب قاری بہنیں ان سے سوال کر سکیں۔ "طوبیٰ صدیقی" سے برائے نام ملاقات کی۔

"مکمل ناول" پورے تین دیکھ کر اش اش کر اٹھے۔ "سکندر اعظم کی آمد" ناول کا نام دیکھ کر دل تھوڑا بوجھل ہوا کہ کوئی بھاری کم، سا ناول ہوگا اپنے نام کی طرح۔ مگر یہ کیا بھئی! راشدہ رفعت اپنے مخصوص انداز تحریر میں ہی ملی ہیں۔ انتہائی شان دار تحریر۔

"گل ارباب" نے "مریض عشق" سے ہماری ملاقات کروائی اور کیا خوب کروائی۔ پیار لوگوں کے ساتھ۔ "متاع" ام ایمان قاضی نے کر آئیں اچھی تحریر۔ "محبت" کے کردار نے بے ساختہ ہنسایا، ہاں البتہ "رائٹرز" سے گزارش ہے اپنی تحریروں میں مزید نیا پن لائیں۔ یہ کیا کہ ہر ماہ ہر دوسری تحریر میں "ہیرو" سفری بیگ سنبھالتا ہے اپنے کسی رشتہ دار گھر قیام کرتا ہے اور پھر وہیں پر "ہیروئن" مل جاتی ہے۔ "ناولٹ" ہماری قاری بہن "زینب نور" کا "بچپن" پڑھا۔ ایک افسانے کے بعد ہی اتنا شان دار ناولٹ۔ انتہائی مضبوط گرفت اور بے ساختہ تسلسل اور روانی۔ ماشاء اللہ کمال کر دیا زینب نے۔ تحریر کے خالص پن نے کہیں رکنے نہیں دیا۔ ہم جو "پیدائشی شہری" ہیں گاؤں کے ایسے سادہ اور پرخلوص ماحول کو پڑھ کر سحر زدہ رہ گئے۔

"افسانے" ہماری پسندیدہ ترین صنف ہے۔ "حمیرا شفیع" کا افسانہ "عید کی وہ شام" بازی لے گیا۔ پڑھ کر ہنستے رہے۔

"برکت" محسن منشا نے ڈالی "خواتین" میں ہر ہر نقطہ حقیقت پر مبنی۔ "کورونا والی گلی" قرۃ العین نے پرانے زخموں کو تازہ کر دیا۔ "کورونا" اور "لاک ڈاؤن" کے ابتدائی دنوں میں لوگ کورونا سے نہیں دوسروں کے غلط رویوں سے جیتے جی مر گئے۔ "دل نازک ہمارا" صنف نازک کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ روبینہ عبدالقدیر نے مگر واہ کمال کی "ساس" ہیں "ہمارے نام" میں اپنے تبصرے کے جواب میں آپ کی پرخلوص محبت پر آنکھیں بھر آئیں۔ مگر آپ غلط سمجھی ہیں ہمیں دس روپے اضافے کا کوئی بوجھ نہیں۔ کیونکہ یہ انتہائی معمولی اضافہ کچھ بھی نہیں مگر "ابرش شاہ" نے رنگ ریز میرے کے متعلق جو الفاظ کہے وہ سراسر بدتمیزی کے زمرے میں آتے ہیں۔ کوئی تحریر نہیں پسند نہ پڑھیں۔ تنقید کرنی ہے ضرور کریں مگر طریقے سے تاکہ رائٹرز کی دل آزادی نہ ہو۔

"خبریں و بریں" پڑھ کر ہنستے رہتے ہیں۔ شکریہ "خاتون کی ڈائری" میں حبیہ خان، حمدہ خان اور ارم کمال چھائی رہیں۔

"عدنان بھائی کی بہنوں کو نصیحتیں گویا سورج کو چراغ دکھانے کے جیسا یہ سلسلہ ہے۔

لیں جی تبصرہ ختم ہماری بڑی بیٹی خدیجہ ناصر ساتھ ہی منہ بسور کر پاس آ بیٹھی ہے۔ "اتنا لمبا چوڑا تبصرہ لکھتی ہیں بھی ہمارا ذکر تو نہیں کیا۔" یہ اچھا طعنہ ہے بھئی گھر والوں کا یہاں کیا ذکر؟ بہرحال خدیجہ کی فرمائش پر مختصر ذکر۔ گوجرانوالہ کے بہترین ادارہ "مشرق سائنس کالج" میں کلاس ششم کی طالبہ عمر گیارہ سال ہے۔ پوزیشن ہولڈر اور تیسواں پارہ حفظ کر کے "سورۃ یٰسین" واقعہ "رحمٰن اور سورۃ حفظ کرنے لگی ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ ترجمہ و تفسیر اور قابل ذکر ہی کہ بلا مبالغہ میرے ساتھ گھر کے سارے کام کرواتی ہے۔ پراٹھے بالکل گول بناتی ہے۔ اتنا کافی ہے۔ تعارف۔

ج: واہ بھئی خدیجہ! آپ تو بہت اچھی بیٹی ہیں۔ دینی اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بھی بٹاتی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ گول روٹی بھی بنانا آتی ہے۔ سچ بتائیں کہ ہم سے تو آج بھی گول روٹی نہیں بنتی۔

صدف! آپ خدیجہ کو ہمارا جواب پڑھا دیں آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت خوب، بہت شکریہ۔

☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

فرق

ایک وقت تھا کہ پاکستان ڈرامہ انڈسٹری اپنے عروج پر تھی لکھنے والے بھی کمال کا لکھتے تھے ہدایت کار اور اداکار بھی انتہائی ذمہ داری سے اپنا کام کرتے تھے تو بہترین چیز سامنے آتی تھی۔ اب چینل کی بھرمار ہے تو ڈرامے بھی اسی تعداد میں بن رہے ہیں اور اسی حساب سے ڈرامہ رائٹر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔

پاکستان کی ڈرامہ انڈسٹری کی مقبول اداکارہ ثانیہ سعید نے ڈراموں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمیں ہر صورت ڈرامہ مصنفین کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ میں اچھی اداکاری کرسکتی ہوں میرے تجربات اچھے ہوسکتے ہیں لیکن اچھا اسکرپٹ ہی نہیں ہے تو میں کچھ نہیں کرسکتی (ڈرامہ تو چھوڑ سکتی ہیں؟) نہ ہی کچھ الگ کرسکتی ہوں۔

ہمیں ہر صورت رائٹرز بدلنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اچھے اسکرپٹس نہیں آرہے ہیں۔ بہت اچھا بھی لکھا جارہا ہے۔ اچھے اسکرپٹس اور اچھے اساتذہ کسی بھی اداکار کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ اگر کوئی ماضی اور حال کے ڈراموں کا موازنہ کرکے تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پہلے ہمارے ڈرامے بہت اچھے تھے اور اب نہیں ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پرانے لکھاریوں کا مسئلہ صرف لکھنے کا نہیں تھا۔ وہ نظریاتی لوگ تھے وہ جو سوچتے تھے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں تک پہنچایا جائے (سوچ تو آج بھی یہی ہے)

پرانے لکھاریوں کو صرف مشہور ہونے کا شوق نہیں تھا ان کے اندر ایک اُبال تھا کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ انہیں سنا جائے۔ حسینہ معین اور انور مقصود کے اسکرپٹ پی ٹی وی پر تو بہت چلے لیکن باقی لوگوں (یعنی پرائیویٹ چینل؟) کے ساتھ ان کی بات نہ بنی حالانکہ ڈرامے کے رائٹر تو وہی تھے۔ (سوچ کا فرق ثانیہ! آج کے ڈرامہ بنانے والے بھی ایسے ہی ہیں جن کی سوچ پیسہ اور شہرت ہے)

اعزاز

حال ہی میں آسٹریلیا میں منعقد ہونے والے پہلے پاکستانی فلم فیسٹیول میں پاکستانی شارٹ فلم ''اندھا'' نے تین ایوارڈ اپنے نام کرلیے۔ کیف غزنوی کو بہترین اداکارہ کا ایوارڈ دیا گیا۔ سلیم معراج کو بہترین اداکار کا اعزاز ملا اور بہترین اسکرین پلے کا ایوارڈ کفایت رودانی نے حاصل کیا۔ کفایت رودانی نے اس مختصر فلم کی کہانی لکھی ہے اور اس کی ہدایات بھی کفایت رودانی نے ہی دی ہیں (یاد رہے اس سے پہلے اس شارٹ فلم نے ممبئی انٹرنیشنل فلم ایوارڈ میں بیسٹ اسٹوری آف دی ایئر کا اعزاز بھی

حاصل کیا تھا)

کیف غزنوی نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ یہ ایک اعزاز ہے کہ اسے جس فلم فیسٹیول میں بھیجا اچھا رسپانس ملا ہماری محنت کو سراہا گیا تسلیم کیا گیا۔ ''اندھا'' معاشرے کو متاثر کرنے والے ایک اہم اور حساس موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ بچوں کے ساتھ بدسلوکی، ریپ اور بچپن کے ٹراما سے متعلق ہے۔ معاشرہ کبھی بھی متاثرہ فرد کو اس سانحے سے باہر نہیں آنے دیتا۔

کیف غزنوی نے کہا کہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا، وہ یہ تھی کہ متاثرہ خاتون نے اسی شخص سے شادی کا فیصلہ کیا جو اس کا مجرم تھا یہ بہت بہادری کا مظاہرہ تھا۔ شادی کے ذریعے اس خاتون نے اس شخص کے برے کاموں کو روکنے کا فیصلہ کیا اور ان تمام لڑکیوں کے لیے ہیرو بن گئی جو اس شخص کے ظلم کا شکار ہوئی تھیں (اس فلم میں متاثرہ خاتون کا کردار کیف غزنوی نے ادا کیا تھا۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ جھوٹ کے بیوپاریوں کو ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ لوگوں کو ایک حد تک دیوار سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ اس حد کو پار کریں گے تو آپ کی پارسائی پر بھی چھینٹے پڑیں گے اور آپ کے عزت اور وقار کے جھوٹے لبادے بھی داغ دار ہو جائیں گے۔

(عمار مسعود.....سوچ وفکر)

☆ مہاتما بدھ کی تعلیمات اسی اعلا و ارفع درجے کی ہیں جن پر عمل کرنا بظاہر بہت مشکل ہے۔ گوتم کو اللہ نے غیر معمولی ذہن، صلاحیت اور صبر عطا کیا تھا۔ جس کی بدولت وہ نروان حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہم جیسے عام انسان اگر نروان نہ بھی حاصل کرسکیں تو کم از کم اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ اپنی خواہشات کو لگام ڈالنے کی کوشش کریں۔ بقول سوئس فلاسفر ''روسو'' خوشی کے حصول کی حد سے زیادہ تگ و دو بعض اوقات اسے تکلیف دہ بنا دیتی ہے۔

(یاسر پیرزادہ.....ذرا ہٹ کے)

☆ حکمران چین سے ''مساوی فاصلہ'' پیدا کرنے پر تیار لگتے ہیں، اگر امریکہ بھارت کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اپنے گروپ میں لے۔ تین برس سے سی پیک سرد خانے میں پڑا ہے۔ جو منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچ سکتے تھے، وہ ابھی شروع بھی نہیں کیے جاسکے۔ یہ سب روایتی امریکہ نواز حلقے اس کے باوجود کرنے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہیں کہ امریکہ واقعی پہلے والا تعلق بحال کرے گا اور یہ بھولتے ہوئے کہ انڈو پیسیفک ریجن میں چار کے بڑے ٹولے (QUAD) میں بھارت امریکہ کے ساتھ مل کر چین مخالف محاذ میں سرگرم ہو چکا ہے۔

(امتیاز عالم.....انگخت)

آپ کا باورچی خانہ

شمائلہ فاروق۔لاہور

(1) کھانا پکاتے وقت ہر پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ چونکہ جوائنٹ سسٹم ہونے کی وجہ سے ہر فرد کی پسند کا خیال رکھنا تھوڑا مشکل کام ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی باری باری ہر کسی کی پسند کو اہمیت دی جاتی ہے۔ صحت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ بیمار افراد کے لیے اگ سے بالکل ہلکی پھلکی غذا بنائی جاتی ہے۔ لیکن ہر کھانا اس شرط کے ساتھ بنایا جاتا ہے کہ نہ صرف لذیذ بلکہ غذائیت سے بھرپور بھی ہو جو کھانے والے کو توانائی فراہم کرے۔

(2) ہمارے رشتے دار زیادہ تر دور دراز شہروں میں رہتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی مہمان اچانک نہیں آتا بلکہ پہلے اطلاع دی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی مہمان آجائے خاص طور پر دوست احباب تو ان کے لیے چائے پر خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ قیمہ کے کٹلس، نگٹس عام طور پر فریج میں موجود ہوتے ہیں اور باقی کا سامان بازار سے لے آتے ہیں۔ مجھے خود بھی قیمے کے کٹلس بہت پسند ہیں اس لیے اس کی ریسپی آپ کے ساتھ ضرور شیئر کروں گی۔

قیمہ کے کٹلس

اجزاء:

قیمہ	ایک پاؤ
آلو	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
پسا ادرک، لہسن	ڈیڑھ چمچہ
پیاز باریک کٹی ہوئی	ایک عدد
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چمچہ
سفید زیرہ	ایک چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چمچہ
انڈے	دو عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچیں	تین سے چار عدد
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ضرورت

ترکیب:

کڑاہی میں ــ آئل ڈال کر اس میں پیاز کو سنہرا کرلیں۔ پیاز میں ادرک، لہسن اور زیرہ ڈال کر فرائی کریں پھر قیمہ ڈال کر درمیانی آنچ پر رکھ دیں۔ قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو نمک، لال مرچ ڈال کر بھونیں اور اتار لیں۔ آلو کو ابال کر مسل لیں۔ اس میں نمک، کالی مرچ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا ملائیں۔ دو کھانے کے چمچے آلو کا مکسچر لے کر کٹوری بنائیں۔ پھر اس کے درمیان قیمہ بھر کر کباب بنالیں۔ پہلے انڈے پھر بریڈ کرمز لگائیں ــ اور سنہرا ہونے تک ڈیپ فرائی کریں۔ ہری مرچوں کی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

(3) کہا جاتا ہے کہ اگر عورت کی سلیقہ مندی دیکھنی ہو تو سب سے پہلے کچن کا وزٹ کرو۔ ہمیں تو اپنے کچن کو خصوصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ کیونکہ اس کو بڑوں کی دعائیں لگی ہوئی ہیں اور یہ ہر وقت آباد رہتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کے لیے کچھ نہ کچھ بنتا رہتا ہے ایسے میں صفائی تو لازمی ہے۔ ہمارے گھر کے نیچے دکان ہے۔ جہاں سے ہر وقت کوئی نہ کوئی آرڈر جاری رہتا ہے۔ اس لیے کوئی نہ کوئی عورت کچن میں ضرور پائی جاتی ہے۔ تفصیلی صفائی تقریباً پندرہ دن بعد سب مل کر کرتے ہیں۔

(4) ناشتہ چونکہ بادشاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت بھی دگنی ہوئی۔ ہمارے ہاں سبھی اپنی مرضی اور موڈ کے مطابق ناشتہ کرتے ہیں۔ کوئی پراٹھا اور

انڈہ کھا رہا ہے کوئی بریڈ اور جیم لے رہا ہے۔ اسٹوڈنس دودھ اور کیک پر اکتفا کرتے ہیں اور چھٹی والے دن حلوہ پوری گھر میں بنائی جاتی ہے جو تقریباً سب ہی بہنیں بنانا جانتی ہیں۔ اچھے ناشتے کے ساتھ ساتھ موڈ اچھا ہو تو ناشتہ ڈبل مزہ دیتا ہے اور دن خوش گوار گزرتا ہے۔

(5) ہمارے ہاں کھانا باہر کھانے کا رواج نہیں ہے۔ البتہ کھانا پیک کروا کے گھر لا کر خوب انجوائے کرتے ہیں۔ اگر کوئی لمبا سفر ہو تو راستے میں کسی اچھے ریسٹورنٹ سے کھا لیا جاتا ہے، باقی چھوٹے موٹے فنکشن تو چلتے رہتے ہیں۔ بڑی فیملی ہونے کی وجہ سے کوئی باہر لے جانے کا رسک نہیں لیتا۔

(6) کھانا تو روز ہی بنتا ہے لیکن جس دن موسم اچھا ہو چاہے وہ باہر کا موسم ہو یا اندر کا موسم اس دن اسپیشل ڈشز بنتی ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر دفعہ کوئی نئی اور یونیک ڈش بنے جو سب کو پسند آئے۔ اگر نہ بھی پسند آئے تو کوئی بات نہیں۔ کھانی تو پڑے گی۔ اگر موسم کے لحاظ سے اپنی روایتی ڈش ساگ اور مکئی کی روٹی بنالی جائے تو وہ بھی بہت مزا دیتی ہے۔ ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔

(7) اچھا کھانے کے لیے اچھا پکانا پڑتا ہے اور اچھا پکانے کے لیے محنت بھی اچھی کرنی پڑتی ہے۔ کھانے میں استعمال ہونے والی ہر چیز تازہ اور قدرتی ہونی چاہیے نہ کہ پیکٹوں والی جس سے ہر کھانا جلد تیار ہو جاتا ہے لیکن مزا بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اس لیے تو کہتے ہیں جتنا گڑ ڈالو گے، اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ کھانا سر دھانپ کر پکانا چاہیے اور محبت سے پکانا چاہیے کیونکہ پکانے کے ساتھ آپ کی محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ تمام مسالا جات خود گھر میں پیسنے چاہئیں اگر ہو سکے تو گھر کے کسی حصے میں چھوٹی موٹی سبز پاں بھی اگالیں۔ مہنگائی سے بھی بچ جائیں گے اور پرانی بوسیدہ سبزیوں سے بھی۔

(8) گرمیوں میں اکثر فریج میں سے بو آنے لگتی ہے اس بو کو ختم کرنے کے لیے فریج میں دو تین کوئلے کسی برتن میں ڈال کر رکھ دیں بو ختم ہو جائے گی۔

☆

الف لیلہ ہزار داستانیں

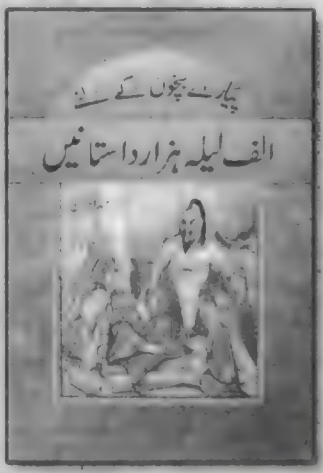

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مٹر قیمہ

بکرے کا مغز	دو عدد
پیاز	دو عدد
ہری مرچیں	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر	تین عدد
لہسن، ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	آدھا کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
دھنیا	آدھا کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

پتیلی میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر سنہری کریں۔ پسا ہوا لہسن، ادرک، نمک، کٹی ہوئی لال مرچیں، اور ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔

ٹماٹر گل جائیں تو دہی، زیرہ، دھنیا اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر مزید بھونیں۔

تیل الگ ہوجائے تو ابلا ہوا مٹر ڈال کر قیمہ

دہی — آدھا کپ
ادرک لہسن — دو کھانے کے چمچے
نمک — حسب ذائقہ
تلی پیاز — ایک عدد
ادرک — دو انچ کا ٹکڑا
کشمش — ایک چوتھائی کپ
لہسن — دس جوے
بادام — آدھا کپ
پیاز — دو عدد
لیموں — دو عدد
دھنیا ثابت — دو چائے کے چمچے
زعفران، کیوڑہ — تھوڑا سا
سونف — دو چائے کے چمچے
پسا ادرک لہسن — ایک چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا — تھوڑا سا

ترکیب:

چانپوں کو دھو کر اس میں پانی، نمک، پسا ہوا ادرک لہسن کا پیسٹ، کٹی ہوئی پیاز، دھنیا ثابت اور سونف ڈال کر قریب ایک گھنٹہ پکائیں کہ چانپ پوری گل جائے۔ چانپ نکال لیں۔ اس کو ہلکا سا تیل میں تل کر علیحدہ رکھیں۔ پانی چھان کر علیحدہ رکھیں جو چار، پانچ کپ ہو۔ زعفران کو کیوڑہ میں حل کرلیں۔ علیحدہ رکھیں۔ چاول کو آدھا گھنٹہ بھگو دیں۔ تیل گرم کریں۔

ب ب ی ی ے ے ے

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مغز مسالے دار

ضروری اشیاء:۔

بکرے کا مغز	دو عدد
پیاز	دو عدد
ہری مرچیں	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر	تین عدد
لہسن، ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	آدھا کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
دھنیا	آدھا کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

پتیلی میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر سنہری کریں۔ پسا ہوا لہسن، ادرک، نمک، کٹی ہوئی لال مرچیں، اور ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔

ٹماٹر گل جائیں تو دہی، زیرہ، دھنیا اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر مزید بھونیں۔

تیل الگ ہو جائے تو ابلا ہوا مغز ڈال کر فرائی کریں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر مکس کرکے چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر سرو کریں۔

رائل کابلی پلاؤ

ضروری اشیاء:۔

چاول	ایک کلو
بکرے کی چانپ	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
دہی	آدھا کپ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تلی پیاز	ایک عدد
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
کشمش	ایک چوتھائی کپ
لہسن	دس جوے
بادام	آدھا کپ
پیاز	دو عدد
لیموں	دو عدد
دھنیا ثابت	دو چائے کے چمچے
زعفران، کیوڑہ	تھوڑا سا
سونف	دو چائے کے چمچے
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	تھوڑا سا

ترکیب:

چانپوں کو دھو کر اس میں پانی، نمک، پسا ہوا ادرک لہسن کا پیسٹ، کٹی ہوئی پیاز، دھنیا ثابت اور سونف ڈال کر قریب ایک گھنٹہ پکائیں کہ چانپ پوری گل جائے۔ چانپ نکال لیں۔ اس کو ہلکا سا تیل میں تل کر علیحدہ رکھیں۔ پانی یخنی چھان کر علیحدہ رکھیں جو چار، پانچ کپ ہو۔ زعفران کو کیوڑہ میں حل کر لیں۔ علیحدہ رکھیں۔ چاول کو آدھا گھنٹہ بھگو دیں۔ تیل گرم کریں۔

ثابت گرم مسالا ڈالیں پھر ادرک لہسن (باریک کٹے ہوئے) اور دہی ڈال کر بھون لیں۔ اس میں یخنی ڈالیں۔ جب جوش آنے لگے تو بھیگے ہوئے چاول ڈالیں۔ پانچ منٹ تیز آگ پر پکائیں۔ نمک ڈالیں پھر آگ کم کر دیں۔

جب پانی خشک ہو جائے تو چانپ ڈال کر دم پر رکھیں۔ ڈش میں پہلے چاول پھر اوپر چانپیں۔ پھر تلی ہوئی پیاز، کشمش، بادام، زعفران ملا کیوڑہ لیمن جوس ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

قیمہ رول

ضروری اشیا

قیمہ	آدھا پاؤ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹو کیچپ	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
کھیرا	دو عدد

(ایک کھیرا کش کرلیں اور ایک کھیرا کے سلائس کاٹ لیں)

پراٹھے	چار عدد
کریم	آدھا کپ

ترکیب:

گرم تیل میں پیاز ڈال نرم کریں۔ قیمہ اور پسا ہوا لہسن ڈال کر بھونیں۔ جب قیمے کا پانی خشک ہوجائے تو بھون لیں اور نمک، کٹی ہوئی لال مرچیں اور ٹماٹو کیچپ مکس کردیں ایک منٹ پکا کر چولہا بند کردیں۔ پراٹھے میں قیمہ، کش کیا ہوا کھیرا اور کریم ڈال کر رول کریں۔ کھیرے کے سلائس اور گارلک سوس یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

گوشت ہرا مسالا کریم میں

ضروری اشیاء:۔

گوشت	آدھا کلو
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک چائے چمچہ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
تازہ کریم	آدھا کپ
پیاز یرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	تین چوتھائی کپ
دہی	آدھا کپ
ہری مرچ	پانچ، چھ
ہرا دھنیا پتے	حسب ضرورت

ترکیب:

گوشت کو اچھی طرح دھو کر اس کا پانی نتھار لیں۔ نمک، پسا ہوا ادرک، لہسن، پسا زیرہ، پسا گرم مسالا، دہی، ہری مرچ اور ہرا دھنیا ——— مکس کر کے گوشت میری نیٹ کرلیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

اب ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں، مسالا لگے گوشت کو اس میں ڈال دیں اور تھوڑے سے پانی کے ساتھ پکائیں۔ گوشت کو گلنے تک پکائیں۔ آخر میں تازہ کریم ملا دیں۔ کٹی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور ہری مرچ کے ساتھ گارنش کرلیں۔

بٹر ملک ودھ مینگو سوس

اشیاء:۔

فریش کریم	ایک کپ
آئسنگ شوگر	دو کھانے کے چمچے
دودھ	ایک کپ
چائنا گراس	آدھا کپ
مینگو سوس کے لیے	
مینگو پیوری	ایک کپ
شہد	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	دو کھانے کے چمچے
دار چینی	ایک انچ کا ٹکڑا

ترکیب:۔

ایک برتن میں کریم پکائیں۔ آئسنگ شوگر اور دودھ ڈال کر پکائیں۔ ابال آجائے تو چائنا گراس اور آدھا کپ پانی ڈال دیں اور مستقل چمچہ چلاتے رہیں تاکہ جلے نہ، جب چائنا گراس اچھی طرح پک جائے تو پیالوں میں ڈال کر جمانے رکھ دیں۔

سوس کے لیے:۔

مینگو پیوری میں شہد، سرکہ، چینی، دار چینی ڈال کر پکائیں، گاڑھا ہوجائے تو چولہا بند کردیں۔ چائنا گراس کے سیٹ پیالے کسی ڈش یا پلیٹ میں ڈال کر اوپر سے مینگو سوس ڈال کر پیش کریں۔

☆

مطالعے کے دوران مجھے گلیڈن کی بات بہت اچھی لگی، میں نے اس پر غور کیا اور کرتا ہی چلا گیا۔ نرم اور صلح کن الفاظ نہایت طاقتور ہوتے ہیں۔

آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے ڈیل کارنیگی کی کتاب ہاؤ ٹو ون فرینڈز اینڈ انفلوئینس پیپلز کا ترجمہ نظر سے گزرا۔ کتاب کا نام بہت خوب صورت تھا۔

''میٹھے بول میں جادو ہے۔''

میں سمجھتا ہوں اور آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گی کہ بری، کڑوی اور سخت بات کو بھی نرم لہجے میں کہا جائے اور صلح کن رویہ اختیار کیا جائے تو آپ اعصابی کھنچاؤ کے علاوہ ذہنی اذیت، کوفت سے بچ سکتی ہیں۔ آپ کا بلڈ پریشر نہیں بڑھے گا۔ آپ کے غصے اور بگڑنے کے اثرات سے آپ کا دل محفوظ رہے گا۔ آپ کی زندگی آرام سے گزرنے کے ساتھ ساتھ پرسکون بھی ہو جائے گی۔

یہی مشورہ میں نے اپنے ایک جاننے والے کو دیا جو ایک ادارے کے سربراہ ہیں۔ وہ اکثر ٹینشن اور اعصابی کھنچاؤ کا شکار رہتے تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں پر بری طرح ناراض ہوتے تھے، گرجتے تھے، برستے تھے اور نتیجہ یہ کہ ان کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا تھا اور دل پر ایک بوجھ سا آ پڑتا تھا۔ بھوک مر جاتی تھی پھر خود کو نارمل کرنے کے لیے سکون آور گولیاں استعمال کرتے تھے۔

خوش اخلاقی، ضبط و تحمل، ایثار، بے لوث خدمت، مقصد کی سچی لگن۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں اور ذہنی سکون، قلبی اطمینان کا باعث بنتے ہیں اور کامیابی کا راستہ ہیں۔

ا۔ د۔ س..... کراچی

س: میرے اندر اعتماد کی بہت کمی ہے۔ مجھ سے کسی سے بات نہیں ہو پاتی۔ یہاں تک کہ میں اپنے سگے بہن بھائیوں سے بھی بات کرتے ہوئے نروس ہو جاتی ہوں۔ قوت فیصلہ کی مجھ میں اس حد تک کمی ہے کہ میں کبھی اپنے لیے کوئی فیصلہ خود سے نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ دوسروں کی مشوروں کی محتاج رہتی ہوں۔ کوئی گھر کا فرد اگر کسی بات کا الزام مجھ پر رکھ دے تو یہ بات مجھے بہت تکلیف دیتی ہے۔ میں گھنٹوں سوچتی رہتی ہوں کہ اس بات کی ذمہ دار میں ہوں۔ لوگوں کی بات کا وقت پر جواب نہیں دے پاتی۔ اس بات پر بھی دنوں پریشان رہتی ہوں۔

لوگوں کا خوف اعصاب پر طاری رہتا ہے۔ امی کے ساتھ بازار جاؤں تو لوگوں کو دیکھ کر بے زار رہتی ہوں۔ لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے اپنے اس وجود کو لے کر پوری دنیا سے چھپ جاؤں، خود سے بے زاری ہوتی ہے۔ اپنے وجود کو لے کر ہر دم ایک ذلت کا سا احساس ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں میں اپنے کزن کی منگنی میں گئی۔ وہاں پر میرے ماموں زاد بھائی نے مجھ سے بات کی۔ جب سے میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے، مجھ سے کسی لڑکے نے اتنی اچھی طرح بات نہیں کی۔ میں اپنے کزنز سے بات نہیں کرتی، اسی لیے وہ بھی مجھ سے ریزرو رہتے ہیں۔ مگر وہ مجھ سے اتنی اپنائیت سے بات کر رہا تھا کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی میں

اس کا انداز جھول نہیں تھی۔ لو کہ میں اس سے بات نہیں کر رہی تھی مگر وہ اس کے باوجود بھی مجھ سے بات کیے جا رہا تھا، جیسے اپنی بہن سے کر رہا تھا (آپ کچھ غلط مت سوچیے گا وہ مجھ سے چھوٹا ہے اور اس کی منگنی بھی ہوگئی ہے۔ میرے لیے وہ بالکل میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے)۔

میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ محفل میں کبھی مجھ سے ایسے بات میرے بھائیوں نے بھی نہیں کی بلکہ وہ ایسی محفلوں میں ہم بہنوں کو انسان نہیں بلکہ اچھوت سمجھتے ہیں گو کہ اب ان باتوں کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن نجانے کیوں خود سے نفرت سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ میری کسی کو ضرورت ہے، نہ ہی کوئی اہمیت۔ اور ہاں جس کزن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے میرا مذاق نہ اڑا رہا ہو کیونکہ میں اس سے بات نہیں کر رہی تھی بلکہ اس کی بات کے جواب میں محض مسکرا دیتی۔ کوئی عام لڑکیوں والا کام کرلوں جیسے آئی بروز بنوانا تو ایک گناہ کا احساس رہتا ہے اور دین کے کاموں میں بھی آگے نہیں بڑھ پاتی۔ نہ دین کی ہوں نہ ہی دنیا کی۔

بیش تر وقت اعصاب پر موت کا خوف سوار رہتا ہے۔ اندھیرے میں بھی موت کا خیال آتا ہے۔ عذاب قبر کا خوف، میری امی کو اللہ زندگی دے، جب ان کے بارے میں سوچتی ہوں کہ ایک دن وہ ہمارے درمیان نہیں ہوں گی تو بہت دل گھبراتا ہے۔ موت سے نہیں بلکہ عذاب قبر سے۔ میری تعلیم بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے پتا ہے کہ میری لکھائی اچھی نہیں ہے اور میرا خط بھی بے ربط ہے۔

اور ہاں مجھے سائیکاٹرسٹ کے پاس جانے کا مشورہ مت دیجیے گا کیونکہ یہ بالکل ناممکن ہے۔

ج: اچھی بہن! آپ کو ماہر نفسیات کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خدانخواستہ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ کا مسئلہ حد سے بڑھی زود حسی یا حساسیت ہے۔ جو باتیں آپ نے لکھی ہیں، ایک نارمل انسان کے ذہن میں بھی آتی ہیں۔ موت..... موت کے بعد کی زندگی، والدین کو کھو دینے کا احساس اور اپنے آپ کو بے کار سمجھنا ان میں کوئی بھی بات ایسی نہیں جو ابنارمل ہو، بس فرق اتنا ہے کہ آپ جن باتوں کو دل پر لے لیتی ہیں اور گھنٹوں سوچتی ہیں، ایک نارمل انسان ان باتوں کو ذہن سے جھٹک کر دوسرے کاموں میں لگ جاتا ہے۔

آپ نے اپنی عمومی صحت کے متعلق نہیں لکھا۔ اکثر جسمانی صحت کمزور ہو تو بھی ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کوئی مشغلہ اختیار کریں۔ کتابیں، سلائی کڑھائی، کھانا پکانا جو بھی کام آپ کو دلچسپ لگے۔ اس کے لیے ایک وقت مقرر کرلیں، اسی وقت میں یہ کام کریں۔ اس طرح آپ کا اپنے ذہن کام میں بھی الجھا رہے گا۔

کوشش کریں کہ کسی لڑکی کو اپنے دوست بنائیں۔ اس سے گپ شپ آپ کو خوشی دے گی۔ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ کزن آپ کا مذاق اڑا رہا ہوگا۔ آپ میں کیا کمی یا خرابی ہے جو کوئی آپ کا مذاق اڑائے گا۔ اگر کزن نے پہلے کبھی بات نہیں کی، اب بات کرلی تو یہ بھی کوئی اہم بات نہیں ہے۔ آپ خود سے محبت کریں۔ بن سنور کر رہیں۔ صاف ستھرا، اجلا لباس پہنیں۔ روزانہ تازہ پانی سے غسل کریں۔ اس سے دوران خون تیز ہوگا۔ پژمردگی اور یاسیت دور ہوگی اور آپ کو تازگی کا خوش گوار احساس ہوگا۔

دوسرے آپ کے متعلق کیا سوچتے ہیں..... یہ آپ نہیں جان سکتیں۔ آپ مطمئن رہیں اور یقین رکھیں کہ آپ بہت اچھی ہیں۔

☆

ماہ نور.....حیدر آباد

س: میری جلد بہت بے رونق ہے۔ رنگت بھی دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے حالانکہ میری عمر بائیس سال ہے۔ ایم بی بی ایس کررہی ہوں۔ پڑھائی میں مصروف رہتی ہوں۔ اتنا موقع نہیں ملتا کہ باقاعدہ اسکن کیئر کی کوئی روٹین اپنا سکوں۔ پارلر جاکر اسکن ٹریٹمنٹ لینا بھی مشکل ہے کیونکہ اس میں ٹائم بہت لگتا ہے اور ہاسٹل میں رہتے ہوئے یہ بہت مشکل ہے۔

ج: جلد کے بے رونق ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ جس میں ہارمون کا عدم توازن، غیر صحت مند طرز زندگی، قبض، صحت بخش غذاؤں کا فقدان، پریشانیاں، ڈپریشن اور کم خوابی وغیرہ۔ آپ اپنے معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی لاکر اپنی بے رونق جلد کو خوب صورت بنا سکتی ہیں۔ بے شک آپ کی پڑھائی مشکل ہے لیکن آپ کو اپنے لیے وقت نکالنا ہوگا۔

آپ دن میں جب بھی باہر نکلیں، سن بلاک کا استعمال کریں۔ سورج کی براہ راست شعاعوں سے بچیں، یہ جلد کے لیے نقصان دہ ہیں۔

دن میں کم سے کم سات، آٹھ گلاس پانی پئیں۔ کولا اور مشروبات سے بچیں۔

تلی ہوئی اور تیز مرچوں سے بنی چیزیں کم کھائیں۔ سادہ غذا کھائیں۔ وہ غذائیں جن میں وٹامنز، منرلز، فائبر اور پروٹین ہوں۔ دودھ، سبزیاں اور پھل استعمال کریں۔

روزانہ ورزش ضرور کریں۔ ورزش سے جسم کا اندرونی نظام فعال ہوجاتا ہے اور خون کی روانی متحرک ہوجاتی ہے۔ روزانہ دس سے پندرہ منٹ چہل قدمی بھی بہترین ورزش ہے۔

تروتازہ جلد کے لیے پرسکون نیند، ذہنی اطمینان اور مناسب ورزش ضروری ہے۔ یہ نا صرف آپ کی صحت کے لیے مفید ہے بلکہ آپ کے چہرے کی رونق میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔

حرا سلطان.....کراچی

س: آپی! میری عمر چوبیس سال ہے۔ مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ جس کی وجہ سے میرا چہرہ تھکن زدہ لگتا ہے۔ آپی! کوئی ایسا حل بتائیں جس سے میری جلد تروتازہ لگے اور اچھی نیند کے لیے بھی کوئی حل بتادیں۔

ج: آپ کوشش کریں کہ رات کو جلد سوئیں اور سحر خیزی کو اپنائیں۔ خوب صورت دکھنے اور تروتازہ رہنے کے لیے اچھی اور بھرپور نیند ضروری ہے۔ روزمرہ کے معمولات میں ورزش کو لازمی حصہ بنالیں۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پئیں۔ اپنی جلد کو تروتازہ رکھنے کے لیے گلیسرین اور عرق گلاب کے چند قطرے مکس کرلیں اور چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد چہرہ دھولیں۔

ماہا عمران.....جیکب آباد

س: میری جلد حساس ہے، بازار کے تیار کردہ ماسک مجھے سوٹ نہیں کرتے۔ کوئی گھریلو ماسک بتادیں۔

ج: لیموں اور شہد کا ماسک

دو چمچے شہد میں ایک کھانے کا چمچہ لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر لگائیں اور خشک ہونے کے بعد سادہ پانی سے دھولیں۔

☆

ماہ نور.....حیدر آباد

س: میری جلد بہت بے رونق ہے۔ رنگت بھی دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے حالانکہ میری عمر بائیس سال ہے۔ ایم بی بی ایس کررہی ہوں۔ پڑھائی میں مصروف رہتی ہوں۔ اتنا موقع نہیں ملتا کہ باقاعدہ اسکن کیئر کی کوئی روٹین اپنا سکوں۔ پارلر جاکر اسکن ٹریٹمنٹ لینا بھی مشکل ہے کیونکہ اس میں ٹائم بہت لگتا ہے اور ہاسٹل میں رہتے ہوئے یہ بہت مشکل ہے۔

ج: جلد کے بے رونق ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ جس میں ہارمون کا عدم توازن، غیر صحت مند طرز زندگی، قبض، صحت بخش غذاؤں کا فقدان، پریشانیاں، ڈپریشن اور کم خوابی وغیرہ۔ آپ اپنے معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی لاکر اپنی بے رونق جلد کو خوب صورت بنا سکتی ہیں۔ بے شک آپ کی پڑھائی مشکل ہے لیکن آپ کو اپنے لیے وقت نکالنا ہوگا۔

آپ دن میں جب بھی باہر نکلیں، سن بلاک کا استعمال کریں۔ سورج کی براہ راست شعاعوں سے بچیں، یہ جلد کے لیے نقصان دہ ہیں۔

دن میں کم سے کم سات، آٹھ گلاس پانی پئیں۔ کولا اور مشروبات سے بچیں۔

تلی ہوئی اور تیز مرچوں سے بنی چیزیں کم کھائیں۔ سادہ غذا کھائیں۔ وہ غذائیں جن میں وٹامنز، منرلز، فائبر اور پروٹین ہوں۔ دودھ، سبزیاں اور پھل استعمال کریں۔

روزانہ ورزش ضرور کریں۔ ورزش سے جسم کا اندرونی نظام فعال ہوجاتا ہے اور خون کی روانی متحرک ہوجاتی ہے۔ روزانہ دس سے پندرہ منٹ چہل قدمی بھی بہترین ورزش ہے۔

تروتازہ جلد کے لیے پرسکون نیند، ذہنی اطمینان اور مناسب ورزش ضروری ہے۔ یہ نا صرف آپ کی صحت کے لیے مفید ہے بلکہ آپ کے چہرے کی رونق میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔

حرا سلطان.....کراچی

س: آپی! میری عمر چوبیس سال ہے۔ مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ جس کی وجہ سے میرا چہرہ تھکن زدہ لگتا ہے۔ آپی! کوئی ایسا حل بتائیں جس سے میری جلد تروتازہ لگے اور اچھی نیند کے لیے بھی کوئی حل بتادیں۔

ج: آپ کوشش کریں کہ رات کو جلد سوئیں اور سحر خیزی کو اپنائیں۔ خوب صورت دکھنے اور تروتازہ رہنے کے لیے اچھی اور بھرپور نیند ضروری ہے۔ روزمرہ کے معمولات میں ورزش کو لازمی حصہ بنالیں۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پئیں۔ اپنی جلد کو تروتازہ رکھنے کے لیے گلیسرین اور عرق گلاب کے چند قطرے مکس کرلیں اور چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد چہرہ دھولیں۔

ماہا عمران.....جیکب آباد

س: میری جلد حساس ہے، بازار کے تیار کردہ ماسک مجھے سوٹ نہیں کرتے۔ کوئی گھریلو ماسک بتادیں۔

ج: لیموں اور شہد کا ماسک

دو چمچے شہد میں ایک کھانے کا چمچہ لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر لگائیں اور خشک ہونے کے بعد سادہ پانی سے دھولیں۔

☆